دل درگاہ اور دیا

ساجدہ حبیب

ساجدہ حبیب کا فنی سفر

ساجدہ حبیب کا شمار ان لکھاری خواتین میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے دوپٹے کو پرچم بنانے کا کٹھن سفر بڑے خلوص اور تندہی سے طے کیا۔

انہوں نے تین دہائی قبل اپنے فنی سفر کا آغاز ایک ماہنامے سے کیا۔ میں اُس ماہنامے کی مدیرہ تھی۔ ابتدا ہی میں ان کے تخیل کی پرواز، منفرد اور پختہ اندازِ تحریر نے مجھ سمیت قارئین کو یہ باور کرادیا تھا کہ ان کا یہ "دوپٹہ" بہت جلد ایک پرچم بننے والا ہے۔

کچھ عرصے بعد جب ان کا افسانہ "پیر کی جوتی" (جو اس کتاب میں شامل ہے) شائع ہوا تو میں نے ان کی تحریر پر برملا اپنے رشک کا اظہار کرتے ہوئے یہ ستائشی جملہ کہا کہ "کاش! یہ افسانہ میں نے لکھا ہوتا۔"

ساجدہ حبیب نے اپنے فنی سفر میں جو راستہ چنا وہ خوش رنگ فکری پھولوں کے ساتھ معاشرتی اقدار کی بلند و بالا پہاڑیوں سے بھی اٹا ہوا ہے۔ عام لوگوں کے سماجی اور ذاتی رویوں کی روح تک پہنچنے سے فن کی آشنائی نے ساجدہ حبیب کی جدت پسند فنکارانہ صلاحیت کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔

وہ مقصدیت کو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ گویا قلم کو وہ جہاد سمجھتی ہیں اور معاشرتی اور سماجی برائیوں کو اپنے عام فہم کرداروں کی مدد سے مدلل انداز میں اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے افسانے اور ناولوں کے کردار فرشتے، پریوں اور ناقابلِ فہم لڑکیوں اور سنگدل شہزادوں جیسے لڑکوں سے قطعی الگ ہوتے ہیں۔

وہ ایک حب الوطن اور روایت پسند خاتون ہیں۔ اگر غلط رسم و رواج سے آلودہ روایات سے انحراف کرتی ہیں، تب بھی وہ ایک شائستہ، دھیما اور مدلل انداز اختیار کرتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ساجدہ حبیب نے اپنے دوپٹے کو پرچم بنانے کے لئے بڑا کٹھن

سفر نہایت خوش اسلوبی سے طے کیا ہے، جس کا منہ بولتا ثبوت انہوں نے حال ہی میں ''وردی، وعدہ اور وفائیں'' کے نام سے ایک ناول کی شکل میں دیا ہے۔ اس میں ساجدہ نے بڑی دردمندی سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا المیہ بیان کیا ہے اور متحدہ پاکستان کو قائم رکھنے کے کارناموں کے لئے حب الوطن غازیوں، شہداء اور قربانیوں سے نئی نسل کو آگاہ کیا ہے۔ اور ایک فوجی کی پوتی اور کرنل حبیب کی بیوی ہونے کے ناطے اپنے قومی پرچم کو سرنگوں ہونے سے بچانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

خدا انہیں اس کارِ خیر کا اجر دے۔ آمین!

رعنا فاروقی

پیش لفظ

زندگی ایک کہانی ہے۔ کردار و عمل کی کہانی۔ طرزِ معاشرت اور طرزِ فکر کی داستان۔ ایک عمر کے پیچھے بیتے ہوئے لمحوں اور آنے والے خیالات کی کہانی۔

چنانچہ کہانیوں کو کسی بھی طور زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی بچپن میں ساعت کی شروعات کہانی سے ہوتی ہے، جسے معصوم ذہن اپنے اندر بسا کر ان ہی کہانیوں کے تانے بانے بنتے ہوئے جوانی کی منزل تک آ جاتے ہیں، جہاں خواب جاگتے ہیں۔ اور ان جاگتے خوابوں سے آگے بڑھاپے کی منزل تک کہانیاں زندگی کا احاطہ کئے رہتی ہیں۔

اُردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر داستان گو کا قلم اس لئے بھی معتبر ٹھہرا کہ اس نے لفظوں کے جادو جگاتے ہوئے ان کہانیوں کو نوکِ قلم پر لا کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے امر کر دیا۔

چنانچہ داستان آج بھی معتبر ٹھہری کہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے اس تیز دور میں بھی کتاب اور ادب سے محبت کرنے والے انسان یقیناً قابلِ قدر ہیں۔

''دل، درگاہ اور دیا'' میرے تین ناولٹ کا مجموعہ ہے۔ اور شاید میری ادنیٰ سی کاوش بھی کہ یہ ناولٹ انسانی جذبات و احساسات اور حُب الوطنی کے جذبے سے مزین ہیں۔ میری ان تحریروں نے ماضی قریب میں میرے محترم قارئین سے پسندیدگی کی سند پائی جبکہ ''پاؤں کی جوتی'' کے بارے میں محترمہ رعنا فاروقی نے فرمایا۔ ''ایسا تو میں لکھنا چاہتی تھی۔''

مجھے امید ہے کہ ''وردی، وعدہ اور وفائیں'' کے بعد ''دل، درگاہ اور دیا'' کو بھی پذیرائی بخشی جائے گی۔

آج کا دور نفسانفسی کا دور ہے۔ ہمارے پاس شاید نصف صدی سے زیادہ کی زندگی تو ہے لیکن وقت نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ محترم قارئین! کہ نفسانفسی کے اس دور میں وقت کی کمی کے باوجود کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کتاب سے محبت کرنے والے لوگ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ تحریر بہترین ساتھی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں باقی شعبوں کی طرح ادب میں بھی اجارہ داری کا سلسلہ ایک عرصے تک غالب رہا۔ یہاں تک کہ ڈائجسٹ میں

لکھنے والوں کو ادیب کا درجہ دینا ہی بڑی دور کی بات تھی۔ مولائے کُل آسودگی بخشے جناب سہام مرزا صاحب کی ذات شریف کو، اللہ پاک غریق رحمت فرمائے جناب محمود ریاض صاحب کی ذاتِ باصفات کو اور ربِ عظیم صحتِ کاملہ عنایت فرمائے جناب معراج رسول صاحب کو جنہوں نے ڈائجسٹ کی مصنّفات کو پذیرائی بخشی اور اہلِ ادب کو یہ احساس دلایا کہ بے شک قلم کسی کی میراث نہیں، یہ تو عطیۂ خداوندی ہے کہ اس کی ذات جسے چاہے، بخش دے۔

میں ذاتی طور پر بھائی محمد علی قریشی کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے باکمال مہربانی ڈائجسٹ کی مصنّفات کو بہترین ادیب تسلیم کرتے ہوئے ان کی تخلیق کردہ کہانیوں کو کتابی صورت اشاعت کے قالب میں ڈھال کر ثابت کر دیا کہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بہت شکریہ محترم قارئین اور بے حد شکریہ ان احباب کا جنہوں نے "وردی، وعدہ اور وفائیں" کو پذیرائی بخشتے ہوئے مجھے اپنی دعاؤں اور خلوص سے مالا مال کر دیا۔ میں آپ سب کی سلامتی کے لئے دعا گو ہوں اور پیارے پاکستان کے لئے بھی۔ اس لئے کہ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔ مولائے کُل ہمارے وطن کو سلامت تا قیامت رکھے۔ (آمین)

بصد خلوص

ساجدہ حبیب۔ راولپنڈی

مورخہ 11 مئی 2011ء

دل درگاہ اور دیا

بھادوں کی حبس زدہ شام میں جب شہر کی تمام روشنیاں بجھ چکیں اور چاند آدھی رات کا سفر طے کرنے کے بعد آسمان کے عین وسط میں آن رکا تو اونچی ڈیوڑھی سے اندرونی کمرے تک بچی بچ کا سفر طے کرتے ہوئے کئی ایک دیے مولوی احمد حسن کی ذات کے اندر جھلملانے لگے۔

اندر...... وہ سراپا منتظر تھا۔ جسے حاصل کرنے کے لیے اپنی تیس سالہ زندگی کے تیسرے عشرے میں انہوں نے صدیوں کی مسافت طے کی تھی۔ اگرچہ ان کے اپنے نظریات کے مطابق اس دارالفانی میں عورت کا وجود کھلے سمندر میں تیرتی اس کشتی کی مانند گردانا جاتا تھا' جو بغیر بادبان کے اپنے وجود کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اپنی پیدائش کے روز اول پر یہ سائبان باپ یا بھائی کے روپ میں سامنے آتا ہے اور آغاز جوانی سے بڑھاپے کے اختتام تک مجازی خدا' اس سائبان کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدرت نے اس سائبان میں اتنی زیادہ طاقت بھر دی ہے کہ وہ اپنے کمزور وجود کے ساتھ ہی سہی' لیکن اس کشتی کو جس طرف چاہے موڑنے کی سکت رکھتا ہے۔

چلیے! نظریات اور افکار کی اہمیت تو اپنی جگہ ہی سہی۔ مگر آج زندگی کا رنگ نیا تھا' کیونکہ آج اس سفر کے آغاز پر ہی مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں قضا ہو چکی تھیں۔ دل کی دھڑکنوں نے بڑا ہی عجب رنگ اختیار کر لیا تھا۔ آج خدا جانے کیوں' ان میں خوشی کا عنصر تو ضرور شامل تھا' لیکن دونوں نمازیں قضا ہو جانے کا کوئی ملال نہ تھا! مولوی احمد حسن کے قدم کمرے کی دہلیز پر پہنچ کر رک گئے۔ انجانی خوشیوں کا سارا عکس ان کے چہرے کی سنہری رنگت میں گھل مل گیا۔ وہ مسکرائے! یہ مسکراہٹ اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ اب اس سنگ میل سے آگے کے سفر میں زندگی روشنی اور

خوبصورتی کے ساتھ وہ بھی ہمسفر تھی۔ جس کے عالم دین دادا نے اس کا نام زیور رکھا تھا۔

جی ہاں! زیور! زیور فضل الٰہی۔ اسلامی کتب میں سے ایک کا نام سجدے کی طرح اپنے پیشانی پر سجائے ہوئے تمام تر شرعی حقوق کے ساتھ۔ اس وقت مولوی احمد حسن کے نام منسوب ہو چکی تھی۔ ادھر خدائے مجازی کے قدموں کی پہلی آہٹ زندگی میں در آئی۔ اُدھر زیور فضل الٰہی کا سارا وجود ایک ہلکی سی کپکپاہٹ کے بعد پسینے میں شرابور ہو گیا۔ گہری خاموشی نے فضا کو بے حد بوجھل کر دیا تھا۔ رات کا چاند مسکرایا کہ آج ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں بغیر کسی گھبراہٹ کے اپنی خطابت کے بے مثال جوہر دکھانے والے مولوی احمد حسن کو اپنی زندگی کے اس انتہائی سنگ میل پر خود سے کئی درجے کمتر اور بے بس مخلوق کے سامنے کھڑے ہو کر اسے مخاطب کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

بھادوں کی اس رات کا آسمان اگرچہ بادلوں میں چھپ گیا تھا' لیکن اس گہری تاریکی میں حسن زیور نے ایسی روشنی بخش دی تھی کہ مولوی احمد حسن کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔

وہ......! اس قدر خوبصورت ہو گی۔ انہوں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ ان کی پہلی نظر چمکتے دمکتے سنہری ٹیکے پر پڑی' جس کے داہنی جانب جھومر کی لڑیاں جھلملا رہی تھیں۔ رو پہلی کامدار چوڑی گلابی پٹی نے شہابی رنگت والے چہرے کے گرد گویا نور کا ہالہ بکھیر دیا تھا۔ سرخ ہونٹوں اور تیکھی کھڑی ناک کے بائیں جانب نتھ کا دائرہ بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ کانوں میں ذرا ذرا سے جھولتے ہوئے آویزے کسی اجنبی پکار کی علامت دکھائی دے رہے تھے۔ مسہری کی سمت بڑھتے ہوئے ان کے قدم ذرا سے لرزے۔ ہمت کر کے انہوں نے بمشکل تمام اپنے خشک حلق کو لعاب دہن کی مدد سے تر کیا اور اپنی اس آواز میں جو کہ ہزاروں سامعین پر سحر طاری کر دیا کرتی تھی۔ انہوں نے زیور کو مخاطب کیا۔

''اگر طبع نازک پر ناگوار نہ گزرے تو از راہ کرم مسہری سے نیچے تشریف لا کر اپنا آنچل مبارک فرش پر پھیلا دیجیے۔ ہم شکرانے کے نوافل ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

لیکن دوسری جانب بڑی گہری خاموشی تھی۔ مولوی احمد حسن کا سارا وجود نگاہیں بن گیا تھا۔ یہ نگاہیں زیور فضل الٰہی کی سمت دیکھ تو رہی تھیں' مگر یہ جان نہ پائیں کہ وہاں اس تقریر کی بجائے زندگی صرف ایک لفظ کی منتظر تھی کہ ان لمحوں میں سانولے چہرے پر خوبصورت آنکھیں لئے اپنے

لبوں کی نرم مسکراہٹ کے ساتھ قریب آ کر کوئی فقط ایک لفظ کہے گا۔ ''زیبی۔''

اور کائنات اس ساری پکار پر مکمل ہو جائے گی۔

لیکن ایسا نہ ہوا جیسا کہ دل نے چاہا تھا۔ زیور نے شاید کسی انجانی آہٹ پر چونک کر بے اختیار نگاہیں اٹھائی تھیں' مگر اس آواز سے منسلک کوئی بھی وجود سامنے نہ تھا۔ البتہ مسہری کے داہنی جانب کھڑے مولوی احمد حسن اپنے جواب کے منتظر تھے۔

فقط ایک پل کے بعد وہ اٹھی اور پھر زندگی کا جلترنگ بج اٹھا۔ ماتھے کے ٹیکے سے لے کر پاؤں کی پائل تک پہنے گئے ہر زیور کا انگ انگ گونج گیا۔ عروسی جوڑے کے اس حسین ارتعاش نے احمد حسن کی ذات کے اندر کسی بھاری چٹان کی ٹوٹ پھوٹ کا سا عمل بھر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لمحوں کی ان پکار پر ٹوٹ کر بکھر جاتے۔ زیور کے قدموں نے مسہری سے نیچے اتر کر اپنے وجود کو دو زانو ہو کر جھکایا اور قبلہ رُو ہو کر اس نے اپنا آنچل خدائے مجازی کے قدموں تلے بچھا دیا۔

مولوی احمد حسن کا سجدہ شکرانہ بے حد طویل ہو گیا۔

ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے اور پرسوز آواز میں سورہ رحمٰن کی ان آیات نے کمرے پر سحر طاری کر دیا۔ جس میں رب عظیم نے بار بار اپنے انسانوں سے سوال کیا ہے؟

''فبای الاء ربکما تکذبٰن'' (تو اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

اس نوری کلام کے زیر اثر ایک سحر میں گرفتار دلہن بنی زیور بے حس پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔

عبادت ختم ہوئی تو احمد حسن نے اپنے قدموں تلے بچھا ہوا جھلملاتا آنچل فرش سے اٹھا کر زیور پر ڈال دیا۔ چمکتی ہوئی کندنی رنگت والی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے سرخ رنگ کی ڈبیا نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر انگوٹھی کو دیکھا۔ مشرقی روایات کے مطابق اس انگوٹھی کا ہالہ زندگی کا وہ دائرہ تھا' جس پر مشرق کی بیٹی اپنی ساری زندگی قربان کر دیتی ہے۔

زیور کا دایاں ہاتھ پکڑ کر جب انہوں نے یہ دائرہ اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں بطور شرعی نشانی پہنا کر ایک اہم رسم کی ابتدا کرنا چاہی تو انہوں نے دیکھا۔ وہاں سرخ نگینے والی ایک انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ جس کے ساتھ سونے کا ایک خالی دائرہ بھی چمک رہا تھا۔ انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے انہوں نے اس نشانی کو زیور کی انگلی سے الگ کرنے کی کوشش کی تو ازدواجی زندگی کے آغاز پر اس خاموش بت نے پہلی مزاحمت کا اظہار کیا۔ زیور نے احمد حسن کی یہ کوشش کامیاب نہ

ہونے دی۔ ایک دم اس نے دایاں ہاتھ کھینچ لیا اور اپنا بایاں ہاتھ ذرا سا آگے کر دیا' جس کی انگشت شہادت خالی تھی۔ مولوی احمد حسن نے ردعمل کے طور پر حیرت سے بنا کسی پتوار کے اس ڈولتی ناؤ کی طرف دیکھا' جو زندگی کے سمندر میں اب اس سائبان کے رحم و کرم پر تھی۔ ایک لمحے کے لیے انہوں نے کچھ سوچا اور پھر اپنے نام کی نشانی اس انگشت شہادت میں پہنا کر گویا ایک عورت کی ساری کائنات مکمل کر دی۔

نماز فجر کے قضا ہو جانے کا غم لئے ہوئے وہ اٹھے۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ یہ روشنی ایک نئی زندگی کا پیام تھی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرہ زیور کے وجود سے خالی تھا۔ آج کے دن کا آغاز بڑا عجیب تھا۔ وہ تو زندگی بھر کبھی اتنی گہری نیند نہ سوئے تھے کہ مؤذن کی پکار انہیں بیدار ہی نہ کر سکے۔ ندامت کا ایک ہلکا سا غبار ان کے سارے وجود پر چھا گیا۔ فوراً ہی بیتے ہوئے لمحوں کو خیالات میں دہرا کر گزری ہوئی شب کے سحر کو تازہ کرنے کے بجائے انہوں نے پاکیزگی کا لبادہ اوڑھا اور اپنی قضا نمازوں کی تکمیل میں لگ گئے۔

روح کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو انہوں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ سادہ لباس میں ملبوس زیور برآمدے میں کھڑی تھی۔ ساتھ ہی ایک نوعمر لڑکا اپنے معصوم سے چہرے کے ساتھ کھڑا جھک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

مولوی احمد حسن نے اپنی ازدواجی زندگی کی پہلی صبح کو یہ منظر دیکھا تو شک کی ایک لہر ان کے اندر سے اٹھی اور ان کے ہاتھوں سے کھڑکی کا پردہ چھوٹ گیا۔

زیور اندر چلی آئی۔

اماں نے اس صبح رزاق کے ہاتھ ناشتہ بھیجا تھا' جس کی وصولی کے لیے پیام ملنے پر زیور بلااجازت کمرے سے باہر چلی گئی تھی' چنانچہ فرد جرم عائد ہونے پر آغاز تفتیش کرتے ہوئے مولوی احمد حسن نے اپنے تمام تر شوہرانہ حقوق کا استعمال فرماتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''کون تھا یہ......؟'' ان کا اشارہ رزاق کی طرف تھا۔

''میرا ماموں زاد بھائی رزاق۔'' زیور نے واضح لفظوں میں جواب دیا۔ ''اماں نے ناشتہ بھیجا تھا۔'' اس نے مزید وضاحت کی۔

''نامحرم ہے یہ۔'' احمد حسن نے کہا۔ ''شرع میں تو آپ کا اس سے پردہ کرنا بنتا ہے۔''

''وہ مجھ سے چودہ برس چھوٹا ہے۔'' زیور نے ہمت کر کے کہا۔ ''اپنی ماں کی وفات کے بعد اسے اماں نے ہی پالا ہے۔ میرا اس سے رشتہ چھوٹے بھائی کا ہے!''

''ایسی تاویلیں پیش کر کے آپ مذہب کو نہیں جھٹلا سکتیں۔'' احمد حسن کی آواز اس دلیل کے جواب میں قدرے اونچی ہو گئی۔ ''شریعت کے مطابق جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے' وہ بہرحال ایک مستند حقیقت ہے۔'' احمد حسن کا خطیبانہ انداز سامنے آ گیا۔ وہ منتظر رہے کہ شاید جواب میں کسی دلیل کی آمد ہو گی۔ دوسری جانب بڑی گہری خاموشی پا کر انہوں نے کہا۔

''بہرحال......! آئندہ محتاط رہیے گا۔''

ازدواجی صبح کے آغاز پر آئندہ زندگی کے لیے احتیاط برتنے کا مشورہ دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

اور ساس صاحبہ اندر آ گئیں۔ ان کا انداز تیکھا اور تیور کل کی نسبت بدلے ہوئے تھے۔ یہ خاتون جنہیں ساری زندگی ان کے محدود ذہن والے شوہر نے ہمیشہ جوتی کی نوک پر رکھا تھا' اس وقت احمد حسن کی والدہ ہونے کے ناطے ساس کا اعلیٰ ترین رتبہ پا کر اترا رہی تھیں۔ زیور پر ایک ترچھی نظر ڈال کر انہوں نے بہ آواز بلند پہلا سسرالی سوال داغ دیا۔

''یہ...... آپ کی اماں نے صبح ہی صبح ناشتہ بھجوانے کی زحمت کیوں گوارا کی؟ اس گھر میں ناشتہ نہیں بن سکتا تھا کیا؟''

ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ زیور کے بدن میں جاگی۔ اس محاذ پر عملی طور پر باقاعدہ جنگ کے آغاز کا یہ پہلا مرحلہ تھا' جو آگے چل کر اختلافات کی وسیع خلیج بن سکتا تھا۔

''یہ ہمارے ہاں کی ریت ہے اماں جی۔'' اس نے ادب سے عرض کیا۔ ''بیٹی کے سسرال میں صبح کا ناشتہ بڑے اہتمام سے روانہ کیا جاتا ہے تاکہ......!''

لیکن زہریلے شبدوں نے جملہ کاٹ دیا۔

''تاکہ گھر میں مقیم رشتے داروں پر یہ واضح کیا جا سکے کہ تمام اہل خانہ اس قدر کنگال ہیں کہ دلہن کو صبح کا ناشتہ بھی فراہم نہیں کر سکتے۔''

''نہیں ماں جی! یہ بات نہیں۔'' زیور نے وکالت کرنا چاہی تاکہ ماں جی کو دلیل سے قائل کر سکے۔

"بہرحال۔" انہوں نے کسی ماہر مقرر کی طرح ہاتھ لہرا کر کہا۔ "آئندہ ایسی کوئی بھی حرکت بغیر پوچھے نہ کی جائے۔"

کمرا گویا کہ ہٹلر کے وجود سے خالی ہوگیا اور ہوا کے کسی خوشگوار جھونکے کی مانند عزیز از جان دوست نیلوفر کی آمد ہوئی۔ صبح کی پہلی پرواز سے وہ مظفرآباد پہنچی تھی اور بقول اس کے دو گھنٹے کے شدید ترین انتظار کے بعد زیور کا دیدارِ عام نصیب ہوا تھا۔

"توبہ ہے یار۔" وہ مناسب سلام دعا کے بغیر ہی حسب عادت نان سٹاپ بولنے لگی۔ "تمہارے علاقے کی اس پرواز نے میرے تو پرخچے اُڑا دیئے۔ ایک تو ایئر پاکٹس' دوسرا ستم یہ کہ بالشت بھر کا ہوائی جہاز۔ ہر لمحہ یوں محسوس ہوتا تھا' گویا کہ ابھی دریائے نیلم میں گر کر اناللہ ہو جائیں گے اور تمہارے ولیمے کی تقریب بنا کسی تکلف کے بہ آسانی سوئم کے ختم شریف میں بدل جائے گی۔ شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا اور ہم آسانی سے اس رن وے پر اتر آئے جو بین الاقوامی کرکٹ کی پچ سے بس چند فٹ ہی لمبا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم تمہیں مبارکباد دیں' تمہیں چاہئے کہ تم ہمیں مع اہل وعیال مبارکباد پیش کرو۔"

دوسری سمت آنسو اس وقت ہمسفر تھے۔

"ارے؟" نیلوفر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ آنسو کیا ہم سب کے زندہ بچ جانے کی خوشی میں ہیں۔ یا پھر......؟" زیور خاموش رہی۔

"اچھا۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "تو کیا وہ نخرے ہیں جو ہر نئی نویلی دلہن ولیمے کے دن میکے والوں کی آمد پر دکھا کر بظاہر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی ہے کہ اسے بابل کے گھر سے جدائی گراں گزری ہے۔ حالانکہ دل میں وہ ان قاضی صاحب کی بے حد مشکور ہوتی ہے جنہوں نے اس سے "قبول ہے" جیسا مختصر لیکن نایاب مکالمہ پڑھوا کر گویا ایک احسانِ عظیم فرمایا ہوتا ہے۔"

"نیلو۔ تم......! تم بھی اتنی کٹھور ہو؟" زیور نے آنسو بھری زبان سے شکوہ کیا۔ "تم سب کچھ جانتی ہو۔"

"ہاں۔" نیلوفر نے سرد آہ بھری۔ "جانتی تو ہوں مگر کچھ کر نہیں سکتی۔ بھئی' میری مانو تو ماضی کو بھلا کر حال کی راہ چلنا سیکھو' اسی میں بہتری ہے۔ ہمارے ہاں تو ویسے بھی مشرقی روایات کے مطابق ہماری تمام عمر کی خواتین قربانی کا زبردست سمبل سمجھی جاتی ہیں۔"

دونوں ہاتھوں سے چہرے کے آنسو پونچھ کر زیور نے بہت درد سے کہا۔ "یہ...... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔"

"کوئی اتنا مشکل بھی نہیں۔" نیلوفر نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ہفتے دس دن میں تم اس ماحول کی عادی ہو جاؤ گی۔ تو سب کچھ اچھا لگے گا اور پھر احمد حسن کوئی برا آدمی نہیں ہے۔ قسم اللہ پاک کی' اتنا خوبصورت مولوی تو میں نے مصر میں بھی نہیں دیکھا۔"

ایک دم ثریا بیگم کے اندر آ جانے سے گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ موصوفہ احمد حسن کی بڑی ہمشیرہ تھیں۔ وہ تیاری کا حکم صادر فرمانے آئی تھیں' بالکل اپنی ماں جی کی طرح۔ لگتا تھا کہ تیوری کے تمام بل انہیں وراثت میں ملے ہیں' جنہیں وہ اس خوشی کے موقع پر بھی ماتھے پر سجائے ہوئے تھیں۔

"آپ لوگ تیار ہو جائیں نا بھئی۔" انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد لہجے کو کھینچ تان کر دس گز کی مناسب لمبائی عطا کرنے کے بعد حکم صادر کیا۔ "مہمان آ جائیں گے تو سب کا ایک ہی اصرار ہوگا کہ دلہن کو جلدی لایا جائے۔"

"بہتر جناب۔" نیلوفر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ "ابھی حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔"

اس کا مزاحیہ لہجہ بھی ثریا بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ نہ لا سکا۔ بدستور تنے ہوئے چہرے اور تیکھے مزاج کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ "اس کے بھائی کا مزاج بھی ایسا ہی ہے کیا؟" نیلوفر نے پلٹ کر زیور سے سوال کیا۔ "موصوفہ تو خیر سے سرخ لال اور ہری مرچ کی بڑی بہن لگتی ہیں۔"

"لمحوں میں بھلا کب کوئی کسی کا مزاج جان پایا ہے۔" زیور کا جوابی لہجہ رقت آمیز تھا۔ "عمریں بیت جاتی ہیں' تب بھی مزاج سے شناسائی کا عمل طے نہیں ہو پاتا۔ یہاں تک کہ زندگی کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔"

نیلوفر نے اس کی طرف دیکھا۔ آنسو اپنا سفر چہرے پر مکمل کرنے کے بعد رخساروں کے آس پاس کہیں غائب ہو چکے تھے۔

"پھر وہی فلسفہ۔" نیلوفر نے اپنی روایتی شگفتگی سے کام لیا اور اس ماحول کی کدورت دور کرنے کے لیے ایک کھوکھلا قہقہہ لگانے کے بعد اس نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"ویسے یار۔ کیا کمال کی بات ہے' تمہارے اس آزاد کشمیر کے خطے کی۔ ادھر پاکستان میں

لوگوں کو دعوت ولیمہ میں فقط چائے کی ایک پیالی ملتی ہے' جبکہ یہاں ابھی تک دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ عوام پلیٹیں بھر بھر کر پلاؤ زردہ کھاتے ہیں اور سلامی کے نام پر ایک لفافہ پکڑا کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ جس میں سے پیارے قائداعظم کی وہ تصویر نکلتی ہے جو ہماری اس اصول پسندی پر ماتم کناں ہوتی ہے۔"

ادھر نیلوفر کا یہ لیکچر ختم ہوا۔ ادھر ماں جی کی دوبارہ آمد ہوئی۔ مناسب تیاری اور طویل گھونگھٹ کی افادیت پر اپنا استدلال انہوں نے کچھ اس طرح دہرایا۔

بال سادگی سے بنائے جائیں۔ چہرے پر لیپاپوتی کی کوئی ضرورت نہیں' لیکن یہ بات بے حد ضروری ہے کہ تمام تر زیورات اس جسد خاکی پر ضرور سجائے جائیں تاکہ بہو کو سونے میں تول کر لانے والا محاورہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوجائے اور ہاں......! لمبا گھونگھٹ نکالنا بھی اہم ہے۔ دوپٹہ اس طرح نہ لیا جائے' جیسا کہ کل کی تیاری میں "پن اپ" کیا گیا تھا۔ آدھا سر ننگا تھا۔ لہٰذا برادری میں ناک کٹ جانے کا خدشہ اس وقت تک برقرار رہا۔ جب تک کہ ثریا بیگم نے ان پر وہ بنارسی چادر نہ ڈال دی جو کہ احمد حسن کی دادی جان مرحومہ کی خاص نشانی تھی۔ اس چادر کے اندر زیور کی زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

تمام تر احکامات کی تکمیل بخوبی سرانجام پا گئی۔ اندر زنان خانے میں طویل گھونگھٹ کو بارہا اٹھا اٹھا کر اس کا چہرہ بار بار دیکھا گیا۔ زیورات پر بے لاگ تبصرے ہوئے۔ کپڑوں کے انتخاب کو سراہا گیا۔ "بہت پیاری ہے' بہت خوبصورت ہے" جیسے فقرے کانوں میں انڈیلے جاتے رہے! لمحے گزرتے چلے گئے۔

زیور کی انگشت شہادت میں پڑی انگوٹھی کا سرخ نگینہ مسکراتا رہا اور......! دل خاموش رہا۔

کشمیر میں اس شب برسات کے بادل بڑی شدت سے برسے۔ وہ سرشام ہی بابا کی حویلی میں واپس آ گئی تھی۔ شباب شاہ اور بی جی کا اصرار تھا کہ ریت رواج کے کسی بھی بندھن کو توڑا نہ جائے اور ولیمے کی شب دلہن کی واپسی کے پروگرام میں کوئی رخنہ نہ ڈالا جائے۔ احمد حسن نے تو بادل ناخواستہ اجازت دے دی تھی۔ البتہ ماں جی اور ثریا بیگم کی تیوری کے بل گہرے ہو گئے تھے جو بقول نیلوفر کے "اتنے گہرے اور ٹیڑھے تھے کہ انہیں سیدھا کرنے کے لیے بلاشبہ کسی "روڈ رولر" کی خدمات درکار تھیں۔

بارش کا زور بڑھ گیا۔ مہمان رخصت ہوگئے۔ زیور اندر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ فقط ایک شب نے تو ساری کائنات ہی بدل دی تھی' لیکن یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ الماری کھول کر اس نے اپنا وہ جوڑا نکالا جسے نیلوفر ہمیشہ "نمازی جوڑا" کہا کرتی تھی۔ یہ وہ لباس تھا جسے پہن کر اور اوپر ململ کا کھلا دوپٹہ اوڑھ کر وہ باہر اپنے رب کے حضور جھک کر اپنے ایمان کی سلامتی' اپنے بھائیوں' ماموں باپ' دیگر احباب اور اپنے پیارے وطن کے لیے خیروعافیت اور امن وسلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔

کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر و بیشتر آنسو بھی ان دعاؤں میں شریک ہوجاتے۔

ہاں ایسا ہوتا تو ضرور تھا مگر قبولیت کے سارے در شاید بند تھے۔

اس لئے کہ انفرادی طور پر سب ہی اپنے اپنے حال میں صرف بہتر ہی نہیں بلکہ بہترین زندگی گزار رہے تھے۔ فقط حالات وطن ہی بہتر نہ تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں جاری شدہ آٹھ سالہ تحریک آزادی اپنی شدت سمیت اب کچل ڈالنے کی راہ پر ڈال دی گئی تھی۔ شہادت اب ہر گھر کا مقدر تھی۔ نوجوانوں کی ایک پوری نسل اس وار پر جھول چکی تھی۔ کشمیر میں شہداء کے قبرستانوں کا ایک پورا چمن زار سج چکا تھا۔ نام نہاد سیاست نت نئے پینترے بدل رہی تھی۔ ہر گھر سے بین کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ گلی کوچوں کا محاصرہ' گھر گھر تلاشی' گینگ ریپ' اجتماعی قتل عام اور نہ جانے کیا کچھ!

اور پھر جب...... کشمیری قوم آٹھ سالوں تک خون میں نہا کر یہ سب کچھ برداشت کرچکی تو اقوام متحدہ نے مسئلہ کشمیر کو اقوام عالم کے ایجنڈے سے نکال کر باہر پھینک دیا! بس صرف یہی ایک دکھ تو تھا۔

زیور لباس تبدیل کرکے باہر آئی تو اس نے دیکھا۔

ملکہ بھابی جھک کر ایک کارڈ اور خوبصورت ریپر میں سرخ ربن سے مزین ایک تحفہ اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس جا رہی تھیں۔

"ملکہ بھابی۔" اس نے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی ملکہ بھابی کو آواز دی۔ "رکیے نا! یہ نذرانہ کس کی طرف سے ہے؟"

ملکہ بھابی رک گئیں۔ فقط دو آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ان کا سارا چہرہ لال ہوگیا' مگر

آنسو کے قطرے بہت طاقتور' بہت مضبوط اور ضدی تھے۔ بڑی آسانی سے آنکھوں کے حجروں سے باہر آ گئے۔

ان آنسوؤں کے پیچھے ایک مکمل داستان تھی۔

جذبوں کو مات کھانے کی داستان' نامکمل ادھورے اور نامراد عشق کی وہ داستان جس میں محبت کرنے والے انسان بڑی آسانی سے ہار جاتے ہیں اور باقی ساری دنیا جیت جاتی ہے۔ ملکہ بھابی کچھ نہ بولیں۔ خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گئیں۔ زیور نے آگے بڑھ کر پیکٹ اٹھالیا۔

ایک مخصوص اور جانی پہچانی مہک اس کے ہاتھوں سے سفر کرتے ہوئے اس کی ذات کے اندر تک اتر گئی۔ دل کے صحرا پر چھائے ہوئے غبار کو ایک پکار' ایک صدا نے اور گہرا کر دیا اور یہ پکار دل کے دروازے تک چلی آئی۔

"پرویز علی شاہ......!" دل نے پکارا۔

"پرویز علی شاہ......!" سرخ نگینے نے انگوٹھی کے وجود میں مقید رہتے ہوئے بھی صدا دی۔

"پرویز علی شاہ......!" آنسو بھی بول اٹھے۔

باہر برستی بارش کا رنگ گہرا ہو گیا۔

کاغذ کا پردہ ہٹا تو سرخ مخملی ڈبے کے اندر سے چمکتا دمکتا ہوا ہار نظروں کے سامنے آ گیا۔

کارڈ پر نظر پڑی تو جیسے درد کے سارے ندی نالے ایک مجبور اور بے بس عورت کے اندر بڑی شدت سے اتر آئے۔ سرخ حروف میں کتنی بے دردی سے لکھا گیا تھا۔

"رسم و رواج کی اس جیت کی خوشی میں یہ ہار مبارک ہو۔" کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہار نیچے فرش پر گر گیا۔

اور......! پہلے جذبوں کی پہلی بارش والی وہ گہری شام ذہن کے دریچوں سے اندر آن رکی!

ساون رُت کا آغاز تھا اور ملکہ بھابی ان دنوں امید سے تھیں۔ خالد بھائی بصد اصرار اسے ساتھ لے گئے تھے کہ اوپر تلے کی تین اولادوں کے بعد اس چوتھی "ناگہانی آمد" نے انہیں خاصا پریشان کر دیا تھا۔ اگرچہ اپنے امتحان کے بعد وہ فارغ تھی' پھر بھی بابا جان کی مرضی کے خلاف اماں نے اسے بھیج دیا تھا۔ ویسے بھی خالد بھائی اماں کے لاڈلے بھانجے تھے اور اماں کے لیے ان کی کسی بھی فرمائش کو رد کرنا بے حد مشکل تھا۔ ملکہ بھابی نے اس کی آمد پر گویا شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ گھر کے تمام

امور سے بے فکر ہو کر اب وہ آرام سے تخلیق کے تمام مراحل بخیر و خوبی طے کر سکتی تھیں! ملکہ بھابی کا لاڈلا دیور وقار احمد عرف وکی بے حد خوش تھا کہ اب مزے مزے کے پکوان تناول فرمانے کو ملیں گے۔ جبکہ پنکی' سعدی اور شیری دیومالائی کہانیاں سننے کے لیے بے تاب تھے۔ ایبٹ آباد کے جس علاقے میں خالد بھائی کی رہائش تھی' بلاشبہ اس کا شمار "پوش ایریا" میں کیا جا سکتا تھا۔ "سرحد سال انڈسٹریز" کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے ان کا عہدہ بہت اچھی حیثیت کا حامل تھا۔ زندگی پُرآسائش تھی۔ ڈرائنگ روم کی سیاست ہر گھر کا طرہ امتیاز تھی اور یہ وہ طبقہ تھا جو اس قوم کی زندگی میں ہمیشہ سے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھاتا چلا آیا تھا۔ فقط چند دنوں کے بعد ہی جب وہ اس ماحول سے قدرے مانوس ہو چکی تو گھرے بادلوں کی برستی بارش والی شام میں وہ اجنبی گھر کے برآمدے میں آن رکا۔

وکی کی فرمائش پر پیزا بناتے ہوئے اس نے ناگواری سے بجتی گھنٹی کی آواز سنی۔ ملازم موجود نہ تھا۔ دروازے تک جانے میں اس نے بے حد کوفت محسوس کی۔ اپنے گیلے ہاتھوں کو سفید شیفون کے دوپٹے سے خشک کر کے زیور نے دروازہ کھولا۔ باہر ستون کے ساتھ پشت کر کے کھڑے ہوئے اجنبی نے نہایت بیزاری کے عالم میں غالباً اس قدر تاخیر سے دروازہ کھولنے پر باآواز بلند اپنے جذبات کا ردعمل ایک بڑبڑاہٹ کی صورت ظاہر کیا۔ "عجب بے مروت لوگ بستے ہیں یہاں۔"

"فرمایئے......" دروازے کا پٹ تھامے ہوئے زیور نے پوچھا۔

اجنبی یکدم پلٹا اور پھر جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ بڑھتی ہوئی شام کا گہرا سیاہ اندھیرا' آسمان سے گرتی ہوئی بوندوں کی رم جھم میں برستی بارش کا جلترنگ' فضا میں مہکتے ہوئے پھولوں کی مہک۔ سفید ماربل کے فرش سے پرے دہلیز کے اس پار سفید شیفون کے دوپٹے کا لہراتا ہوا آنچل۔ ہوا کی تیزی سے اڑتی ہوئی زلف کا دلکش انداز اور اس سارے پس منظر میں کھڑی ہوئی زیور فضل الٰہی کی سوالیہ نگاہوں کا سوال۔

"آپ کون ہیں؟"

کائنات جیسے بالکل تھم گئی۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے لمحات ساکت ہو گئے اور بڑی دیر کے بعد پرویز علی شاہ کو ہوش آیا۔

"ملکہ آپی سے کہیے پرویز علی شاہ آیا ہے۔"

"ارے! پاری ماموں۔" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سعدی کی نظران دونوں پر پڑی تو وہ چلاتا ہوا واپس لاؤنج کی طرف بھاگا۔ "ماما...... جلدی آئیے پاری ماموں آئے ہیں۔"

بہت تیزی سے اپنے پھیلے ہوئے وجود پر ہلکی سی لون کی چادر کی ترتیب درست کرتے ہوئے ملکہ بھابی اپنے کمرے سے نکلیں اور پھر بے شمار دعاؤں کے درمیان صدقے واری ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی جسامت کا خیال کیے بغیر اس اجنبی کو گلے لگا لیا۔

تو گویا رُت ہی بدل گئی۔

رات گہری ہونے تک وہ بھلا اجنبی کب تھا۔ وکی نے یہ خبر سنتے ہی کہ اب ان کی پوسٹنگ "بلوچ سنٹر" میں ہو گئی ہے باقاعدہ طور پر بھنگڑا ڈال کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا جبکہ خالد بھائی مسلسل شکوہ کر رہے تھے کہ وہ اپنی کوئٹہ آمد کے فوراً بعد یہیں پر آ کر مقیم کیوں نہ ہوا؟ مانا کہ میس میں بڑی سہولت رہتی ہے' مگر گھر آخر گھر ہی ہوتا ہے۔

"اسے تو بہن کے احساسات کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔"

ملکہ بھابی نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس غریب پر فرد جرم عائد کر دی' جو فوج میں تو کپتانی فرماتا تھا اور دن بھر میں بلا مبالغہ سیکڑوں سیلوٹ جس کے منتظر رہتے تھے لیکن اس وقت یہاں اس گھریلو عدالت میں مجرم بنا بیٹھا تھا۔

"دراصل تھکاوٹ کا احساس بہت زیادہ تھا۔" اس نے اپنی صفائی میں اپنی وکالت کے پہلے نقطۂ آغاز پر دلیل دیتے ہوئے کہا۔ مگر سعدی نے فوراً بات کاٹ دی۔

"کیوں؟ کیا آپ کوئٹہ سے پیدل آئے تھے؟"

خالد بھائی نے اُسے گھورا۔ "سعدی! بدتمیزی مت کرو۔"

"بدتمیزی نہیں ابو یہ احتجاج ہے۔" سعدی نے جواباً کہا۔

"یہ بچے "فاسٹ میڈیا" کے دور کی نسل ہیں' بھائی صاحب۔" وکی نے اپنی رائے دی۔ "انہیں مطمئن کرنا آسان نہیں۔"

"چلیں جی آپ سب انہیں "غازی" سمجھ کر معاف کر دیں۔" پنکی نے اپنے پیارے ماموں کی سفارش کی۔

"معافی صرف اس شرط پر مل سکتی ہے کہ یہ ہر شام اس غریب خانے پر حاضری دیا کرے

گا۔" ملکہ بھابی نے فیصلہ سنا دیا۔

"ہر روز نہیں' صرف ویک اینڈ پر۔" اُس نے دبے لفظوں میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وکی فوراً مان گیا۔ "لیکن اس غلطی کے اعترافِ گناہ کے طور پر آپ ہمیں اپنے میس میں زبردست ڈنر دیں گے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے عاجزی سے سر جھکا کر کہا۔ "یہ ڈنر میرے کمرے میں ہوگا اور اس ماہ کی سولہ تاریخ کو کیونکہ یہی اس مجرم کی سالگرہ کی تاریخ ہے۔"

وکی اور سعدی نے زبردست نعرہ لگا کر اس عظیم الشان خبر کا خیر مقدم کیا۔ پنکی نے فوراً کہا۔

"ماموں' ہم آپ کو تحفے میں ایک ٹینک دیں گے۔"

"ٹینک نہیں بلکہ توپ مناسب رہے گی۔" سعدی نے مسکرا کر کہا۔

پرویز علی شاہ نے بہت دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی زیور پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا کر بولا۔

"آپ اتنا زیادہ تکلف نہ کریں۔ میرا تعلق انفنٹری سے ہے۔ ایک رائفل سے بھی کام چل جائے گا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" وکی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "رائفل ہی دے دیں گے۔"

"پلاسٹک کی ٹھیک رہے گی۔" بہت آہستگی سے یہ جملہ کمرے کے اس کونے سے پرواز کرتا ہوا پاری ماموں کے کانوں میں اترا' جہاں زیور بیٹھی تھی۔ نظریں بے اختیار اس سمت اٹھ گئیں۔ بڑی دلکش مسکراہٹ تھی' جو نگاہوں نے جذب کر لی۔ ساتھ موجود پنکی نے اس سچویشن کا زبردست نوٹس لیا۔ جواباً پرویز علی شاہ کا جملہ زیور فضل الٰہی کی ذات میں ایک سوالیہ نشان بن کر اتر گیا۔

"ساری قوم کی طرح' کیا آپ بھی سیاستدانوں کی غلطیوں کا ذمہ دار فوج کو ہی سمجھتی ہیں؟ ویسے جذبے سلامت رہیں تو پلاسٹک کی رائفل سے بھی لڑا جا سکتا ہے۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ البتہ وکی بول اٹھا۔

"بے شک جذبے سلامت ہونے چاہئیں' بھائی صاحب' پھر ہر محاذ فتح کیا جا سکتا ہے۔" مگر وکی کی یہ مضبوط دلیل ایک خاموشی کی نذر ہوگئی۔

بارش کے مدھم شور میں یہ سوال فقط ایک پل میں ہوا اور یہ پل ساری زندگی پر حاوی ہوگیا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" سرسراتی ہوئی ہوا کے ساتھ اس کا رُوئے سخن زیور کی طرف تھا۔

مگر وہاں اتنے نفوس کی موجودگی میں بھی بڑی گہری خاموشی تھی۔

"ہمارے ہاں کی تقریباً سبھی خواتین کا یہی المیہ ہے!" وکی نے اونچی آواز میں کہا۔ "بلا سوچے سمجھے الزام تراشی کر دیتی ہیں اور جب اپنے مؤقف کے حق میں دلائل دینے کا وقت آتا ہے تو پھر ان بے چاریوں کے پاس سوائے آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو برخوردار۔" خالد بھائی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "دراصل آنسو ہی وہ بہترین ہتھیار ہیں جن کی مدد سے خواتین زندگی کا تقریباً ہر محاذ بڑی آسانی سے فتح کر لیتی ہیں۔"

یہ گفتگو اس تازیانے پر بڑی زبردست چوٹ تھی، جو زیور کے احساسات کا مرکز تھا۔ ایک ذرا سے مذاق کا اس طرح نوٹس لیا جائے گا، ایسا تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں!" زیور نے رقت آمیز لہجے میں کہا اور اس لہجے سے اس شام کے اجنبی کو واقعی بے حد تکلیف ہوئی۔

"ماما۔" پنکی نے بات کا موضوع بدلنے کے لیے ماں کو مخاطب کیا۔ "اب پاری ماموں آ ہی گئے ہیں تو کچھ خاطر تواضع تو ہونی چاہیے نا؟"

"کھانا لگوائیں بھئی۔" خالد بھائی نے ملکہ بھابی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "صرف باتوں سے تو پیٹ نہیں بھر سکتا۔"

کھانا لگ گیا اور بقول سعدی کے کہ "اب تعریفوں کے کئی پل باندھنے پڑیں گے۔" چونکہ کھانا زیور نے ہی بنایا تھا۔

"واہ......! مچھلی تو زبردست بنی ہے! کیا آپ نے بنائی ہے؟"

ماحول کو خوشگوار بنانے یا پھر تھوڑی دیر پہلے کی معمولی سی تلخی کو مٹانے کے لیے پرویز علی شاہ نے براہ راست زیور سے سوال کیا۔

"جی نہیں۔" وکی نے حسب عادت لقمہ دیا۔ "یہ مچھلی انہوں نے نہیں بلکہ خدا نے بنائی ہے۔"

خدا جانے کیوں؟ اب کی بار مسکراہٹ کا جوزاویہ زیور کے چہرے پر ابھرا۔ وہ ایک دل کش احسان بن کر پرویز علی شاہ کے دل میں اتر گیا۔

اب وکی سب کو مسکراتا ہوا دیکھ کر خواہ مخواہ اداکاری کرنے کے شوق میں کہہ رہا تھا۔

"بڑی مصیبت ہے بھئی۔ یہ مچھلی تو ہر بار میرے ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔"

"قابو کرنا سیکھو چاچو۔" سعدی نے اپنی دانست میں عقل مندانہ مشورہ دیا۔ "ورنہ آپ زندگی میں کبھی ترقی نہیں کر سکیں گے۔"

"ڈش کے نام پر جو آسمانی بلا ہمارے گھروں کے اندر تک اتر آئی ہے، اس نے نئی نسل کو بے حد تیز و طرار کر دیا ہے۔"

خالد بھائی کہہ رہے تھے۔ "ایک ہمارا دور تھا کہ والد محترم کی اجازت کے بغیر ریڈیو تک آن نہیں کر سکتے تھے۔"

"وہ تو ایک ادبی دور تھا جو بیت گیا۔" پرویز علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "وہ مطالعے کا دور تھا۔ رات گئے تک لوگ کتابوں میں زندگی اور سکون تلاش کرتے تھے۔ اب تو خیر......!"

"ماضی ہمیشہ اچھا لگتا ہے ماموں۔" پنکی ایک دم بول اٹھی۔ "جب ہم لوگ بوڑھے ہو جائیں گے ناں! تو ہم بھی یہی کہا کریں گے کہ ہمارا دور بہت بہتر تھا جبکہ آج کل کا زمانہ بہت خراب ہے!"

"ان بچوں سے کون جیت سکتا ہے!" ملکہ بھابی نے کہا۔

"زمانے سے شرم و حیا ہی رخصت ہو گئی ہے۔" وکی فوراً بولا۔ "اب ان بچوں کو دیکھو۔ مجھ جیسے معزز بزرگ کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔"

کھانا ختم ہوا تو وکی نے شکر الحمدللہ کے ساتھ اس بات پر بھی اظہار تشکر کیا کہ شکر ہے، آج کھانے کی میز پر سیاست زیر بحث نہیں لائی گئی۔ یہ بھی فقط ایک معجزہ ہی تھا جو پاری ماموں کی آمد کے سبب رونما ہوا۔ ورنہ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ جناب خالد حسن خان اور ان کے اہل خانہ کھانے کی میز پر موجود ہوں اور ملکی سیاست پر بات کیے بغیر کوئی بھی نوالہ حلق سے اتر سکے۔

لیکن! اس شام کا اصل معجزہ تو اس اجنبی کی زندگی میں آمد تھی، جو مہکتی ہوا کے ایک سرسراتے ہوئے جھونکے کی مانند زندگی میں آیا تھا اور جس نے وقت رخصت برآمدے کی آخری سیڑھی پر بوگن ویلیا کی بیل کے قریب کھڑے ہو کر زیور سے کہا تھا۔

"اگر میری بات سے آپ کا دل دکھا ہو تو ازراہ کرم معاف کر دیجیے گا۔"

زیور فضل الٰہی کی زندگی میں اس شام کے بعد یہ پہلی رات تھی' جس رات وہ سو نہ سکی۔

لمحے اسی طرح رنگ بدلتے ہیں اور زندگی کی کہانیاں اسی طرح بنتی ہیں۔ جب پرسکون گزرتے وقت میں کسی بھی وقت کوئی بھی پرویز علی شاہ اجنبی مسافر کے روپ میں کسی بھی زیور کی زندگی میں اترتا ہے اور پھر صبح دم رات بھر جاگنے والوں پر آدرش کا وہ در کھلتا ہے جہاں طلب کی تمنا ہوتی ہے اور چاہنے یا پھر چاہے جانے کا عمل کبھی عشق حقیقی اور کبھی عشق مجازی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

چنانچہ...... بالکل ایسا ہی ہوا۔

ویک اینڈ کی اس شام جب وہ سب بقول "وکی کے" ایک عظیم الشان دعوت میں شرکت کے لیے میس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ زیور کے دل کی دھڑکنوں میں تناسب اور یکانگی نہ رہی۔ بے بی پنک کلر کے سوٹ کے ساتھ گہرے آتشی دوپٹے نے اس کے سراپا کو اگرچہ ڈھانپ لیا تھا' مگر اودے بادلوں والی اس شام میں جب یہ قافلہ "بلوچ سینٹر" کے میس میں پہنچا تو ان خوبصورت لمحوں کے میزبان کی نگاہیں اس سراپا پر سے ہٹ نہ سکیں۔ ملکہ بھابی اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ اندر جا کر صوفے پر براجمان ہو چکی تھیں۔ خالد بھائی گاڑی سے وہ سامان نکال رہے تھے جو سالگرہ کی خوشی میں وہ بطور سوغات ساتھ لائے تھے۔ سعدی اگرچہ پیاری ماموں کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا' تاہم پنکی نے اس بات کا زبردست نوٹس لیا کہ سچویشن ذرا سی نہیں بلکہ بہت ہی زیادہ گڑبڑ تھی۔ اودے بادلوں کی گہری شام' زیور فضل الٰہی کی جھکی نگاہیں اور پرویز علی شاہ کی دنیا و مافیہا سے بے خبری۔ ایسے میں سعدی نے وکی کو کہنی ماری اور وکی نے یہ پیغام بذریعہ کھانسی نشر کیا۔

"مشتری ہوشیار باش۔ خالد بھائی بھی قدرے حیرت سے ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔"

پل بھر میں سب ہی کچھ سنبھل گیا۔

بہت دیر سے مؤدب انداز میں کھڑے اردلی نے آگے بڑھ کر خالد بھائی کے ہاتھ سے چیزیں سمیٹ کر اندر کمرے میں پہنچا دیں۔ زیور کے قدموں نے جب پرویز علی شاہ کے کمرے کی دہلیز عبور کی تو دل کی دھک دھک نے قریب کھڑی پنکی کو پریشان کر دیا۔ چہرے کی گلال رنگت میں جذبوں کی ساری لالی مکمل گھل گئی تھی۔

"آپ کا دایاں ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے؟" پنکی نے زیور سے سوال کیا۔

"صرف دایاں ہاتھ ہی نہیں بلکہ بایاں ہاتھ بھی کانپ رہا ہے۔" وکی نے آہستگی سے کہا۔

"واہ کیا زبردست سجاوٹ ہے کمرے کی۔" اس نے اچانک لہجہ بدل کر سب کو مخاطب کیا۔ "لگتا ہے' کسی سلیقہ شعار خاتون نے گھر کا بیڈ کم ڈرائنگ روم سجایا ہے؟"

"یہ سب کچھ تم نے کس سے سیکھا؟" ملکہ بھابی پوچھ رہی تھیں۔ "مردوں کو کم از کم اتنا شعور تو نہیں ہوتا۔"

"فوج کی زندگی ایک سلیقے اور تناسب کا نام ہے۔" وہ بتا رہا تھا۔ "ٹریننگ ہی ایسی دی جاتی ہے کہ جانور بھی انسان بن جاتا ہے۔"

"اور انسانوں کا کیا بنتا ہے؟" وکی نے جھٹ سوال کیا۔

"وہ مکمل انسان بن جاتے ہیں۔" پرویز علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے یار! ایک بات سننے میں آئی ہے کہ فوجی جتنا اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں' اتنا کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔" خالد بھائی نے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"مجھے اس عمل کا فی الحال کوئی تجربہ نہیں بھائی صاحب۔ لہٰذا کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔ زیور خاموشی سے سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ میس ویٹر نے کمرے کے شمالی کونے میں رکھی گئی میز پر چیزیں سجا دی تھیں۔ اس دعوت کے مہمان اگرچہ تعداد میں تو کم تھے' پھر بھی مبارکباد کے زبردست شور میں پرویز علی شاہ نے اپنی اس سالگرہ کا کیک کاٹا' جس سالگرہ پر قدرت نے زیور کو اس کی زندگی کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا تھا۔

ویٹر نے جب چائے سرو کی تو سعدی نے اس بات کا نوٹس لیتے ہوئے کہ ویٹر نے سفید دستانے پہن رکھے ہیں' وکی کو اس امر کا احساس دلایا۔ "دیکھیں نا چاچو۔ ویٹر نے بھی دستانے پہن رکھے ہیں۔"

"وہ دراصل سویلین میں جراثیم بہت زیادہ ہوتے ہیں نا' اس لئے ان سے بچنے کے لیے فوجی لوگ اکثر ہی دستانے وغیرہ پہن لیتے ہیں' اس لئے تم فکر نہ کرو۔ اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" وکی نے اسے تسلی دی۔

وقت مغرب قریب آ چکا تھا۔ قریب کی مسجد سے مؤذن کی پراسرار پکار گونجی تو اس مسلمان معاشرے میں بسنے والی تمام خواتین کی ایک عام روایت کے مطابق ملکہ بھابی اور پنکی کے ہاتھ

اپنے دوپٹوں کی طرف بڑھے اور انہوں نے وقتی طور پر آنچل سے اپنے سر ڈھاپ لئے جبکہ زیور کے چہرے کے گرد گلابی آنچل کا ہالہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ پرویز علی شاہ نے اس سچویشن کو گویا اپنے دل میں جذب کرلیا۔

"میں...... مغرب کی نماز ادا کرنا چاہتی ہوں۔" زیور نے بظاہر تو ملکہ بھابی سے مخاطب ہوکر کہا تھا' مگر دراصل یہ پیام پرویز علی شاہ کے لیے تھا......!

"فکر کی کوئی بات نہیں! الحمدللہ یہ بھی مسلمان ہیں۔" وکی حسب عادت بول اٹھا۔

"کیوں بھائی صاحب......؟" وہ پرویز علی شاہ سے مخاطب ہوا۔ "جائے نماز تو ہوگی آپ کے پاس!"

"جی ہاں!" اس نے مدبر لہجے میں جواب دیا۔ "اندر سائیڈ روم میں جائے نماز بچھی ہے۔ آپ نماز پڑھ لیں۔" اب کی مرتبہ وہ براہ راست زیور سے مخاطب تھا!

"ہائے! یہ مسلمان قوم۔" وکی نے ایک سرد آہ بھری۔ "فرش پر جائے نماز بچھا کر اور طاق میں قرآن پاک سجا کر دل کو تسلی دے لیتی ہے کہ چلو......! اور کچھ نہیں تو کم از کم جنت کے آخری درجے کے حق دار تو ہوگئے!" زیور اندر سائیڈ روم میں چلی گئی۔

آخری بار سلام پھیرنے کے بعد اس نے دیکھا۔ اس چھوٹے سے کمرے کی دنیا کتنی خوبصورت تھی۔ پرویز علی شاہ کا یونیفارم' چمکتے دمکتے شوز' میز پر پڑی اس کی پی کیپ اور اسٹک اوپر لگے ریک میں سجی ہوئی ملٹری ہسٹری سے متعلق کتابیں اور قرآن مجید کا نسخہ۔ نیچے فرش پر چھوٹے سائز کا قالین اور اس پر بچھی ہوئی جائے نماز۔ اس شام بہت دیر تک دعا کے لیے اٹھے ہوئے زیور کے ہاتھ انجانے اور نامعلوم احساسات کی شدت سے کانپ رہے تھے۔

یہ وہ سنگ میل تھا' جہاں زندگی کو ایک نئے موڑ سے شناسائی ملی تھی۔ اس موڑ سے زندگی کے آخری سرے تک اس شاہراہ پر کیا کچھ تھا۔ تقدیر نے اس بات سے انسان کو ہمیشہ بے خبر رکھا' لیکن......! ان جذبات اور احساسات کے سفر کی شروعات ہوچکی تھی' جسے اس سنگ میل پر دنیا نے بہت نام دیئے! ہاں......! شاید......! یہ ایک عشق کی ابتدا تھی۔ ایک طلب کی تمنا تھی یا پھر ایک محبت کا آغاز کہ ان تمام حالات کے پس منظر میں جلتی...... ہلکی تپش والی آگ۔ کسی شعلے کی طرح بلند نہ سہی' البتہ دیئے کی مدھم لو کی طرح ضرور تھی' پھر...... اس وقت جب وہ نماز مغرب کی ادائیگی کے

بعد کمرے سے باہر آئی۔ پاری ماموں سعدی اور شیری کی فرمائش پر کہانی سنا رہے تھے۔ ملکہ بھابی اور پنکی ٹی وی کے کسی پروگرام میں مگن تھیں اور خالد بھائی وکی کے ہمراہ باہر واک کررہے تھے۔

پرویز علی شاہ کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ گلابی آنچل مسکرایا اور پلکیں جھک گئیں۔

پرویز علی شاہ ساری کہانی بھول گئے۔

"پھر کیا ہوا ماموں؟" شیری نے یاد دلایا۔

"پھر......!" وہ ایک دم چونک گیا۔ "پھر شہزادے اور شہزادی کی شادی ہوگئی اور وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

"لیکن ماموں۔" شیری نے یاد دلایا۔ "کہانی تو بندر اور بندریا کی سنا رہے تھے۔"

"اچھا۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "معاف کرنا یار۔"

اس نے معذرت کی۔ "دراصل میرا حافظہ کچھ کمزور ہوگیا ہے۔"

"کمزور ہوگیا ہے یا پھر جواب دے گیا ہے۔ کیوں ماموں؟" پنکی پوچھ رہی تھی۔

"بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو تم۔" ملکہ بھابی نے فوراً ٹوکا' ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بھی حالات کا کسی قدر جائزہ ضرور لے چکی ہیں۔

"پھوپھو! آج آپ نے کیا دعا مانگی؟" سعدی نے ہر روز کی طرح سوال کیا۔

"سب کے لیے خیروعافیت اور وطن کے لیے امن وسلامتی۔" زیور نے بھی اپنا وہی جواب دہرایا' جو وہ پنکی' سعدی اور شیری کو حب الوطنی کے حوالے سے شہداء کے کارناموں پر مبنی داستانیں سنا کر آخری میں ضرور درس کے طور پر دہراتی تھی۔ وکی اور خالد بھائی اندر آگئے۔

"اب اجازت لیں۔" خالد بھائی ملکہ بھابی سے مخاطب تھے' جبکہ شیری وکی سے مخاطب ہوکر کہہ رہا تھا۔ "آج تو کمال ہی ہوگیا چاچو' پاری ماموں نے کہانی سناتے ہوئے نہ جانے کیا دیکھا کہ بس ساری کہانی ہی بھول گئے!"

وکی نے سوالیہ نظروں سے پرویز علی شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر نہایت مکارانہ قسم کا تبسم تھا۔ اس نے دوسری نظر سامنے بیٹھی ہوئی زیور پر ڈالی اور پھر ذرا مدھم لہجے میں شیری سے مخاطب ہوکر بولا۔

"تجھے آج پتا چلا ہے بچے۔ بھئی' یہ کمال تو کب کا ہو چکا ہے۔" ملکہ بھابی نے زیور کے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے قطروں کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر اپنے بچوں کے پیارے پاری ماموں کی طرف دیکھنے کے بعد ایک معنی خیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔

اس خوشگوار دعوت کے بعد اس شام کے مہمان جب رخصت ہوئے تو ہلکی بوندا باندی کی اس رات میں میزبان کا دل بے حد اداس ہو گیا' حالانکہ وہ اسی شہر کے مکین تھے اور ان سب سے فوری طور پر دوسری ملاقات کوئی مشکل نہ تھی۔ میز پر رکھے گئے تحفوں کے درمیان سرخ رنگ کے چمکیلے ریپر میں لپٹا ہوا ایک تحفہ گویا اپنی ایک الگ پہچان بنا گیا تھا۔ بڑی بے تابی سے اس نے ریپر اتارا۔ ایک خوبصورت قلم بطور تحفہ عنایت فرمایا گیا تھا۔ چمکتے ریپر کے اوپر لگے کارڈ پر صرف "زیور" تحریر تھا۔ اپنے ہی خیالات میں مگن پرویز علی شاہ کی ذات کے گرد چھایا ہوا سحر اس وقت ٹوٹا' جب دروازہ بڑی بے دردی کے ساتھ کھول کر یاروں کا وہ ٹولا اعلیٰ قسم کی مہذب گالیاں انگریزی زبان میں فرماتا ہوا وارد ہوا۔ یہ اس بات کا زبردست احتجاج تھا کہ پرانی دوستیاں نظرانداز کرتے ہوئے آج اجنبیوں کے درمیان سالگرہ کا کیک کیوں ذبح کیا گیا۔ کیپٹن آصف جو کورس میٹ اور جگری یار ہونے کے ناطے سب سے زیادہ بول رہا تھا اور بقول ذاکر جسے تقریباً سہ پہر سے آگ لگی ہوئی تھی' بچی کچی اشیائے خورد ونوش پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد جب ہاتھ دھونے سائیڈ روم سے ملحقہ واش روم میں گیا تو اچانک چونک گیا۔ واش ہینڈ بیسن کے اوپر چمکتی شیشے کی پٹی پر کوئی چیز چمک رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ چمکتے سرخ نگینے والی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ ساتھ ہی سونے جیسی قیمتی دھات کا ایک گول رنگ بھی موجود تھا۔ دونوں چیزیں اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے کیپٹن آصف جب سائیڈ روم میں آیا تو فرش پر بچھی ہوئی اس جائے نماز کے آس پاس اسے ایک مہکتی ہوئی خوشبو کا احساس ہوا۔ جس جائے نماز کا دایاں کونا کسی ہستی نے فرض کی ادائیگی کے بعد تہہ کر دیا تھا۔ پرانے زمانے کی جاسوسی فلموں کے کسی اعلیٰ درجے کے بدیسی اداکار کی طرح پوز بناتے ہوئے کیپٹن آصف کمرے کے دروازے میں آن رکا۔

"برخوردار! پرویز علی شاہ!" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

ذاکر' کرامت' کیپٹن نور اور وہ بذات خود۔ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"عزیزم۔ بات یہ ہے کہ تمہارا اب تک کا ریکارڈ تو بہت اچھا تھا' مگر لگتا ہے کہ اب تم اپنی

نوکری کے پیچھے پڑ گئے ہو۔"

"کیا مصیبت آ گئی بھئی۔" پرویز نے مسکرا کر پوچھا۔

"مصیبت آئی نہیں' لیکن لگتا ہے کہ ابھی یہاں سے رخصت ہوئی ہے اور اپنے پیچھے یہ نشانی چھوڑ گئی ہے۔"

آصف نے مٹھی کھول کر انگوٹھی اور رنگ سب کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ عدالت اب اس مجرم سے یہ سوال کرتی ہے کہ اس خالص مردانہ واش روم میں ان خالص زنانہ انگوٹھیوں کا وجود بھلا کیا معنی رکھتا ہے؟ بولو......! اے۔ آنے والی اکیسویں صدی کے معصوم مجرم۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"او......! کم عقل۔" پرویز علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ایک فیملی پارٹی تھی۔ ہو سکتا ہے' یہ انگوٹھی میری بھابی یہاں بھول گئی ہوں۔"

اس نے روانی میں ملکہ کو آپی کی بجائے بھابی کہہ دیا۔

"سچ سچ بتانا۔" آصف نے مٹھی بند کر کے مکا بنا لیا۔ "یہ انگوٹھیاں تیری بھابی یہاں بھول گئی ہیں یا پھر ہماری بھابی یہاں بھول گئی ہیں؟"

"اب تو زیادتی کر رہا ہے یار۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"ویسے یہ جو تو اب "لونگ گواچا" قسم کی حرکات کر رہا ہے ناں! تو ذرا محتاط رہنا۔ کبھی کبھار ان حرکات کے سبب یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ تیری تصویر کسی تھانے میں اس بورڈ پر لگی نظر آئے' جس پر "بدمعاش بستہ الف" لکھا ہوا نظر آتا ہے۔" آصف نے بڑی روانی سے ڈائیلاگ بولے!

"مجھے تو تمہاری حرکات گزشتہ دس بارہ دن سے تقریباً مشکوک لگ رہی تھیں۔" کرامت نے اپنی رائے دی۔ "جبکہ تو اکثر رات گئے واپسی پر فرماتا تھا۔ دل بہت اداس ہے یارا!"

"ایک تو اپنی بڑھاپے کی سالگرہ چوری چھپے منائی۔" نور نے شکوہ کیا۔ "اوپر سے شیخی بگھار رہا ہے' جیسے کہ...... کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"چل یار۔ ادھر لا انگوٹھیاں۔" پرویز علی شاہ نے تقریباً فریادی لہجے میں کیپٹن آصف سے کہا۔

"یہ تو میں ہرگز نہ دوں گا۔" وہ صاف مکر گیا۔

"دے دے یار۔" کرامت نے ترس کھا کر سفارش کی۔ "تو بھلا ان کا کیا کرے گا۔"

"بالکل وہی۔" وہ بدستور مکا لہرا کر بولا۔ "جو سنڈریلا کی کہانی میں اس کی ہیرے موتیوں سے جڑی ہوئی جوتی کے ساتھ کیا گیا تھا۔"

"کیا! کیا گیا تھا۔"

"یعنی کہ! کیا مطلب ہے تمہارا......!" نور نے پوچھا۔

"یعنی کہ شہر بھر میں منادی کرادی جائے گی کہ دو گم شدہ انگوٹھیاں بیک وقت ایک کنوارے راج دلارے آرمی آفیسر کے کمرے سے برآمد ہوئی ہیں۔ جس لڑکی کی انگلی میں بھی یہ انگوٹھیاں فٹ آ گئیں' اسے اسی وقت دو گواہوں کی موجودگی میں مبلغ بتیس روپے آٹھ آنے سکہ رائج الوقت کے عوض اسی شخص کو سونپ دیا جائے گا۔"

"تجویز تو بہت اچھی ہے بڑے بھائی۔" کرامت نے داد دی!

"مگر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سنڈریلا بے چاری بہت غریب تھی۔ اس کی جوتی میں کوئی ہیرے شیرے جڑے ہوئے نہیں تھے۔"

"بھئی! وہ پرانے زمانے کی سنڈریلا تھی۔ میں تو ماڈرن سنڈریلا کی بات کر رہا ہوں۔"

ڈنر ٹائم ہو چلا تھا' لہٰذا انگوٹھیاں اس شرط پر کرامت کی سفارش کے ساتھ پرویز علی شاہ کے حوالے کردی گئیں کہ اس ویک اینڈ پر وہ انہیں بہرصورت چائنیز لے چلے گا اور اس داستان کا باقی حصہ بھی وہاں ہی بیان کیا جائے گا۔

میجر رانا کے ڈر سے سب نے بروقت پہنچ کر اپنی اپنی نشست سنبھال لی اور بقول نور کے "بندے کے بچے" بن کر بیٹھ گئے۔ میجر رانا اگرچہ شادی شدہ تھے' تاہم وہ "میس سیکرٹری" ہونے کے ناطے اکثر ڈائننگ ہال میں پائے جاتے۔ آصف کو اکثر بے چاری مسز رانا پر بے حد ترس آتا۔ چونکہ اس کا خیال تھا کہ میجر رانا کی اصل بیگم وہ شدید ترین ڈسپلن اور اصول تھے جن کی ترجیحات ان کی تمام زندگی پر حاوی تھیں۔ کرامت کا خیال تھا کہ بلوچ سینٹر میں جس قدر محنت اور جانفشانی سے میجر رانا اپنے جونیئرز کی پرورش کر رہے تھے' دنیا پر لازم تھا کہ اس کے صلے میں ان کا نام بغیر کسی تکلف کے "گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ" میں شامل کردے۔ مگر کیا کریں' بڑی مجبوری تھی۔ دنیا نے ایسے لوگوں کی بھلا کب قدر کی ہے۔

اس شب ڈنر پر جب بقول ذاکر کے میجر رانا تمام لقمے گن چکے اور کم کھانے کی افادیت پر ایک بہترین لیکچر دینے کے بعد شکرانے کے کلمات ادا کرنے کے بعد بڑی مشکل سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو واپس اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے کیپٹن پرویز علی شاہ کو بے تحاشا اداسی کا احساس ہوا۔ آصف کی بند مٹھی سے برآمد کردہ انگوٹھیاں ٹی وی کے اوپر پڑی ہوئی چمک رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں لے کر انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سرخ نگینے کی جگمگاہٹ ایک جذباتی سا سندیسہ دے رہی تھی۔ چینج کرنے کے لیے وہ سائیڈ روم میں داخل ہوا تو واقعی آصف کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ بڑی دلکش مہک پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر بچھی جائے نماز کا تہہ شدہ کونا زندگی میں ایک تبدیلی کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ تو ہر بار نماز کی ادائیگی کے بعد مکمل طور پر جائے نماز تہہ کر دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ تہہ شدہ کونا اس موڑ کا آغاز تھا۔ جہاں سے زیور فضل الٰہی اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔

بس ایک بے خبری کا سا احساس طاری رہا اور اس سنگ میل سے آگے کی طرف جانے والی شاہراہ پر سفر کا آغاز ہو گیا۔ جذبات کی شدت تو دیدنی تھی' تاہم کیپٹن آصف نے ظالم سماج کا کردار ادا کرتے ہوئے دو دن تک سخت پہرہ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کوچہ یار میں ہر روز کا جانا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ سخت ذلالت اور شدید ترین رسوائی کے علاوہ اکثر دھنائی کے واقعات بھی عشق کی طویل ترین تاریخ کا حصہ ہیں۔ لہٰذا احتیاط لازم ہے کہ اس دوران برخوردار پرویز علی شاہ مناسب وقفے سے کام لیں اور اس سنگ صحرائی قسم کے سفر میں ریلے ریس لگانے کی بجائے ایک ایک قدم اٹھا کر چلنے کی کوشش کریں تاکہ ان کی زندگی جو فوج جیسے عظیم الشان ادارے میں آ کے سنور گئی ہے' مزید کچھ عرصے تک سنوری ہی رہے تو بہتر ہے۔

"ویسے بھی یار!" اس نے ہاتھ اٹھا کر اس لیکچر کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔ "اگر مقدر نے شادی کی صورت میں یاوری کر ہی دی تو "جُل خواری" کی منزل بھی کچھ زیادہ دور نہیں۔ بہتر ہے کہ اس پرسکون وقت کا فائدہ اٹھایا جائے اور عمر سے پہلے اپنے بلڈ پریشر کو ہائی لیول پر جانے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

زندگی کی مزید دو شامیں جگری یاروں کی اس بے ہودہ بکواس کی نذر کرنے کے بعد اس تیسری شام جبکہ ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ چپکے سے کھسک گیا۔ دونوں انگوٹھیاں پیک کر کے اس نے بڑی احتیاط

سے جیب میں ڈال لیں۔ اپنی موٹر بائیک کے ہینڈل کو کنٹرول کرتے ہوئے بھی اس کا دایاں ہاتھ بار بار جیب کی طرف بڑھ جاتا۔ خالد بھائی کے گھر کے لان میں زندگی آوازوں کے روپ میں جوان تھی۔ اس کی پہلی نظر زیور پر ہی پڑی۔ وہ شیری اور چنکی کے ساتھ کھیل رہی تھی جبکہ سعدی ان تینوں کی کسی "سخت قسم کی بے ایمانی" کے سبب روٹھ کر سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ سعدی کی نظر اس پر اور کان موٹر بائیک کی آواز پر بیک وقت چونکے اور "پاری ماموں آ گئے" کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ تینوں اس کے گرد ہو گئے!

"دو دن سے کہاں غائب تھے بے ایمان؟" اندر لاؤنج میں آتے ہوئے ملکہ بھابی پوچھ رہی تھیں۔

"سالگرہ کی تھکاوٹ اتار رہے تھے ماموں۔ ہے نا؟" چنکی نے جواب دیا۔

"بس......! ذرا مصروفیت رہی۔" اس کا جواب تھا۔

"لگتا ہے' کپتان صاحب۔ آپ ہمیں ایک زبردست پارٹی دے کر اب قدرے تکلف کرنے لگے ہیں۔" وکی نے اپنے کمرے سے باہر آتے ہوئے بے لاگ تبصرہ کیا۔

"نہیں بھئی۔ ایسی قطعی کوئی بات نہیں۔ میں واقعی مصروف تھا۔" پرویز علی شاہ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"سنو زیبی!" لاؤنج سے ملحقہ کچن سے ایک دل کش نسوانی آواز نے بڑے خوبصورت لہجے میں پکارا۔ "یہ رولز تو کھلتے جا رہے ہیں۔ فرائی ہی نہیں ہو رہے۔"

"تو آپ انہیں لپیٹتی چلی جائیں۔" وکی نے آواز لگائی۔ "یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔"

زیور اندر کچن کی طرف چلی گئی۔

لاؤنج کی مغربی شیشے کی دیوار کے اس پار سورج غروب ہو گیا اور شفق کی لالی نے آسمان پر رنگ بکھیر دیئے۔ ان رنگوں نے ایک نام دل پر نقش کر دیا۔

"زیبی......! زیبی......!"

بڑا دلکش احساس تھا۔ جو اس نام کو سن کر پرویز علی شاہ کی ذات پر چھا گیا۔ تو گویا یہ اس کا گھریلو نام تھا۔ جس سے اس وقت تک تو اس کی شناسائی نہ تھی' لیکن بھلا ایسا کیوں ہوا تھا؟ کہ اس رات اپنی سالگرہ پارٹی کے بعد جب وہ آصف' ذاکر' کرامت اور میجر رانا سے بمشکل تمام جان چھڑا

کر واپس کمرے میں آیا تھا تو سائیڈ روم میں اس کی مخصوص مہک کو محسوس کرتے ہوئے جائے نماز کے تہہ شدہ کونے پر نظر پڑتے ہی یہ نام آخر کیوں کر کہیں دل کی اندرونی سطح پر ایک خیال' ایک خواب بن کر ابھر آیا تھا۔

"آخر......! ایسا کیوں ہوا تھا......؟"

"خواتین......" وکی نے آواز لگائی۔ "اگر بکمال مہربانی آپ نے رولز لپیٹ لئے ہوں تو چائے کے ساتھ پیش کر دیجئے! آج بھی معزز مہمان کچھ جلدی میں ہیں۔"

اور...... یہ سحر ٹوٹ گیا۔

زیور ٹرالی لئے اندر چلی آئی اور اس کے پیچھے ہی اپنے دونوں گیلے ہاتھ جھٹکتی ہوئی نیلوفر بھی اپنے چہرے پر مصنوعی مصروفیت کا خول سجائے ہوئے سامنے آ گئی۔ ملکہ بھابی نے اپنی جھنگ سنبھال کر ایک طرف رکھی اور پھر پرویز علی شاہ سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔

"تم نے اسے پہچانا......؟"

"جی۔ نہیں!" اس نے قدرے توقف سے جواب دیا۔

"اب آپ ہمیں بھلا کس طرح پہچانیں گے کپتان صاحب۔" نیلوفر نے حسب عادل اونچی آواز میں کہا۔ "بڑے آدمی بن گئے ہیں۔"

"بائی دی وے! یہ آپ طنز کر رہی ہیں یا تعریف؟" وکی نے فوراً سوال کیا۔

بڑے مہذب لہجے میں پرویز علی شاہ نے جواباً کہا۔

"ہم فوجی لوگ عام طور پر ایک چھوٹی سطح سے ہی اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ مگر ایک پہچان اور جاننے کا عمل ہماری ساری زندگی پر حاوی رہتا ہے۔"

"اور کبھی کبھار ایک طویل سفر کے بعد مارشل لاء تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔" وکی نے لقمہ دیا۔

"تو گویا آپ نے پہچان لیا؟" نیلوفر نے فوراً پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے بڑے وثوق سے کہا۔ "چند منٹ پہلے آپ اجنبی ضرور تھیں' مگر اب آپ کا انداز بتا رہا ہے کہ آپ زبیدہ خالہ کی صاحبزادی ہیں۔"

"واہ کمال کر دیا آپ نے!" وکی نے فوراً تالی بجا کر داد دی۔

"میں نجومی تو نہیں کپتان صاحب' مگر یہ پیشین گوئی ضرور کر سکتا ہوں کہ اگر پہچان کا یہ عمل اسی

طرح جاری رہا تو ان شاء اللہ ہم اور آپ ہر محاذ پر سرخرو ہوں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" زیور نے آہستگی سے کہا اور پرویز علی شاہ کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔" بڑی ہمت کرتے ہوئے پرویز علی شاہ نے آہستگی سے زیور کو مخاطب کیا۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ ابھی تک جیب پر رکھا ہوا تھا۔ ایک دم وکی کی چالاک نظروں نے سب کچھ نوٹ کیا اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس نے پُراسرار لہجے میں پرویز علی شاہ سے سوال کیا؟

"کیا......؟ آپ کا دل......؟"

پرویز علی شاہ کی مسکراتی ہوئی آنکھیں زیور کے چہرے پر چار کیں اور شفق کی ساری لالی اس شام کے آسمان سے اتر کر زیور کے چہرے پر چھا گئی۔

"آپ کی انگوٹھیاں۔" اس نے لفافہ نکال کر زیور کی طرف بڑھایا۔ "آپ واش روم میں بھول آئی تھیں۔" وہ وضاحت پیش کر رہا تھا۔

"سچ سچ بتایئے گا۔" وکی زیور سے مخاطب ہوا۔ "آپ واقعی بھول آئی تھیں یا پھر بطور نشانی دے آئی تھیں۔"

"وکی۔" ملکہ بھابی نے فوراً ٹوکا۔ وہ اس وقت زیور کی پریشانی بڑی شدت سے نوٹ کر رہی تھیں!

"مت پریشان کرو زیبی کو۔"

"لیجیے جناب!" وہ ہاتھ لہرا کر بولا۔ "اس میں بھلا پریشانی والی کون سی بات ہے۔ کیا آپ نے پنجابی کا وہ مشہور عالم گانا نہیں سنا کہ۔

"چھلا وے جانشانی...... تیری مہربانی۔"

جب بے ساختہ ہنسی نے سب کے چہروں کا احاطہ کر لیا تو موضوع بدلنے کے لیے پرویز علی شاہ نے نیلوفر سے پوچھا۔

"آپ کی کیا مصروفیت ہے آج کل؟"

"میں مری کانونٹ میں پڑھاتی ہوں اور بہت جلدی اسکالرشپ پر مصر جا رہی ہوں۔"

"وہاں کس موضوع پر ریسرچ کریں گی آپ؟" وکی نے فوراً سوال کیا۔

"یہی کہ تم جیسے الٹے دماغ والے کو سیدھا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تو آپ اپنی روانگی فوراً ملتوی کر دیجیے۔" وکی نے مشورہ دیا۔ "کیونکہ اس موضوع پر ریسرچ کرنے والوں کو عام طور پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے۔" پھرا ہوا دماغ۔"

نیلوفر کو جواب نہ سوجھ سکا۔ لہٰذا ایک شرمندگی والی ہنسی کے بعد اس نے اپنے سابقہ اعتماد کو بحال کرتے ہوئے پرویز علی شاہ سے سوال کیا۔ "کپتان صاحب! سنا ہے کہ جب سے شعیب منصور کا ڈرامہ سیریل الفا۔ براوو۔ چارلی ہٹ ہوا ہے، فوجیوں کو دوبارہ رشتے ملنے شروع ہو گئے ہیں۔"

"میرے علم میں تو نہیں۔ ممکن ہے، یہ بات سچ ہو۔" پرویز نے کہا۔

"میرے علم میں تو یہ بات ہے کہ فوجی افسر رشتوں کے معاملے میں ہر دور میں خود کفیل رہے ہیں۔" ملکہ بھابی نے اپنی رائے دی۔

"رشتوں کے اس عظیم الشان موضوع کے پس منظر میں مجھے ایک شعر یاد آیا۔ امید ہے آپ خواتین و حضرات سن کر داد ضرور دیں گے۔" وکی نے اونچی آواز میں کہا۔ "عرض کیا ہے!"۔

ہو سکے تو میرا ایک کام کرو

میری ساس کا کام تمام کرو

"واہ...... واہ۔" کی آواز کے ساتھ قہقہوں کی گونج میں خالد بھائی اندر داخل ہوئے۔ اپنے خوش نصیب گھرانے میں بھی یہ محفل دیکھ کر خوش ہوئے۔ نیلوفر بتا رہی تھی۔ "خالد بھائی۔ میں نے تین دنوں میں پچاس فیصد کوکنگ سیکھ لی ہے۔"

"باقی پچاس فیصد سسرال جا کر سیکھے گی۔" وکی کہہ رہا تھا۔ "مہربانی ہو گی۔ تین دنوں سے ہم لوگ تقریباً لیبارٹری ٹیسٹ کی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔"

"آپ سب نے بہت اچھے تحفے دیئے۔ شکریہ!" پرویز علی شاہ کو یاد آ گیا۔

"اچھا۔" پنکی نے فوراً سوال کیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ ٹیوشن سے فارغ ہو کر آتے ہی اس محفل میں شریک ہوئی تھی۔ "سب سے اچھا تحفہ بھلا کس کا تھا؟"

"قلم کا؟" وکی نے پرویز علی کے کان میں سرگوشی کی۔ "آج کے دور میں یہ ثابت کرنے کی

کوشش کی گئی ہے کہ قلم کی طاقت بہرحال اسلحے سے زیادہ ہے۔"

مسکراتی نظریں بار بار زیور کے سراپا پر جا کر رکتی رہیں اور شام کے سائے ڈھل گئے۔

شیری کی ضد تھی کہ سہ پہر کو ادھورا چھوڑ کر جانے والی ساری بے ایمان ٹیم باہر لان میں چلے اور نامکمل کھیل کو مکمل کیا جائے۔ زیور نے اس کی ضد کے سامنے ہار مان لی تھی' جبکہ لاؤنج سے ان کے باہر جاتے ہی پرویز علی شاہ بھی اجازت لے کر باہر آ گیا۔ نیلوفر برآمدے میں کھڑے پھولوں کی پتیاں توڑ کر بکھیرتی رہیں۔ جاتے سمے وہ فقط ایک سیکنڈ کے لیے زیور کے پاس ٹھہرا اور بہت اثر انگیز جملہ ہوا کے دوش پر لہراتا ہوا دل میں اتر گیا۔

"آپ...... دوپٹہ اوڑھے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔"

پھول کی آخری پتی کو مسل کر نیلوفر نے اپنے قدموں میں پھینک دیا۔ بہت سارے دن ایک کر کے گزرتے چلے گئے!

خالد بھائی نے جب بھی ملکہ بھابی سے ہسپتال روانگی کے بارے میں پوچھا' ہر بار وہ اپنی روایتی بے پروائی سے جواب دیتیں۔ "فکر نہ کریں' ابھی بہت دن ہیں۔" اور ان بہت سارے دنوں کے پیش نظر جب خالد بھائی نے پشاور وزٹ کا پروگرام بنالیا تو عزیزم وقار احمد عرف وکی بھی چپکے سے ساتھ ہو لیا کہ آگے چترال جانے کے چانسز بھی واضح اور روشن تھے اور وہ اس خوبصورت خطے کا حسین علاقہ گرم چشمہ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ قافلہ رخصت ہوا تو گھر بھر میں ایک ہلکی اداسی کے سماں کو خواتین اور بچوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور ایک بہت خوشگوار شام کے گزر جانے کے بعد بے نام سی اداسی چھا گئی مگر...... اداسی کے ان لمحات میں ایک بے نام سا احساس بھی شامل ہو چلا تھا۔ اَن دیکھا' اَن جانا احساس۔ کسی نام کے بغیر' کسی پہچان کے بغیر۔ لمحے لمحے اور پل پل پرواز کرتا ہوا زندگی میں اتر آیا تھا۔ کس قدر عجیب رنگ تھا' اس احساس کا۔ جب زیور نے پرویز علی شاہ کے ہاتھ سے اپنی انگوٹھیاں تھامیں۔ انہیں دوبارہ انگشت شہادت کی زینت بنایا۔ تب ان کی چمک' ان کا رنگ کس قدر تیزی سے زندگی میں گھل مل گیا تھا اور پھر اس آواز کا سحر کیسا دلنشین احساس بن کر چھایا تھا۔ جب اعتراف کا پہلا لمحہ ایک جملے کی صورت میں سامنے آیا تھا۔

"آپ...... دوپٹہ اوڑھے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں۔"

اسی رات جب نیند نینوں کے بند دریچوں سے کوسوں دور تھی۔ لیٹ نائٹ چینل پر آخری

پروگرام دیکھنے کے بعد نیلوفر نے اپنی بے تابی کے پیش نظر اس کے جاگنے کے عمل کو دیکھتے ہوئے بے خوفی سے کہہ دیا۔

"مائی ڈیئر زیور فضل الٰہی۔ لگتا ہے کہ یہ کپتان صاحب' تم سے بے لاگ قسم کا عشق فرمانے لگے ہیں۔"

خدا جانے کیوں اور کس طرح خوف کی ایک لہر نے اس کی ساری ذات کا احاطہ کر لیا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے احساسات سے عاری رہا' لیکن ایک ادھورا نامکمل سا سوال اس کی زبان پر آ گیا۔

"یہ...... تم نے...... کس طرح جانا......؟"

"کیا تمہیں نہیں معلوم؟" اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔ "تم کس دنیا میں رہتی ہو ڈارلنگ!" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "بھئی صاف ظاہر ہے۔ موصوف کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس دال میں کچھ کچھ نہیں بلکہ سب کچھ کالا ہے۔"

اس اعتراف کو وہ رد تو نہ کر سکی۔ تاہم اقرار کی ہمت بھی نہ تھی۔ زیور نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کرتے ہوئے بات ٹالنی چاہی تو نیلوفر نے بڑے انوکھے انداز میں کہا۔

"اگر یہ سچ ہے ناں۔" تو اسے اپنی خوش قسمتی جاننا اور روایتی فرسودہ قسم کی محبوباؤں کی طرح نخرے دکھانے کے بجائے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں تامل نہ کرنا' کیونکہ تم جانتی ہو کہ یہی سچ ہے۔"

عرش کی بلندیوں سے وہ پل تو اسی لمحے زندگی میں شامل ہو گیا تھا' جب تقدیر نے بالکل سامنے بارش کی برستی پھوار میں اسے لا کھڑا کیا تھا' مگر اجنبیت کے لہجے میں پوچھے اس سوال کا جواب کیا تھا۔ "آپ...... کون ہیں؟"

تب کہیں بہت دور احساسات کی زبان نے پکارا تھا۔ "ہم اجنبی ہی سہی' اے حسین خاتون! لیکن شاید ہم ہی وہ ہیں کہ سب رشتوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی زندگی جس کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوتی' جو زندگی کے کسی بھی پل اکثر اجنبی روپ لئے ہوئے آتا ہے اور پھر سب ہی کچھ بن جاتا ہے۔ سب رشتوں سے معتبر کہلاتا ہے۔ جب عشق کی تکمیل ہو جائے تو پھر قدرت اسے وہ درجہ عطا فرماتی ہے جہاں عورت کے لیے خداوند کریم کی ذات کے بعد سجدہ جائز کر دیا جاتا ہے۔ یہ آگہی کے فیصلے ہیں۔ روشن سجدوں کی دلیل ہے۔ قدرت کا ایک مستند عمل اور بہترین فیصلہ ہے جسے

تبدیل نہیں کیا جا سکتا! لہٰذا آپ کے اس سوال کا جواب کہ "آپ کون ہیں؟" ہم نہیں بلکہ آنے والا وقت ہے۔

آپ صرف انتظار کیجئے۔ وقت خود آپ کو جواب دے گا۔ رات بیت چکی تھی۔ صبح کا روشن تارا بھی دم بھر کے لیے افقی سرے پر ٹھہر گیا تھا' لیکن آنکھیں جاگ رہی تھیں اور سارے جہان کی بے قراری ان جاگتی آنکھوں میں سما چکی تھی۔

مسکراتے ہوئے لبوں اور قدرے طنزیہ نگاہوں کے ہلکے وار کرتے ہوئے صبح سویرے نیلوفر رخصت ہوگئی اور اپنے پیچھے آگ کے ایک ہلکے شعلے کا احساس چھوڑ گئی۔ ایک ایسا احساس جو بہت جلدی الاؤ بن گیا۔

اگرچہ ساون رُت کا اختتام تھا۔ پھر بھی ایبٹ آباد کا آسمان حسب روایت گھرے بادلوں کی زد میں آنے کے بعد برس پڑا۔ سہ پہر سے بونداباندی جاری تھی اور حسب عادت خالد بھائی کے فون کے جواب میں ملکہ بھابی "ابھی بہت دن ہیں۔" والا مخصوص جملہ دہرانے کے بعد اب سرشام کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھیں۔ سعدی کی فرمائش پر فرنچ ٹوسٹ بناتے ہوئے اس نے دیکھا۔ وہ مضطرب تھیں' صوفے پر پانچویں مرتبہ پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے زیور سے کہا۔ "ایک گلاس گرم دودھ میں مجھے پسے ہوئے بادام ڈال کر دے دو۔ اگر سردی کا درد ہوا تو آرام آ جائے گا ورنہ......"
انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ......!" وہ حیرت سے بولی۔ "ورنہ کیا ملکہ بھابی؟"

"ورنہ ہسپتال جانا پڑے گا۔" وہ بولیں اور زیور گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"ملکہ بھابی! گھر میں کوئی مرد موجود نہیں اور ہم لوگ......!"

ملکہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم فکر نہ کرو' میں پاری کو فون کرتی ہوں' وہ آ جائے گا۔ رات یہیں رک جائے گا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر فرخندہ سے بات کرلوں گی۔ تم پریشان مت ہونا۔"

زیور کا رکا ہوا سانس گویا پھر سے بحال ہوگیا۔ ذرا تسلی پا کر اس نے فوراً سوال کیا۔

"آج سہ پہر آپ خالد بھائی کو بتا رہی تھیں کہ ابھی ٹائم ہے تو پھر......؟"

ملکہ بھابی مسکرائیں۔ "اس وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ میرے حساب سے تو ابھی کم از کم بیس

دن باقی ہیں۔"

ملکہ بھابی نے اپنی فہم و فراست کی بنا پر تمام حفاظتی اقدامات گویا کہ قبل از وقت ہی کرلئے۔

پنکی نے پاری ماموں کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ گیمز کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ انہیں "رنگ بیک" کرنے کا پیام تاکید کے ساتھ پہنچانے کا کہہ کر گھر کے پچھواڑے کوارٹر میں مقیم ماچس فیکٹری کے چوکیدار کی بیگم کو طلب کرلیا گیا۔ یہ خاتون جو کہ عرف عام میں "سیانی" کہلاتی تھیں' مقصد یہ تھا کہ رات کو ہسپتال جانے کی صورت میں اس خاتون کو بچوں کے پاس چھوڑا جائے' لیکن انہوں نے تشریف فرما ہوتے ہی حالات کا "بہ نظر دایہ" جائزہ لیتے ہی اپنے تمام تر سابقہ تجربات پر مبنی مشورے بلا فیس عنایت فرمانے شروع کردیئے۔

اس ناگہانی صورت حال نے ملکہ بھابی کی بے چینی میں مزید اضافہ کردیا۔ زیور بھی خاموش بیٹھی اسی سوچ میں تھی کہ کس طرح سے اس چلتی ہوئی ٹیپ کو بند کیا جائے' اچانک فون کی گھنٹی بجی اور "سیانی بیگم" کی گفتگو کا رابطہ منقطع ہوگیا۔

ملکہ بھابی اٹھ نہ سکیں۔ وہ بادام ملے دودھ کے ہلکے ہلکے گھونٹ بھر رہی تھیں اور ویسے بھی ان کی بائیں پنڈلی' نیچے فرش پر دھرنا دے کر بیٹھی ہوئی "سیانی بیگم" کے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ دبانے کے ساتھ ساتھ وہ خاتون گائنی سے متعلق بعض امور پر ایسے ایسے انکشافات فرما رہی تھیں کہ کئی بار تو ملکہ بھابی کو مارے دہشت کے اپنا سانس تک بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ زیور نے ملکہ بھابی کا اشارہ پا کر فون اٹھایا۔

"ہیلو!" زیور نے آہستہ آواز میں کہا۔ دوسری طرف اگرچہ خاموشی تھی' مگر دل دھڑک رہا تھا۔

"زیبی!" دوسری سمت سے قدرے توقف کے ساتھ پرویز علی شاہ نے کہا اور کئی ایک جلترنگ ایک ساتھ بج اٹھے۔

اس نے زندگی میں یہ نام پہلی پہلی مرتبہ پکارا تھا' لیکن یوں محسوس ہوا' گویا اس لہجے سے برسوں کی شناسائی تھی۔

"آپ آیئے ناں!" قدرے فریادی لہجے میں عاجزی کے ساتھ کہا گیا۔ "ملکہ بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" زیور کے دل کی دھڑکن منتشر ہوگئی۔

"آپ......خود تو خیریت سے ہیں ناں؟" پرویز علی شاہ نے اس انتہائی اہم پیام کا قطعی کوئی نوٹس نہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میری بات کراؤ" ملکہ بھابی کی آواز پر زیور کی توجہ بٹ گئی۔ کوئی جواب نہ پا کر پرویز علی شاہ کہہ رہا تھا۔

"آپ ہمیں طلب کریں اور ہم نہ آئیں یہ بھلا کس طرح ممکن ہے؟"

"آپ ملکہ بھابی سے بات کریں۔" ٹیلیفون کی لمبی تار کو پاؤں سے سلجھاتی ہوئی وہ ریسیور اور کریڈل تھام کر ملکہ بھابی کے قریب آئی اور ریسیور انہیں تھما دیا۔ اپنے پیارے' راج دلارے بھائی کی آواز سنتے ہی ملکہ بھابی کے دیدوں کی چمک بڑھ گئی۔ انہوں نے اپنے تمام تر حساب کتاب کی غلطی کو شوہر نامدار کی بے پروائی کے بین الاقوامی کھاتے میں ڈالا۔ خود کو ایک مظلوم بیوی کا درجہ دیتے ہوئے درمیان میں وقار احمد عرف وکی کو بھی رگڑ دیا کہ اتنی ڈرائیونگ تو وہ بہرحال جانتا ہی تھا کہ کسی بھی مریض یا مریضہ کو ایمرجنسی کی صورت میں ہسپتال تک پہنچا سکتا۔ اپنے عظیم تر دیور اور تابعدار قسم کے شوہر نامدار کو یہ خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد انہوں نے اپنے "ماں جائے" کو فوراً "موقع واردات" پر پہنچنے کی تاکید کرتے ہوئے وضاحت فرمائی کہ وہ رات یہاں ہی قیام فرمائے گا اور اگر ممکن ہو تو دو دن کی چھٹی ضرور لے لے' کیونکہ واقعی وقت کا کچھ پتا اور اعتبار نہیں ہوتا کہ وہ کیا رنگ دکھائے گا۔

اپنے برخوردار کیپٹن پرویز علی شاہ کی خدمت میں یہ شاندار سپاسنامہ پیش کرنے کے بعد ملکہ بھابی مطمئن ہو گئیں۔ دودھ کا گلاس باداموں کی توانائی کے ساتھ نوش فرمانے کے بعد انہوں نے جب ڈاکٹر فرخندہ کو فون کیا تو وہ اپنے کلینک میں مریضوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے خاص ڈاکٹری لہجے میں کہا۔ "سات بجے تک آ جائیے' دیکھ لیتے ہیں۔" یہ جواب سن کر ملکہ بھابی نے نومولود کی آمد کے پیش نظر تیار کردہ ملبوسات اور ضروری اشیاء پر مبنی فہرست پر ایک نظر ڈالی اور اس خاص موقع کے لیے وہ بیگ تیار کیا گیا جو اس قسم کے ہر خوش نصیب موقع پر "زچہ" کے ہمراہ جاتا ہے۔ پنکی تو خیر سمجھ دار تھی۔ لیکن ناگہانی طور پر تیار شدہ اس بیگ کو دیکھ کر سعدی اور شیری نے ممبران قومی اسمبلی کی طرح اس اعلیٰ سطح کے فورم پر کئی ایک سوالات کی بھرمار کر دی۔ بے شک یہ ڈش کا دور ہے اور اب وہ زمانہ نہیں رہا' جبکہ نئے مہمان کی آمد کی اطلاع فرشتوں کے ذمے لگا کر

بچوں کو مطمئن کر دیا جاتا تھا۔ آج کے اس ملٹی کاسٹ میڈیا کے دور میں بچے وقت سے پہلے سب کچھ جان جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں مطمئن کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے' جتنا کہ قومی اسمبلی کے جناب سپیکر کے لیے معزز ممبران کو یہ باور کرانا کہ "فکر نہ کریں' آپ کو بھی اظہار خیال کے لیے مناسب وقت دیا جائے گا۔"

جب برستی بارش کی بوچھاڑ میں یہ سیشن ختم ہوا تو پرویز علی شاہ کی آمد ہوئی۔ اس دور کے وضع دار مگر "لکھ پتی" کی اولاد کیپٹن آصف ازراہِ مہربانی انہیں اپنی گاڑی میں نہ صرف یہ کہ چھوڑنے آئے تھے بلکہ اس "ہنگامی صورتحال" کے پیش نظر وہ اپنے علاوہ گاڑی کی خدمات بھی پیش کرنے کی فراخ دلانہ پیش کش کر چکے تھے۔ اس پیشکش کو بصد شکریہ واپس فرمانے کے بعد جب پرویز علی شاہ اندر تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ فوج میں چونکہ کم از کم پلاننگ کے تحت پانچ سال آگے کی سوچ رکھی جاتی ہے اس لئے وہ اپنے بیٹ مین یعنی کہ اردلی کو بھی ساتھ لائے تھے تاکہ کسی بھی انتہائی ضرورت کے وقت موصوف کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جا سکے۔

جب یہ تمام مرحلے طے ہو چکے تو ڈاکٹر فرخندہ کے پاس جانے کے لیے روانگی عمل میں آئی۔ باہر پورچ میں مسکراتے ہوئے پرویز علی شاہ کو دیکھ کر پنکی نے شرارت سے کہا۔ "بہت زیادہ خوش نہ ہوں ماموں' آپ کو تو آج ماما نے "بطور ڈرائیور" طلب فرمایا ہے۔"

"اپنی بہن کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔" پرویز علی شاہ نے زیور کے سامنے جب یہ کہا تو ملکہ بھابی کا مان بڑھ گیا۔ اپنے بھائی کی طرف سے تفاخر کا یہ احساس پا کر ملکہ بھابی بہنوں والی روایتی آن بان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئیں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر زیور بھی ہمراہ تھی۔ مسکراتے ہوئے جب اس قافلے کو پنکی نے خدا حافظ کہا تو گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی پنکی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لئے کہ بہرطور وہ بڑی سمجھدار بچی تھی۔ "سیانی بیگم" نے انہیں بارش اور بوچھاڑ سے بچنے کی تاکید کرتے ہوئے زبردستی اندر کی جانب دھکیلا۔ پنکی نے سعدی اور شیری کو کارٹون فلم لگا کر بٹھا دیا' کیونکہ اکثر اوقات جب کارٹون فلم لگی ہوتی تھی تو پھر بقول وکی کے۔ "راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔" اس وقت بھی راوی چین ہی لکھ رہا تھا۔ سعدی اور شیری کے ساتھ سیانی بیگم بھی کارٹون کی انوکھی دنیا میں گم تھیں اور بغیر کسی سمجھ بوجھ کے بلاوجہ مسکراتی جا رہی تھیں۔ پرویز علی شاہ کا اردلی اپنی اس وقت کی ڈیوٹی کے پیش نظر باہر موجود تھا۔ پنکی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی کہ تقریباً

آدھے گھنٹے کے بعد اس قافلے کی واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر فرخندہ نے چیک اپ کے بعد کہا تھا۔ ''فی الحال تو آپ لیبر میں نہیں ہیں۔ پھر بھی احتیاط کیجئے گا۔ جوں ہی ضرورت محسوس کریں، فوراً آجائیں۔''

ملکہ بھابی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو پنکی نے ساری صورت حال جان کر کہا۔ ''ماما! آپ نے تو ملک بھر میں تقریباً ایمرجنسی ڈکلیئر کروا دی تھی۔ دیکھئے ناں۔ پاری ماموں کو بھی کس طرح الرٹ کر دیا...... اور وہ ان کا بیٹ مین، کیا ڈسپلن ہے بھئی۔ کئی مرتبہ کہا کہ جا کر سائیڈ روم میں بیٹھ جاؤ۔ مگر کیا مجال ہے کہ مانا ہو۔ کہہ رہا ہے، بس میں ٹھیک ہوں باجی۔ آپ فکر نہ کریں۔ پاری ماموں! میں نے سوچا ہے کہ میں ڈاکٹر بن کر فوج جوائن کروں گی اور پھر آرام سے اپنی زندگی گزاروں گی۔''

''بس کرو یہ تقریر۔'' ملکہ بھابی مسکرائیں۔ ''جاؤ، ماموں کے لیے چائے بنا کر لے آؤ۔''

''اب چائے کی ضرورت نہیں۔'' پرویز علی شاہ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

''زیبی!'' ملکہ بھابی نے زیور سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آٹھ بجے تک کھانا لگا دینا، میری بہن! بچے جلدی سو جائیں تو بہتر ہے۔''

گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے زیور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

''بہت اچھی لڑکی ہے۔'' ملکہ بھابی نے پرویز علی شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''نہایت خدمت گار اور بااخلاق۔ ایسی لڑکیاں بھلا اس زمانے میں کہاں نظر آتی ہیں۔''

پرویز علی شاہ بڑی خاموشی سے کسی سوچ میں گم تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ملکہ بھابی نے بھائی سے پوچھا۔

''آپی!'' پرویز علی شاہ کا لہجہ نہایت جذباتی تھا۔ ''زیبی! واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' ملکہ بھابی نے شرارتی مسکراتی نظروں سے بھائی کے جذبات کو بھانپتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''بالکل آپی!'' پرویز علی شاہ نے مدھم آواز میں کہا۔ ''زیور پر پہلی نظر پڑتے ہی میرے دل کا فیصلہ میرے سامنے آ گیا تھا۔''

''چلو، یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔'' ملکہ بھابی نے اطمینان کا سانس لیا۔

''میں ٹھیک ہو جاؤں پھر ہم آزاد کشمیر چلیں گے۔ تم تو شاید جانتے ہو ان کے باباجی گدی نشین ہیں۔ جدی پشتی دربار پر لاکھوں کا نذرانہ اور چڑھاوا ملتا ہے۔ مگر انداز نہایت درویشانہ ہے۔''

ملکہ بھابی نے بھائی کے احساسات کو جان کر فوراً خالص زنانہ انداز میں ان کے ہونے والے ''متوقع سسرال'' کے ''سرپرست اعلیٰ'' کی بلاوجہ تعریفیں شروع کر دیں۔ اس سے پہلے کہ یہ سلسلہ شجرہ نسب سے شروع ہو کر آنے والی نسلوں کی تعریفوں تک منتقل ہو جاتا، باہر گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور بیگ کے ساتھ پرس سنبھالے ہوئے نیلوفر بغیر کسی اطلاع کے وارد ہو گئی۔

''ہیلو۔ ایوری باڈی!'' اس نے بہ آواز بلند سب کو مخاطب کیا۔ ''امید ہے، آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ ہم بچوں کے ٹرپ کے ساتھ بطور خاص ''الیاسی مسجد'' اور پی ایم اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) وزٹ کے لیے تشریف لائے تھے۔ سارے قافلے کو ادھر ریسٹ ہاؤس میں شفٹ کر کے ہم ادھر آ گئے۔ اب کیا کرتے، آپ سب کی یاد ستا رہی تھی۔ سوچا کہ آپ کے شہر میں آ ہی گئے ہیں تو دیدار ہی فرماتے جائیں۔''

''بہت بہت شکریہ!'' اندرونی گیسٹ روم سے باہر آتے ہوئے پرویز علی شاہ نے کہا۔ ''کیا حال ہے، نیلو بادشاہ!''

''ارے، کپتان صاحب!'' وہ تقریباً چلا کر بولی۔ ''واٹ اے سرپرائز۔ آج تو آپ نے ہمیں اس نام سے پکارا...... جس نام سے بچپن میں پکارا کرتے تھے۔''

''جی ہاں!'' پرویز علی شاہ نے کہا۔ ''وقت نے میری یادداشت پر شاید کچھ زیادہ ہی گہرا اثر ڈالا ہے۔ مجھے دفعتاً یاد آ گیا کہ آپ تو ہماری اس پیاری خالہ زبیدہ کی صاحب زادی ہیں جو ''انسپکٹرس آف سکولز'' ہوا کرتی تھیں۔ ہم نے بچپن کے علاوہ لڑکپن میں بھی ان سے بہت مار کھائی ہے۔''

''بالکل!'' ملکہ بھابی نے بھی تائید کی۔ ''مجھے یاد ہے، بچپن میں ایک مرتبہ جب تم گاؤں میں پیپل کے درخت پر سے گر پڑے تھے تو زبیدہ خالہ نے تمہیں اٹھا کر بجائے تمہاری چوٹوں کو سہلانے کے، اوپر سے چار چھ دھموکے مزید لگا دیئے تھے تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔''

''اماں کی طبیعت ابھی تک ویسی ہی ہے۔'' نیلو نے بتایا۔ ''اور مزاج بھی آمرانہ ہے،

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی نہیں بدلیں۔"

"کراچی جیسے روشنیوں کے شہر میں مستقل قیام کا فیصلہ ان کا اپنا تھا۔" ملکہ بھابی نے یاد دلایا۔ "لیکن خالو جان کی وفات کے بعد اتنی زیادہ دلبرداشتہ ہوئیں کہ احباب کے علاوہ عزیز واقارب سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔"

"اماں نے بس اسی خود ساختہ قید تنہائی میں وقت گزار دیا۔"

نیلوفر کے لہجے میں اداسی نمایاں تھی۔ "اچھا...... میں زینی اور پنکی کو دیکھتی ہوں۔" وہ شاید جان بوجھ کر کچن میں چلی گئی۔

"نیلوفر بھی اچھی لڑکی ہے۔" ملکہ بھابی نے شاید چوائس کرنے کے اس نادر موقع کو غنیمت جانتے ہوئے پرویز علی شاہ کی طرف دیکھا' جبکہ اس غیر متوقع سوال کے پیش نظر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور بغیر کسی تامل کے اس نے فوراً کہا۔

"آپی۔ میں آپ کو اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔"

ملکہ بھابی خاموش ہوگئیں۔

"ورکنگ گرلز کی اپنی لائف ہوتی ہے آپی!" پرویز علی شاہ نے بہن کو خاموش پاکر دلیل سے قائل کرنا چاہا۔ "ان کی حد سے زیادہ خود اعتمادی صرف ان کی اپنی زندگی کے لیے پُراثر ثابت ہوتی ہے۔ جبکہ شوہر بے چارہ اس خود اعتمادی کا شکار ہوکر بلاوجہ ساری زندگی پریشان رہتا ہے۔"

"تمہارا فیصلہ میرے لئے معتبر اور باعث خوشی ہے!" ملکہ بھابی نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔"

"بھئی لڑکیو' کھانا لگاؤ۔" ملکہ بھابی نے اپنے اندر دوبارہ پیدا شدہ بے چینی کے عمل کو دوبارہ نوٹ کرتے ہوئے آواز لگائی۔

کچن میں کام کرتی ہوئی زیور کے کان میں جھک کر نیلوفر نے سرگوشی کی۔ "اور سنا ڈارلنگ۔ تیرے عشق کی انتہا کس درجے تک پہنچی؟"

پنکی نے صاف سن لیا اور رشین سلاد بناتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ معنی خیز نظروں سے اس نے جب نیلوفر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔ "تم اپنا کام کرو بچی۔ تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔"

"خیر۔ اب وہ اتنی زیادہ بھی بچی نہیں جتنی کہ آپ سمجھتی ہیں۔"

"اچھا!" نیلوفر نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "تو کیا اب یہ سمجھ لیا جائے کہ خیر سے ریشماں جوان ہوگئی؟"

"بالکل!" پنکی نے تائید کی۔ "فکر نہ کریں' حالات کو صحیح رخ پر سمجھنے کی حد تک آپ کی یہ ریشماں بالکل جوان نہ سہی مگر سمجھدار ضرور ہوگئی ہے۔"

ملکہ بھابی کی بار بار پکار نے کھانا جلدی لگانے پر مجبور کردیا۔

"آپ نے کیا بنایا ہے نیلو بادشاہ؟" پرویز علی شاہ نے پوچھا۔

"میں نے آج صرف اپنی پرنسپل کو بیوقوف بنایا ہے۔" اس نے جواباً کہا۔ "ڈاج دے کر نکل آئی ہوں۔"

"آپ پر ایکشن بھی آسکتا ہے؟" پرویز علی شاہ نے خالص نوکری پیشہ افراد کے نقطہ نظر سے کہا۔

"میرا کیا کریں گی بھلا!" وہ بے پروائی سے بولی۔ "اگلے ماہ ویسے بھی میری مصر روانگی ہے۔"

کھانے کے بعد لاؤنج میں واپس آکر بیٹھتے ہی شیری نے فوراً فرمائش کردی۔ "پاری ماموں' پلیز! کہانی سنایئے ناں۔"

"کون سی کہانی سناؤں؟" پرویز علی شاہ نے پوچھا۔

"وہی کہانی سنا دیجئے ناں ماموں!" پنکی نے مسکرا کر شرارتی لہجے میں کہا۔ "جس میں بندر اور بندریا جنگل میں بڑے آرام سے رہتے ہیں مگر آخر میں شہزادے اور شہزادی کی شادی ہوجاتی ہے اور وہ بھی ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔"

ملکہ بھابی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی' جبکہ نیلوفر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سعدی سے اس کی کلاس ٹیچر کے سخت مزاج ہونے پر اپنی تعریف کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کررہی تھی کہ اس کی کلاس کے تمام بچے تو اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

نوعمر پنکی کے اس گہرے جملے نے پرویز علی شاہ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے احساسات سمجھنے والوں پر عیاں ہوچکے تھے۔ اس نے زیور کی طرف دیکھا۔ جس کے

چہرے پر ایک عجب سا رنگ بکھر گیا تھا۔ کچھ دیر اس نے سوچا' مسکراتی ہوئی پنکی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر ملکہ بھابی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرا خیال ہے' میں کچھ دیر آرام کرلوں۔ جب جس وقت ضرورت محسوس کریں' طلب کرلیں' بندہ حاضر ہو جائے گا۔"

وہ اٹھ کر گیسٹ روم کی طرف چلا گیا۔

"آپ سب لوگ بھی آرام کریں۔" ملکہ بھابی نے اعلان فرمایا۔ "نیلو! تم تو آج سارا دن سفر میں بچوں کے ساتھ سر کھپاتے ہوئے تھک گئی ہو گی۔"

"اور کیا آپی!" وہ بیزاری سے بولی۔ "پرائی اولادوں کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں۔"

"بچوں کے کمرے میں تمہارے لئے بھی بیڈ لگوا دیا ہے۔" ملکہ بھابی نے بتایا۔

"چلو اچھا ہوا۔" وہ مسکرائی۔ "گیسٹ روم پر تو واقعی آج فوج کا قبضہ ہے۔ اب رات کو بھی مجھے کلاس لینی پڑے گی۔ چلو آؤ بچو! میں آج تمہیں ایک پری کی کہانی سناؤں گی۔" اس نے زیور کی طرف دیکھ کر جملہ پھینکا۔ "جسے ایک دیو سے عشق ہو جاتا ہے۔"

"اور دماغ خراب کروا ان کا۔" ملکہ بھابی بڑبڑائیں۔

"پہلے ہی کیا کم ہیں۔"

پل بھر میں گہرا سکوت چھا گیا۔ سیانی بیگم دوبارہ اپنی خدمات پیش کرنے آئیں تو ملکہ بھابی نے بصد شکریہ انہیں لوٹا دیا اور زیور کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئیں۔

"میں بہت گہری نیند کبھی بھی نہیں سو سکتی ملکہ بھابی!" زیور نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی کوئی پرابلم ہو تو فوراً جگا دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر ملکہ بھابی نے کروٹ بدل لی۔

شام کے بعد سے بارش مکمل طور پر رکنے کے عمل تک آسمان کچھ ہی دیر کے لیے تاروں کی جگمگاہٹ اپنے دامن میں سمیٹ پایا تھا' اس کے بعد جب گہرا اندھیرا چھا گیا تو بارش کی رم جھم دوبارہ شروع ہو گئی۔ گہرا سناٹا تھا اور فقط ابر کرم کی برستی دل کش مدھر اور مترنم موسیقی۔ مگر یہ شب عام سی نہ تھی۔ زیور کے ذہن میں ایک مسلسل ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بلاوجہ ایک بے قراری کا عمل زندگی کے اندر تک در آیا تھا۔ جاگتے ہوئے ہر بار کروٹ بدلنے کے ساتھ بس ایک ہی چہرہ بند آنکھوں

کے سامنے چلا آتا۔ گہری سیاہ آنکھیں۔ مسکراتے ہوئے چہرے کا ایک دلکش سا زاویہ۔ سانولہ پرکشش رنگت والا چہرہ اور وہ ایک عام سا نام "پرویز علی شاہ" جو کہ خدا جانے کیوں اب بہت اپنا' بہت قریب لگنے لگا تھا۔

بے قراری کے کسی پل جب زیور کی آنکھ لگ گئی تو شب کے پہلے پہر اچانک ملکہ بھابی نے اسے ہلکے ہاتھ کے دباؤ سے جگا دیا۔ اس عمل سے بری طرح چونک کر اس نے جب ٹیبل لیمپ آن کیا تو ملکہ بھابی کا لال سرخ چہرہ سامنے تھا۔

"خیریت تو ہے بھابی!" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہمیں ہسپتال جانا پڑے گا۔" وہ سرگوشی میں بولیں۔ "تم پرویز کو جگاؤ۔ سنو' بے آواز قدموں سے جانا۔ بچوں کو پتا نہ چلے۔ باہر سے لاک لگا کر ہم تینوں نکل جائیں گے۔"

"جی...... بہت اچھا!" زیور کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

لرزتے ہوئے قدموں سے وہ گیسٹ روم کی طرف بڑھی۔ دروازے پر اپنی انگشت شہادت کو دہرا کرتے ہوئے جب دستک دینا چاہی تو وہ کھلا ہوا ملا۔ زیور کا پہلا قدم ہی لرزش کی زد میں تھا۔ دوسرا قدم تو اس دہلیز کو عبور ہی نہ کر سکا۔ اس نے دروازے کا پٹ تھام لیا' اندر ہلکی سبز روشنی کا بلب لیمپ شیڈ کے اندر روشن تھا۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی اپنے رخسار کے نیچے رکھے ہوئے پرویز علی شاہ محو خواب تھا۔ ان لمحوں نے بہت خوبصورت احساسات کے ساتھ ایک افسانوی سا منظر زیور کی نگاہوں کے سامنے بکھیر دیا' چند سیکنڈ گزر گئے۔ آواز دینے کی ہمت نہ ہو سکی۔ آگے بڑھ کر شانے کو چھو لینے کا عمل تو بہت ہی مشکل تھا۔ زیور یہ سوچ کر آگے بڑھی کہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ سے آواز کا ارتعاش پیدا کر کے بیدار کیا جائے۔ ان لمحات میں اس کے لیے یہ بڑا ہی مشکل امتحان تھا۔

* * *

وہ فقط ایک قدم آگے بڑھی ہی تھی کہ اچانک پرویز علی شاہ کی آواز نے دوسرا قدم اٹھانے کی اجازت ہی نہ دی۔

"جی......! فرمائیے' کیا بات ہے؟"

"آپ...... جاگ رہے ہیں؟" اچانک یہ سوال زیور کے لبوں تک آ گیا۔

"جی ہاں۔" اس نے وثوق سے کہا۔ "ٹھیک اسی پل سے جس پل آپ نے دروازے پر دستک دینا چاہی اور پھر کھلا دروازہ پا کر اندر آ گئیں؟"

"تو...... آپ اتنی دیر سے......" زیور نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں آپ کو دیکھ رہا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔ "مگر خدا جانے کیوں؟ اس خواہش میں رہا کہ آپ مجھے پکاریں۔ مجھے بیدار کریں۔ آواز دیں اور میری زندگی دوبارہ شعور کی دنیا میں آ کر ایک بیداری کے عالم میں اس آواز پر لبیک کہے......!" برستی بارش کی اس شب اگرچہ پرویز علی شاہ کے احساسات کو زبان عطا کرنے کا موقع قدرت نے فراہم کر دیا تھا۔ لیکن وقت نازک تھا۔ زیور نے کچھ کہنا چاہا۔ "وہ دراصل میں اس لئے آئی تھی کہ......!" شاید وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر پرویز نے بات کاٹ دی۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہیں ہسپتال لے جانا ہے۔ آپ چلیں۔ میں چینج کر کے آتا ہوں۔"

جب وہ بے قدموں زیور باہر نکلی تو ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ بالکل سامنے ڈائننگ روم میں روشنی تھی اور ڈائننگ چیئر کی پشت کو تھام کر کھڑی نیلوفر پانی پی رہی تھی۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ گلاس میز پر رکھ کر نیلوفر نے بھنویں چڑھائیں اور لبوں پر طنزیہ

مسکراہٹ سجا کر بولی۔

"خیریت ہے؟ حضور نے تمہیں اس وقت بھلا کیوں طلب کیا تھا؟"

یہ جملہ گویا کہ آگ کا شعلہ تھا۔ شدید ترین بے عزتی کے احساس سے زیور کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز کی رقت نمایاں ہو گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ملکہ بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہیں ہسپتال لے جانا ہے۔ میں اسی لئے......"

"زیبی۔" ملکہ بھابی دروازے تک چلی آئیں۔ "ڈاکٹر فرخندہ کو فون پر مطلع کر دو۔"

"جی اچھا۔" وہ آنسو پونچھ کر فون کی طرف بڑھ گئی۔

"چلیے آپی۔" پرویز علی شاہ بھی لاؤنج میں آ گیا۔ "گاڑی کی چابی مجھے دے دیں۔"

اس ساری سچویشن کو جان کر نیلوفر شرمندگی کے مارے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آگے بڑھ کر اس نے ملکہ بھابی کے شانوں پر پڑی چادر درست کی اور ان کا بازو تھام کر سہارا دیتے ہوئے گاڑی تک لے آئی۔ پرویز علی شاہ گیٹ کھول کر واپس آئے۔ جب ملکہ بھابی اور زیور پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکیں تو اس نے اپنے تیز و طرار لہجے سے قطع نظر بالکل آہستہ آواز میں کہا۔ "آپ لوگ چلے جائیں' میں گیٹ بند کر لوں گی۔"

نہایت مہربان اور بے حد ذمے دار ڈاکٹر فرخندہ اس وقت ان کی منتظر تھیں۔ جبکہ ملکہ بھابی کو ان کے محفوظ ہاتھوں میں سونپنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ نومولود کی آمد کے پیش نظر تیار شدہ بیگ تو اس افراتفری میں وہیں لاؤنج میں پڑا رہ گیا ہے۔ اب واپسی ناگزیر تھی۔ جب اس انتہائی اہم فالٹ کا اظہار کیا گیا تو پرویز علی شاہ نے کہا۔

"میں ابھی جا کر لے آتا ہوں۔"

"میں بھی چلتی ہوں۔" زیور نے کہا۔ بہت تیزی سے وہ پرویز علی شاہ کے ساتھ چلتی ہوئی پارکنگ ایریا تک آ گئی۔ جب اس نے گاڑی کے پچھلے دروازے کو کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پرویز نے فوراً کہا۔ "آپ آگے بیٹھیے نا۔"

اگرچہ اس سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم دل دھڑکنے کے عمل میں بے حد تیزی تھی۔ برستی بارش کی اس شب جب وہ پرویز علی شاہ سے صرف ایک بالشت کے فاصلے پر موجود تھی' بڑے عجب رنگ احساسات زندگی میں اجالا کر چکے تھے۔ ڈیش بورڈ پر اپنا دایاں رکھ کر ذرا ترچھے انداز میں اسے بیٹھا

ہوا دیکھ کر پرویز علی شاہ نے کہا۔

"آپ آرام سے بیٹھیں' میرا خیال ہے کہ آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہیں' کیونکہ اپنے دوستوں کی رائے کے مطابق میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"یہ بات نہیں۔" زیور کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ "میں تو ملکہ بھابی کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"اللہ مالک ہے۔" پرویز علی شاہ نے اعتماد سے کہا۔ وہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں باہر کی طرف دیکھتی رہی' جہاں تارکول کی سڑک پر گرتی بارش کی بوندیں اس روشنی میں عجیب خوبصورت سماں پیش کررہی تھیں۔

"آپ یہیں پر گاڑی روک لیجیے۔" گیٹ کے قریب آتے ہی زیور نے کہا۔ "میں بیگ لے آتی ہوں۔"

"نہیں۔" پرویز علی شاہ نے جواب دیا۔ "آپ بھیگ جائیں گی۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"آپ بھی تو بھیگ جائیں گے۔" زیور کی آواز آئی۔

"ہماری خیر ہے......" اس نے پلٹ کر زیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لئے اول ترجیح تو یہ ہے کہ آپ کو زمانے کے نشیب و فراز اور موسموں کے حوادث اور اثرات سے بچایا جائے۔"

زیور خاموش رہی۔ پرویز علی شاہ گاڑی اندر پورچ میں لے آئے۔ بڑی تیزی سے برآمدہ عبور کرکے وہ دروازے تک چلی آئی۔ لاؤنج میں ہلکی روشنی تھی' کیونکہ ان کی روانگی کے بعد سے نیلوفر جاگ رہی تھی۔

دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گیٹ کی آواز اور زیور کے بڑھتے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"اینی نیوز؟" اس نے اپنی شرمندگی کے سابقہ تاثر کو مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"فی الحال تو کوئی نیوز نہیں۔" زیور نے بتایا۔ "ہم لوگ یہ بیگ یہاں ہی بھول گئے تھے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر بیگ اٹھایا اور واپسی کے لیے پلٹی۔ دوسری طرف "ہم لوگ" نیلوفر کے دل کے اندر تک اتر گیا۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر گیٹ بند کرتے ہوئے پرویز علی شاہ نے دیکھا۔ کھلے دروازے کا پٹ تھامے ہوئے نیلوفر انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

وہ جملے جو تھوڑی دیر پہلے پرویز علی شاہ نے کہے تھے ایک سرشاری کی سی کیفیت کا عالم بن کر چھا چکے تھے۔ بڑا ہی انوکھا احساس تھا۔ اب خاموشی تھی۔ فقط سفر تھا اور اس شب کا سناٹا بھی جس شب چاند بڑی گہری بدلیوں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔

ہسپتال کے پارکنگ ایریا میں گاڑی لاک کرنے کے بعد پرویز علی شاہ نے زیور کے ہاتھ سے بیگ تھام لیا۔ بارش کا ہلکا سا سلسلہ جاری تھا۔ وہ چند قدم آگے چل رہی تھی۔

برآمدے کی پہلی سیڑھی پر پہلا قدم ترچھا پڑا' مگر دوسرا قدم ساتھ نہ دے سکا۔ بارش کی بوچھاڑ کے سبب چپس کی سیڑھی گیلی تھی۔ پہلے لمحے میں پھسل جانے کا احساس طاری ہوا اور دوسرے لمحے سہارے کی طلب کے متلاشی بازو اِدھر اُدھر جھولنے کے بعد پیچھے آتے ہوئے پرویز علی شاہ کے شانوں کی زینت بن گئے۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا اور شاید آخری مرتبہ بھی۔ تقدیر کسی کو یوں ہی بلاوجہ قریب نہیں لاتی۔ لیکن کبھی کبھار ایک بالشت کے فاصلے کے بعد بھی صدیوں کی دوریاں حائل ہوجاتی ہیں اور کئی صدیوں کے فاصلے سمٹ کر فقط ایک بالشت کی دوری پر رہ جاتے ہیں۔

سنبھل جانے کا عمل ذرا دیر سے رونما ہوا کہ ہوا کے سنگ بہت ہی جذباتی لہجے میں پرویز علی شاہ کی آواز آئی۔

"ذرا سنبھل کر چلیں۔ آپ ہمیں بہت عزیز ہیں۔"

"اور آپ بھی......!" زیور کی جھکی ہوئی نگاہیں صاف کہہ رہی تھیں۔ اس اولین اعتراف کا وہ لمحہ بلاشبہ معتبر تھا کہ یہ گہری خاموشی ہی واضح طور پر اس کا مظاہرہ کررہی تھی۔ ہسپتال کے نہایت افسردہ ماحول میں دونوں کے دلوں کے اندر خوشی کی ایک جوت جگی اور بلوچ سینٹر کے میس میں گزری شام کے بعد اس شب کی خاموشی ان خوبصورت جذبات کے اظہار کی ایک معتبر گواہی بن گئی۔

ویٹنگ روم میں وہ دونوں بالکل آمنے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔ زیور کی جھکی ہوئی نگاہیں فقط

ایک بار اٹھیں۔ پرویز علی شاہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں جھک گئیں اور دھڑکتے دل کی پکار نے مکمل طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرلیا کہ پھسلتے ہوئے قدم سے وجود کے مکمل طور پر سنبھل جانے کے عمل کے طور پر زندگی بدل چکی تھی۔

تقریباً صبح کے آثار نمایاں تھے، جب کہ نومولود کی پہلی چیخ نے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ نرس اطلاع دینے چلی آئی۔ دونوں نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔ "مبارک ہو۔" زیور بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی۔

"شکریہ۔" پرویز علی شاہ کی آواز آئی۔ "یہ بچہ باعث سعادت ہے، جس کی آمد ہمیں اتنا قریب لے آئی۔" اس قدر واضح طور پر اظہار کے بعد زیور نے دیکھا، اس تمام رُت جگے کے بعد بھی وہ قطعی طور پر خوش، مطمئن اور چاق وچوبند دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں ہی سارے احساسات کا مرکز تھیں۔ جو اس انوکھے دل کش احساس سے چمک رہی تھیں کہ شاید نہیں، بلکہ یقینی طور پر زندگی کے نئے سنگ میل سے سفر کی شروعات ہو چکی تھی۔ آج تک زندگی کے سفر میں وہ کچھ نہ تھا۔ کہیں بھی نہ تھا۔ لیکن آج وہ اجنبی نہ تھا۔ وقت اسے سامنے لے آیا تھا۔ مگر تقدیر کیا کہہ رہی تھی۔ یہ فیصلہ ابھی دور...... بہت دور تھا، مگر ملکہ بھابی کو بخیر وخوبی کمرے میں "سیٹل ڈاؤن" کرنے کے بعد یہ طے ہوا کہ رات بھر جاگے ہوئے دونوں مسافر گھر جا کر سیانی بیگم کو لے آئیں تاکہ "زچہ اور بچہ" کی مناسب تیمارداری کے لیے اس کی بہترین خدمات سے استفادہ کیا جا سکے۔ بچہ تو فی الحال نرسری میں تھا۔ ملکہ بھابی ہلکی غنودگی کے عالم میں تھیں جبکہ گھر میں بچوں کو بیداری کے بعد حالات سے مطلع کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سپیدہ سحر کے آثار نمودار ہوئے تو اس پروگرام پر عمل ہو چکا تھا۔ گھر میں آتے ہی چنکی نے بتایا۔ "نیلو خالہ تو صبح سویرے ہی چلی گئیں۔" سعدی اور شیری ننھے روی کی پیدائش کی خبر پا کر مسرور تھے اور یہی نام تجویز کر چکے تھے اور اب خوش وخرم سکول جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ پرویز علی شاہ عرف پاری ماموں نے انہیں شام کو ہسپتال لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ چنکی نے آج چھٹی کرلی تھی، تیسرے بھائی کی آمد پر۔ یکا یک اپنے "بڑے پن" کا احساس ہونے پر وہ ہر کام میں زیور کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

اس صبح کے وہ سارے لمحات بڑے خوشگوار تھے۔ زیور نے ناشتہ ٹیبل پر لگا دیا۔ چنکی نے گیسٹ روم میں جا کر پاری ماموں کو مطلع کیا۔ نہایت سلیقے سے سجا ہوا ناشتہ دیکھ کر پرویز علی شاہ کہہ رہے تھے۔

"آپ بہت تھک چکی ہیں۔ رات بھر جاگنے کے بعد اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" زیور نے اپنے روایتی عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "میں خدمت کرنے کی عادی ہوں۔"

پرویز علی شاہ مسکرائے، کیونکہ چنکی کہہ رہی تھی۔

"زیبی خالہ۔ اگر آپ نے ماموں کو بھی اس خدمت کا عادی بنا دیا ناں تو پھر واقعی بڑی مشکل ہو جائے گی۔" مسکراتی ہوئی نگاہیں جھک گئیں۔

چنکی نے ناشتہ کرتے ہوئے بتایا۔ "پاری ماموں، رات تو نیلو خالہ نے مجھ سے کرید کرید کر آپ کے بارے میں پوچھا۔ "کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ مزاج کیسا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔" زیور اور پرویز علی شاہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ ایک ہی جیسی مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر آن رکی۔

خالد بھائی کے بڑھاپے کی اس اولاد کی آمد کے سلسلے میں بچوں نے ماں کے کمرے کو سجایا۔ چونکہ ڈاکٹر فرخندہ نے گھر جانے کی اجازت عنایت فرما دی تھی۔ چنانچہ ایک ہنگامہ خیز شام گھر کے در و دیوار کے اندر اتر آئی۔ خالد بھائی ہمراہ وقار احمد عرف وکی جب "سمال انڈسٹریز" کے خیر سگالی دورے کے بعد تشریف لائے تو تمام مراحل طے پا چکے تھے۔ بقول وکی کے "جناب حضرت روی کی آمد کے صدقے تمام تر تکان رفو چکر ہو گئی تھی۔" اپنی شرمندگی کے احساس کو چھپانے کے لیے انہوں نے ملکہ بھابی کے سر پہ الزام بلا تکلف تھوپ دیا کہ "تمہارا ہی سارا حساب کتاب غلط تھا۔ ورنہ میری کیا مجال کہ اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر نکالوں۔"

"ہاں...... ! سارا قصور میرا ہی ہے۔" ملکہ بھابی نے ایسے موقع پر بیویوں والے روایتی نخرے سے کہا۔ "آپ تو بری الذمہ ہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" خالد بھائی کہہ رہے تھے۔ "تمہارے اپنے اتنے پیارے لوگوں نے تمہیں سنبھال لیا۔"

"جی ہاں۔" وکی نے فوراً چہک کر کہا۔ "بھائی صاحب، آپ کم از کم ایک ہزار نفل شکرانے کے ادا کرنے کے بعد اپنے ان پیاروں کا شکریہ ادا کریں اور خدا کے واسطے اب آپ "وزارت بہبود آبادی" والوں کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ہم سب پر رحم کیجئے گا۔ ورنہ ڈر یہی ہے کہ ہر مرتبہ

آپ کے یہ پیارے اس طرح کی خدمات سرانجام نہیں دے سکیں گے۔" بڑے بھائی کے لاڈ پیار نے وکی کو ایسی ہمت بخش دی تھی کہ اس نے بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کر کے ماحول کو قہقہے بخش دیئے۔

مکمل طور پر زندگی سے بھرپور اس خوشگوار گھرانے میں اس وقت بڑی خوبصورت فضا چھائی ہوئی تھی۔ پشاور اور چترال سے لائے ہوئے خوبصورت تحائف افرادِ خانہ کی نذر کیے جا چکے تھے۔ خالد بھائی زیور کے لیے نہایت قیمتی شال کا تحفہ لائے تھے اور پاری ماموں کے لیے چترالی ٹوپی جسے دیکھ کر پنکی نے شرارت سے کہا۔ "پاری ماموں، جب آپ خوب بوڑھے ہو کر گنجے ہو جائیں گے ناں تو یہ ٹوپی پہن کر اپنے پوتوں کو بتایئے گا۔" پیارے بچو۔ ونس اپون اے ٹائم۔ لانگ لانگ اے گو۔ یہ ٹوپی مجھے میرے "برادر ان لا" نے گفٹ کی تھی۔"

"اگر بچوں نے یہ پوچھ لیا ناں۔" وکی نے لقمہ دیا کہ "برادر ان لا" کیا بلا ہوتی ہے۔ تو اس زمانے میں یہ بتایا جائے گا کہ پیارے بچو قانون کے بھائی کو "برادر ان لا" کہتے ہیں۔"

"آپ لوگوں نے تو بدتمیزی کی حد کر دی۔" ملکہ بھابی نے فوراً ٹوکا۔

"اور آپ نے......؟" وکی نے نومولود روبی کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔

"تجھے تو میں ٹھیک کروں گی۔" ملکہ بھابی نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"بھلا کب تک؟" اس نے سوال کیا۔ "ویسے مناسب یہی ہے کہ آپ صرف اپنے شوہر نامدار کو ٹھیک کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ میری ڈیوٹی ختم ہوئی۔" پرویز علی شاہ نے کہا۔ "اجازت چاہوں گا۔"

"صبح چلے جانا۔" ملکہ بھابی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"کل شام کو آنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے کہا۔

"ویسے بھی ہم لوگ ایکسر سائز پر بڑا سی جا رہے ہیں۔"

"ہمیں بھی وہاں بلایئے گا۔" وکی نے فوراً کہا۔ "ہم لوگ بھی دیکھیں گے کہ فوجی حضرات جنگل میں منگل کس طرح مناتے ہیں۔ ارے ہاں۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جنگل میں منگل منانے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ آپ بھی سنیے۔ ایک اناڑی رئیس اپنے ملازموں کے ہمراہ شکار کے لیے کسی جنگل میں گیا۔ جہاں فوجی جوان بھی اپنی تربیتی مشقوں کے سلسلے میں مقیم تھے۔

بڑی تگ و دو اور تلاش بسیار کے بعد اچانک رئیس کو جھاڑی کے پیچھے ایک جانور نظر آیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً بندوق اٹھا کر گولی چلا دی۔ جانور نے قلابازی کھائی اور اچھل کر گر پڑا۔ رئیس نے ملازم سے کہا۔

"نورے، جا کر دیکھو تو ہم نے بھلا کون سا جانور شکار کیا ہے۔" نورے نے حکم کی تعمیل کی، مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ ہانپتا کانپتا ہوا واپس آیا اور اس نے کہا۔

"جناب، وہ اپنا نام میجر دین محمد بتاتا ہے۔"

اس زبردست لطیفے پر ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

"آپ سب لوگ ضرور آیئے گا۔" پرویز علی شاہ نے کہا۔

"پاری ماموں۔" پنکی نے سرگوشی کی۔ "سب لوگوں سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

ایک پیار بھری چپت بھانجی کے سر پر لگا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زیور کمرے کے اندر آ رہی تھی۔

"ملکہ بھابی۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ "میری انگوٹھیاں نہیں مل رہیں۔ خدا جانے کہاں رکھ کر بھول گئی ہوں۔"

"ہر طرف تلاش کر لیا کیا؟" ملکہ بھابی نے تفتیش کے انداز میں کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے بتایا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں صرف تین منٹ میں یہ انگوٹھیاں برآمد کروا سکتا ہوں۔" وکی نے کہا۔

"تم کب سے تھانیدار بن گئے۔" خالد بھائی مسکرائے۔

"کوئی مشکل کام نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اس گھرانے کی تقریباً ہر گمشدہ چیز سیانی بیگم کے کوارٹر سے برآمد ہو جاتی ہے۔ شرط لگا لیں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے زیور کی طرف دیکھا۔

"خواہ مخواہ الزام نہ لگاؤ۔" ملکہ بھابی نے سیانی بیگم کی حالیہ خدمات کے پیشِ نظر اس کی وکالت کی۔

"لیجیے عدالت عالیہ نے فیصلہ سنا دیا۔" وکی نے خاص وکیلوں والے انداز میں کہا۔ "اچھا یہ بتایئے" اس نے اپنا رخ زیور کی طرف کیا۔ "محترمہ آخر کیا وجہ ہے کہ آخر ہر مرتبہ آپ اپنی انگوٹھیاں ہی ہر جگہ کیوں بھول جاتی ہیں؟"

اس نے "ہر جگہ" کو تقریباً چبا کر کہا۔ پرویز علی شاہ سمیت سب نے اس کے خاص قسم کے لہجے اور مخصوص مسکراہٹ کے زاویے کو نوٹ کیا۔

"تم نے بہت مغز چاٹ لیا۔" ملکہ بھابی نے دیور کو پیار بھری ڈانٹ پلائی۔ "اب جاؤ آرام کرو۔ طویل سفر سے تم تھک نہیں گئے؟"

"گویا کہ مہذب انداز میں اس بیان کا مطلب یہ بنتا ہے کہ عزیزم وقار احمد عرف وکی اب تم خاموشی سے دفع ہو جاؤ تاکہ میں اپنے شوہر نامدار سے تمہاری برائیاں کر سکوں۔" اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اوکے سر۔" وہ پرویز علی شاہ سے مخاطب ہوا۔ "پھر ملیں گے۔ اگر خدا لایا۔"

پرویز علی شاہ بھی اجازت لے کر جا رہے تھے۔ خالد بھائی نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور انہیں بس تک چھوڑنے چلے گئے۔

اس گہری رات کے کسی پل زیور کی آنکھ کھل گئی۔ خالی انگشت شہادت بے چین کر رہی تھی۔ بابا جان کی ودیعت کردہ سرخ نگینے والی انگوٹھی اور رنگ اب کی بار جو زندگی سے جدا ہوئے تو باوجود تلاش کے نہ مل سکے۔ انگشت شہادت کو ان کے وجود کی عادت ہو چکی تھی۔ لہٰذا اب یہ جدائی اسے گراں گزر رہی تھی۔ کئی پل اس بے چینی کی نذر ہو گئے اور پھر پرویز علی شاہ کا خیال ان لمحات میں سامنے آ گیا۔

بارش کا سماں، ہسپتال کی مدھم روشنی والے برآمدے کی سیڑھی پر پھسل جانے والا پہلا قدم اور پھر سنبھل جانے تک زندگی کا مختصر مگر طویل ترین سفر۔

زندگی......! واقعی اپنا رخ بدل چکی تھی۔

دوسری سہ پہر پرویز علی شاہ فون پر پنکی سے پوچھ رہے تھے۔ "آپ کی زیبی خالہ کی انگوٹھیاں مل گئیں کیا؟"

"نہیں ماموں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔ "وہ بے چاری بہت پریشان ہیں۔ ان کے بابا جان کی نشانی تھی۔" پنکی نے صورت حال سے مطلع کیا۔

"اچھا۔" پرویز علی شاہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ماموں!" پنکی کہہ رہی تھی۔ "ایسا کریں، آپ ہی کوئی اچھی سی انگوٹھی پہنا دیں ناں انہیں۔ قسم سے بڑی پیاری ہیں زیبی خالہ ہم سب کا بہت خیال رکھتی ہیں۔"

"سوچیں گے۔" پرویز علی شاہ نے مسکرا کر فون بند کر دیا۔

شام گہری ہو گئی۔ رات کے لمحات بہت قریب آ گئے۔ ان انجانے لمحات نے احساس دلایا کہ ایک انتظار کی سی کیفیت زندگی میں آ گئی تھی۔ ہر آہٹ پر چونک جانے کا احساس یہ جتا رہا تھا کہ بات خواہ چھوٹی ہی سہی۔ مگر بہت گہری تھی۔ سات بجے ملکہ بھابی نے ڈاکٹر فرخندہ کے ہاں چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ وہ حسب عادت مختلف ہدایات جاری کرتی ہوئی روی کو اس کی دسترس میں سونپ کر خالد بھائی اور پنکی کے ہمراہ روانہ ہو گئیں۔ پنکی کو واپسی پر اپنی کتابیں لینی تھیں ملکہ بھابی کے کمرے میں ننھے روی کے پیارے سے وجود کو دیکھتے ہوئے زیور سوچ رہی تھی! واقعی یہ سچ ہے کہ خدا ابھی انسانوں سے مایوس نہیں ہوا' قریب بیٹھی ہوئی سیانی بیگم نے "بچے کی بہترین پرورش" کے لازوال موضوع پر لیکچر دینا شروع کیا ہی تھا کہ سعدی نے اندر آ کر بتایا کہ "زیبی خالہ پاری ماموں آئے ہیں۔"

دل ایک دم دھڑک اٹھا۔ سعدی کہہ رہا تھا۔ "وکی چاچو کہہ رہے ہیں' آ کر چائے بنا دیں۔"

سیانی بیگم کو روی کی نگرانی پر مامور کرتے ہوئے اس نے اپنا آنچل درست کیا اور لاؤنج میں آ گئی۔

پرویز علی شاہ بظاہر تو اخبار پر نظریں جمائے بیٹھے تھے' مگر نظریں ملکہ بھابی کے کمرے کی دہلیز پر جمی تھیں۔ زیور سامنے آئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ تشریف رکھیے۔" اس نے کہا۔ "ملکہ بھابی تو چیک اپ کے لیے گئی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" قدرے لاپروائی کے سے انداز میں جواب ملا۔ "شاید آپ کو اعتبار اور یقین ہی نہیں کہ ہم نے تو اب اپنی زندگی کی ہر شام آپ کے نام کر دی۔"

"شکریہ۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

وقت کچھ مہربان تھا۔ سعدی اور شیری اپنے کمرے میں ہوم ورک کر رہے تھے۔ وکی ٹینس کھیل کر آیا تھا اور پرویز علی شاہ سے کہہ کر...... چینج کرنے چلا گیا تھا۔ اندر ملکہ بھابی کے کمرے میں سیانی بیگم ننھے روی کو انوکھی زبان میں کچھ بتانے کی کوشش میں عجیب وغریب آوازیں نکال رہی تھیں۔ اگرچہ یہ آوازیں خاصی پریشان کن تھیں۔ تاہم باقی کائنات خاموش تھی۔

"آپ کی انگوٹھیاں مل گئیں؟" سوال کیا گیا۔

"نہیں۔ اب کی بار واقعی گم ہوگئیں۔" جواب دیا گیا۔

پرویز علی شاہ نے کچھ سوچ کر جیب سے سرخ مخملی ڈبیہ نکالی۔ زیور حیرت سے دیکھتی رہی۔

شام کا گہرا دھندلکا شیشے کی چوڑی کھڑکیوں کے باہر اتر آیا اور اندر دل کے آس پاس روشنیوں کا ایک شہر اتر آیا۔

بالکل ویسی ہی سرخ نگینے والی سونے کے رنگ کے ساتھ جڑی ہوئی انگوٹھی مخملی ڈبیا کے وجود میں پیوست مسکرا رہی تھی۔ پرویز علی شاہ کے سفید چوڑے ہاتھ کی ہتھیلی پر دھری ڈبیا کا رخ زیور کی طرف تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ "اگرچہ یہ جسارت کی انتہا ہی سہی' لیکن قبول کرلیجئے۔ نہ جانے کیوں اپنے دل کی بات مان کر دماغ کے سارے فیصلوں کو رد کرنے کے بعد میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ میں اس جسارت میں حق بجانب ہوں۔ میں اپنی ذات اور اپنے دل کے اس فیصلے کے درمیان آپ کے علاوہ کسی تیسرے فرد کو نہیں لانا چاہتا۔ اگر آپ نے شرف قبولیت بخش دیا تو میں اور میرا دل ہی نہیں بلکہ میری زندگی بھی آپ کی ممنون ہوگی۔"

بڑی حیرتوں کے پہاڑ زیور کی ذات پر ٹوٹ پڑے۔ عام زندگی میں بظاہر ایک سخت جان اور کھردرے قسم کے پیشے سے منسلک ایک شخص زندگی کے جذباتی لمحات میں احساس سے بھرپور اس قدر خوبصورت جذباتی رویے کا اظہار بھی کرسکتا ہے؟ توپ و تفنگ جن کا مقدر ہو۔ ان کا دل اس قدر رومان پرور بھی ہوسکتا ہے؟ نگاہیں آج تک بلکہ اب تک جو کچھ کہتی رہیں' اس شام کے دھندلکے نے انہیں زبان عطا کرکے دل کے شہر میں بسا دیا۔ چوتھی کا چاند اپنے باریک وجود کے ساتھ مسکرایا اور زیور نے ہاتھ بڑھا کر مخملی ڈبیا سمیٹ لی۔ اس سے ان احساسات کی تکمیل ہوگئی جن کا ذکر دیومالائی کہانیوں کا کلائمکس بنتا ہے۔

بہت دیر ہوچکی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالنے اور اپنے احساسات کو دنیا سے چھپانے کے لیے اسے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ شریر وکی کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

"زیبی آپا کپتان صاحب پوچھ رہے ہیں کہ آج آپ کے ہاں چائے بن رہی ہے یا پھر پائے پک رہے ہیں؟"

وہ چائے لے کر لاؤنج میں آگئی۔

"چائے بنا دیجئے۔" وکی نے اپنے مخصوص انداز میں گویا کہ نادر شاہی حکم صادر فرمایا۔ زیور کا

ہاتھ ٹرے کی طرف بڑھا اور پرویز علی شاہ کی نظروں نے دیکھا' دونوں انگوٹھیاں انگشت میں پڑی جگمگا رہی تھیں۔

دل کے ساتھ آنکھیں اور لب بھی مسکرانے لگے۔

ذرا سی خاموشی کا توقف ٹوٹا۔ سعدی پوچھ رہا تھا۔ "وکی چاچو۔ پلیز' یہ سوال تو لکھوایئے۔

"آئین اور منشور میں کیا فرق ہے؟"

"تم لکھ لو ناں کہ منشور ہمارے مالی کا نام ہے۔" وکی نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"پلیز چاچو۔" وہ مچل گیا۔ "ٹھیک سے بتایئے ناں؟"

"اچھا چلو۔ پہلے رف کاپی پر لکھو۔" وکی نے سنجیدگی سے کہا۔ "پھر فیئر کرلینا۔"

"ٹھیک ہے۔ سعدی کاپی اور قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"لکھو۔" وکی نے کہا۔ "آئین کسی بھی ملک کے لیے ریڑھ کی ایسی ہڈی کا کام دیتا ہے' جس پر تمام تر بنیادی نظام کے ڈھانچے کا انحصار ہوتا ہے۔ جس کے تحت قانون کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے باشعور عوام اسے ایک مقدس درجہ دیتے ہوئے وطن عزیز کا نظام چلاتے ہیں' اس طرح ایک پرامن خطے کا قیام عمل میں آتا ہے۔"

سعدی نے بڑی تیزی سے لکھا۔ "اور منشور؟" اس نے سوالیہ نظروں سے وکی کی طرف دیکھا۔ وکی نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولنے لگا۔

"منشور کسی بھی سیاسی پارٹی کا وہ منشور نامہ ہے جسے ایک سبز باغ کے طور پر عوام کو دکھا کر ووٹ حاصل کیے جاتے ہیں اور بعد از کامیابی اسے سردخانے میں ڈال کر اپنی من مانی کی جاتی ہے......!"

"ہاں۔ اب آخر میں لکھو۔" وکی نے بات جاری رکھی۔ "ویسے موجودہ دور کی کسی بھی سیاسی پارٹی کے منشور سے ہمارا مالی میاں منشور علی بہت اچھا ہے' کیونکہ وہ سبز باغ نہیں دکھاتا۔ بلکہ ہمارے لان کو واقعی سرسبز بناتا ہے۔"

پرویز علی شاہ...... جو کہ یہ سب سنجیدگی سے دیکھ اور سن رہے تھے' مسکرا کر بولے۔ "کیوں بچے کا ذہن خراب کررہے ہو۔"

"کمال ہے بھائی صاحب۔" وکی مسکرایا۔ "یہاں تو کئی لوگوں نے بڑوں کا دماغ خراب

کردیا۔ مگر کوئی شکوہ نہ کیا گیا۔ پھر پتا نہیں۔ مجھ غریب پر ہی کیوں الزام آجاتا ہے۔" وہ زیور کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں کہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ شہرِ دل اب خاموش نہیں رہا۔ احساسات کی پکار نے احساس دلایا تھا کہ کہیں کچھ ضرور تھا۔ گویا کہ عوام سے اب کچھ بھی مخفی نہ رہا۔ وکی کی دبی دبی ہنسی اور خاص قسم کے لہجے نے ماحول کو ایک خاموش خوشگواری بخش دی تھی۔

فون کی گھنٹی نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ وکی فون سننے چلا گیا۔ زیور روی کو دیکھ کر کمرے سے باہر آئی تو پرویز علی شاہ نے کہا "شکریہ چائے بہت اچھی تھی۔"

"اور انگوٹھیاں بھی۔" زیور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ کو کس طرح یاد رہا کہ میری کھو جانے والی انگوٹھیاں اسی ڈیزائن کی تھیں؟"

اس سوال پر پرویز علی شاہ نے اس کی طرف دیکھا۔ آج تک کی ساری ملاقاتوں میں بات صرف چند جملوں سے آگے تک نہ بڑھی تھی' لیکن اب چند سوالات نے بھی زندگی میں جگہ پالی تھی۔ یہ محض ایک دوسرے کو جاننے کا عمل ہی نہ تھا بلکہ لگتا ہے کہ سمجھنے کی منزل بھی قریب آ گئی تھی۔

"زیور بیگم۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "وہ لوگ جنہیں چاہا جاتا ہے ناں؟ ان کا ہر انداز' ہر بات دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ کبھی کہیں کچھ نہیں بھولتا۔ بچھڑنے کے بعد بھی' صدیوں تک یادیں تازہ رہتی ہیں......! شاید یہ قانونِ قدرت ہے اور فطرت کا تقاضا بھی' کیونکہ انسان بذاتِ خود تو بے بس ہے ناں!"

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے انگشتِ شہادت میں پڑی ہوئی انگوٹھیوں کی طرف دیکھتی رہی۔

وکی فون سن کر واپس آیا اور اس نے تقریر کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تیار ہو جائیے خواتین و حضرات۔ بادام شادام کھا کر اپنا دماغ تیز کر لیجئے کہ نیلو بادشاہ تشریف لا رہی ہیں۔ اپنا آخری دیدار کروانے کیلئے۔ ان کا فون ویگن سٹینڈ سے آیا ہے کہ انہیں آ کر پک کر لیا جائے۔ چونکہ وہ مصر روانگی کے سلسلے میں چار دن کے بعد کراچی جا رہی ہیں۔ لہٰذا آخری ملاقات کے طور پر وہ سب سے ملنا چاہتی ہیں کہ بقول ان کے زندگی کا واقعی کچھ پتا نہیں کہ کب کہاں اور کس جگہ کوئی مصری باشندہ انہیں پسند آ جائے اور وہ عالمِ اسلام پر احسانِ عظیم فرماتے ہوئے اسے پیاری ہو جائیں۔"

"کیا......اعلان ختم ہوا؟" زیور نے پوچھا۔

"نہیں۔" وکی مسلسل بولتا چلا گیا۔ "بلکہ اصل مسئلہ تو اب شروع ہوتا ہے کہ انہیں بھلا کس طرح گھر تک لایا جائے؟"

"آپ پاری ماموں کا موٹر سائیکل لے کر چلے جائیے......" عقل مند سعدی نے فوراً اپنی رائے دی۔

"نہیں یار۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "میں یہ قربانی نہیں دے سکتا۔ جاتے ہوئے تو میں بہ آسانی چلا جاؤں گا' لیکن واپسی میں مجھے ٹینکی پر بیٹھنا پڑے گا۔ پچھلی سیٹ پر تو موصوفہ اکیلی ہی فٹ ہو جائیں گی؟"

مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس گروپ میں باقی افرادِ خانہ بھی شامل ہو گئے۔ ان کی بروقت آمد نے یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ خالد بھائی نے چابی وکی کو تھما دی۔ سعدی بھی ساتھ تیار ہو گیا۔ ملکہ بھابی نے سیانی بیگم کو رخصت کرنے کے بعد روی کو سنبھال لیا اور زینی رات کے کھانے کا مینو بتانے لگیں۔

"کوئی تکلف نہ کریں آپی۔" پرویز علی شاہ نے کہا۔ "میں تو اجازت چاہوں گا۔"

"تکلف تو تم کرنے لگے ہو۔" ملکہ بھابی نے بہنوں والے روایتی مصنوعی غصے سے کہا۔

"اور نخرے بھی۔" پنکی نے گرہ لگائی۔

"مت جائیے گا۔" وکی نے جاتے جاتے خالد بھائی سے قطع نظر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بہت ممکن ہے' آنے والی معزز مہمان کو آپ کی عدم موجودگی سے شدید مایوسی ہو۔"

پرویز علی شاہ مسکرایا۔ زیور نے سرگوشی سن لی تھی۔ جب ادھر سے نظریں اس طرف گئیں تو زیور کا سر جھک گیا' گویا کہ یہ بھی اک سجدۂ قبولیت کا انداز تھا۔

نیلوفر کے ہمراہ جب یہ قافلہ واپس پہنچا تو ملکہ بھابی اپنے لاڈلے بھائی کو روکنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ وہ آئیں اور چھا جانے والے انداز میں لاؤنج میں تشریف فرما افراد پر اپنی نان سٹاپ گفتگو کے ذریعے توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ تمام افرادِ خانہ سے فرداً فرداً خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اس نے ذرا سی مدھم آواز میں پرویز علی شاہ سے بڑے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ "اور سنائیے کپتان صاحب' آپ کو اپنے مشن میں کتنے فیصد کامیابی ہوئی؟"

اگرچہ سوال تو غیر متوقع تھا۔ پھر بھی پرویز علی شاہ مسکرائے اور انہوں نے نہایت ٹھہرے

ہوئے انداز میں زیور کو دیکھ کر جواباً کہا۔ "بات یہ ہے نیلو بادشاہ کہ ہم فوجی لوگ ہیں۔ لہٰذا پتھروں سے پانی نکالنے کا فن خوب جانتے ہیں۔"

نیلوفر لاجواب ہوگئی۔ وکی کے تیز وطرار کانوں نے پرویز علی شاہ کا جواب سن لیا اور حسب عادت اس کی زبان بول اٹھی۔

"جی ہاں۔ بجا فرمایا آپ نے۔ کشمیر کے سارے چشمے بلاشبہ آپ کی اسی مہربانی کی وجہ سے جاری وساری ہیں۔"

"آپ کی روانگی کب تک ہے؟" خالد بھائی نے نیلوفر سے پوچھا۔

"ان شاء اللہ اگلے ہفتے تک۔" اس نے چہک کر جواب دیا۔

"اللہ مصری قوم کے حال پر رحم فرمائے۔" وکی نے فوراً کہا۔

ملکہ بھابی اور پرویز علی شاہ کے ساتھ خالد بھائی بھی مسکرانے لگے۔ جبکہ نیلوفر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے زیور کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری انگوٹھیاں بہت چمک رہی ہیں۔ واش کروائی ہیں کیا؟"

"نہیں۔ نئی لی ہیں۔" پنکی نے مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔

"کیا......؟ انگوٹھیاں؟" نیلوفر نے حیرت سے سوال کیا۔

"نہیں۔ انگلیاں۔" وکی نے فوراً گرہ لگائی۔

"زیبی کھانا لگاؤ۔" ملکہ بھابی نے کہا۔ زیور حسب عادت فوراً حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ پنکی جب خالد بھائی کے کہنے پر کھڑکی کا پردہ درست کرنے لگی تو اسے گیٹ سے باہر رزاق کا چہرہ نظر آیا۔ جو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ توجہ دلانے پر وکی فوراً باہر چلا گیا اور رزاق کو ہمراہ لئے ہوئے اس اطلاع کے ساتھ واپس آیا کہ آج تو اللہ پاک کی رحمتیں اتر رہی ہیں اور یہ نزدس شدہ رحمت اس سلسلے میں نازل ہوئی ہے کہ زیور بیگم کے لیے ان کے والد گرامی پیر حسن داد عرف فضل الٰہی کی طرف سے واپسی کا بلاوا ہے۔ عزیزم رزاق چار دن کے لیے اپنے ننھیال حویلیاں جا رہے ہیں لیکن واپسی پر زیور بیگم کا ساتھ جانا ضروری ہے۔ عرس شریف کے موقع پر ان کا ہونا لازمی تھا۔"

یہ اعلیٰ درجے کی قرارداد جب بازبانی وقار احمد کے سامنے آئی تو اسمبلی کے اس فورم پر نہایت

اداسی کا عالم چھا گیا۔ بہرحال ڈنر کے دوران یہ پروگرام طے پا گیا کہ واپسی کے سفر میں خالد بھائی بذات خود انہیں چھوڑنے جائیں گے۔ راستے میں بڑا سی کے مقام پر پرویز علی شاہ ایکسرسائز ایریا میں انہیں زبردست قسم کا لنچ دیں گے۔ تمام قافلہ ہمراہ ہوگا۔ ماسوائے ملکہ بھابی کے جو نومولود رومی اور سیانی بیگم کے ہمراہ گھر میں ہی مقیم رہیں گی۔ اس سارے سفر میں پرویز علی شاہ کی خصوصی دعوت پر نیلو بادشاہ بھی ہمراہ ہوں گی۔ چونکہ ان کی چھٹی سات دن کی تھی۔ لہٰذا بقول پنکی کے "سارا پروگرام" انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہوگیا۔

"اچھے بھلے پرسکون ماحول میں ہم لوگ جی رہے تھے۔" وکی نے تبصرہ کیا۔ "عزیزم عبدالرزاق نے اپنی آمد کے صدقے اس پروگرام میں رنگ میں بھنگ ڈال دی۔"

"میں اداس ہوں۔" اس نے اعلان فرمایا۔

"اداس تو ہم سب ہیں چاچو۔" پنکی نے پرویز علی شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مگر کیا کریں' مجبوری ہے۔"

ڈنر کے فوراً بعد پرویز علی شاہ مسکراہٹ کے نذرانے عطا فرمانے کے بعد اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔

جبکہ رات بے حد اداسی کے عالم میں اتر آئی تھی۔ ایک مسلسل کرب اور قدرے بے معنی سی خلش کا احساس تھا۔ بچھڑ جانے کی ابتدائی منزل واقعی مشکل ہوتی ہے۔ اس منزل کی جانب پہلا قدم اٹھاتے ہی انسان کو قدموں کے نیچے بچھے سنگ ریزوں کی چبھن کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یہ احساس جاگزین ہوا تو نیند زیور کی آنکھوں سے چھن گئی۔ اس رت جگے کے بعد کی صبح بھی اداس تھی۔ نیلوفر تیار ہو کر اپنے سوشل حلقے میں ملاقات کے لیے جا چکی تھی۔ رزاق حویلیاں جاتے ہوئے تین دن کے بعد تیاری کا کہہ کر رخصت ہوگیا تھا۔ بہت اچھے' بہت خوبصورت دن بس لمحوں میں ہی پرواز کر گئے تھے۔ پنکی' سعدی اور شیری سکول روانگی سے قبل زیور کو بار بار یہیں پر قیام کا اصرار کرتے ہوئے گئے تھے جبکہ رومی کو تیار کرنے کے بعد جھولے میں ڈالتے ہوئے ملکہ بھابی نے زیور کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بڑی محبت سے نہایت معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

"زیبی میں ان شاء اللہ بہت جلد ہی بی جی کے پاس آؤں گی۔"

کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

اپنے خیالات کی تائید پا کر وہ زبردست تیاری کر کے چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ پنکی سے کہہ رہا تھا۔ "ہمیشہ ایسے مواقع پر تیاری شیاری زبردست قسم کی کرنی چاہیے۔ وہاں بے شک چائے کی ایک ہی پیالی ملتی ہے مگر کچھ پتا نہیں لڑکیاں شڑکیاں آئی ہوتی ہیں۔ کیا خبر کس وقت کس حسینہ کی نظر پڑ جائے اور جناب وقار احمد کا کام تمام ہو جائے۔"

"کچھ کام بنا چاچو؟" واپسی پر پنکی نے پوچھا۔

وہ مایوسی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "کچھ نہیں حاصل ہوا۔ دراصل وہاں لڑکیاں تو بہت تھیں مگر کیا کروں وفا کی پتلی کوئی بھی نظر نہ آئی۔ زمانہ بہت بے حجاب ہو گیا ہے۔"

سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ اس گھر میں گزری حسین شاموں اور دل پذیر صبحوں کا قیام تمام ہوا اور وقت رخصت قریب آ گیا۔ رزاق صبح سویرے حویلیاں سے آ گیا اور اس لانگ ویک اینڈ پر جب زیور فضل الٰہی کو بخیریت واپس پہنچانے کو یہ قافلہ مع نیلوفر تیار ہو کر اپنے ساز و سامان کے ساتھ پورچ میں آ کر رکا تو ملکہ بھابی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری ہو گئی۔ اس برسات کے دوران وہ کچھ نہ سمجھ آنے والی زبان میں بے چاری زیور کی ان مہربانیوں کا شکریہ ادا کر رہی تھیں جو اس نے اپنے قیام کے دوران ان کی ذات پر عنایت فرمائی تھیں۔ جواب میں زیور کی آنکھیں بھی چھما چھم برسیں اور بقول پنکی کے "ہر طرف جل تھل ہو گیا۔" الوداعی ملاقات کے ان روح فرسا مناظر کے بعد تمام قافلہ خالد بھائی کی "نیم سرکاری" ویگن میں سوار ہو گیا اور پورچ میں ملکہ بھابی کے ساتھ سیانی بیگم ہاتھ ہلاتی رہ گئیں۔

اب سفر شروع ہوا۔ موسم بھی خوشگوار تھا اور اس حسین خطے کے دل فریب مناظر بھی سامنے تھے۔ ہر طرف قدرت کی صنعت کے شاہکار' فطرت سے قریب تر اونچے نیچے راستے' چھوٹی بڑی چوٹیاں' اونچے لمبے درخت' کہیں کہیں چھوٹے بڑے بہتے ہوئے ندی نالے اور کبھی کسی جگہ کوئی اونچائی سے بہتا ہوا جھرنا۔ راستے کی خوبصورتی تو اپنی جگہ اہم تھی۔ اس پر وکی اپنی گفتگو سے اس اداس قافلے کے رنجیدہ مسافروں کو ہنسانے کی کوشش میں تقریباً ناکام ہو رہا تھا۔ چونکہ اس شدید جدائی کا اثر بہت ہی گہرا تھا۔ یہاں تک کہ خالد بھائی کے ذہن میں پرویز علی شاہ کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق بڑا سی کے مقام پر ایکسرسائز ایریا کا وہ علاقہ سامنے آیا' جہاں بقول وکی کے

"ملکہ بھابی۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "بی جی تو بے بس اور کمزور بیوی اور بڑی معصوم ماں ہیں۔ آخری فیصلہ تو پیر بابا کا ہوتا ہے۔" اس کا اشارہ اپنے ماں باپ کی طرف تھا۔

"خدا جانے کیا ہو گا؟" زیور نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"پیاری کے جذبوں کی کشش تمہیں دوبارہ میرے پاس لے آئے گی۔" ملکہ بھابی مسکرائیں۔

"یہ جذبے سلامت رہیں تو پتھر بھی پانی بن جاتا ہے۔ بس تم ثابت قدم رہنا۔"

"ان شاء اللہ۔" زیور کے منہ سے آواز نکلی۔

اس سہ پہر زیور کی واپسی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وکی نے چائے پینے سے صاف طور پر انکار کر دیا۔ البتہ ناظرین اور حاضرین کا دل رکھنے کے لیے اس نے صرف دودھ کا گلاس اپنی جان ناتواں کے صدقے اندر انڈیل لیا۔ نیلوفر کو اس نے یہ مشورہ بالکل مفت عنایت فرمایا کہ بالفرض محال اگر کوئی مصری نظر و دل میں سما جائے تو بے شک قبول فرما لیجئے گا۔ کیونکہ اکثر ہی نہیں بلکہ عام طور پر ایشیائی مرد بطور شوہر چج کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اچھا ہے کہ اس طرح سفارتی سطح پر نہ صرف یہ کہ تعلقات بھی بہتر ہو جائیں گے بلکہ بطور شوہر ایک مصری شوہر کا ٹیسٹ بھی ہو جائے گا کہ بھلا وہ کتنے فیصد شرافت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اس ساری تقریر کو ہضم کرنے کے بعد نیلوفر نے بتایا کہ آج اس نے جھکیوں سے زبردست شاپنگ کی ہے۔ وہ تحفے کے طور پر ملکہ بھابی' زیور اور پنکی کے لیے بھی سوٹ لائی تھی۔ خواتین نے سمگل شدہ جاپانی کپڑے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو وکی نے اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ "بے چاری معصوم خواتین۔ یہ بھی نہیں جانتیں کہ یہ سارا مال گوجرانوالہ (پنجاب) میں بنتا ہے جس پر "میڈ ان جاپان" کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ارے نادانو' جاپان میں کاریں بنتی ہیں' کپڑا نہیں۔ خدا کے واسطے اپنے وطن سے محبت کرنا سیکھو۔"

اس شام خواتین کی اس ذہنیت پر ماتم کرتا ہوا وکی خالد بھائی کے ہمراہ ان کے کسی کولیگ کی دعوت ولیمہ پر چلا گیا' جہاں وہ سلامی کا لفافہ عنایت فرمانے کے بعد فقط ایک کپ چائے پی کر تمام قوم پر سادگی کا درس دیتے ہوئے احسان عظیم فرمانا چاہتا تھا۔ حالانکہ سادگی کا یہ شعار اپنانے کی اپیل کرنے والوں کا ماہانہ خرچ اربوں روپے کی صورت میں قوم پر عذاب بن کر نازل ہو رہا ہے۔ معاشرے کے اس تضاد نے آج کی قوم کو جس تفریق میں مبتلا کر دیا ہے اس پر سوائے اظہار افسوس

فوجیوں نے جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ کچے راستے صاف اور ہموار تھے۔ جن کے دونوں طرف اینٹیں لگا کر سفید چونا لگایا گیا تھا۔ اندر درختوں کے نیچے قطار در قطار خیموں کی ترتیب قابل دید تھی۔ یہ سارا منظر بے حد دلکش تھا اور اس معزز قافلے کے یوں مناسب استقبال کے لیے پرویز علی شاہ عرف پاری ماموں اپنے چند ساتھیوں آصف' ذاکر اور کرامت کے ہمراہ چشم براہ تھے جبکہ میجر رانا فی الحال آرام فرما رہے تھے۔

جب تمام افراد میس کے اس خیمے میں سیٹل ڈاؤن ہو گئے' جسے وقتی طور پر "ڈائننگ روم" کا نام دیا گیا تھا تو کیپٹن آصف کی چمکتی ہوئی شرارتی نگاہوں اور معنی خیز مسکراہٹ کو سب نے نوٹ کیا۔ پنکی نے اس تمام سیٹ اپ کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "اف اللہ' پاری ماموں' آپ لوگ اس طرح بھی رہ لیتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ دیکھ لیجیے۔" پاری ماموں کی بجائے کیپٹن آصف نے جواب دیا۔ "ہم لوگ اس طرح یا پھر اُس طرح دونوں طرح سے جینے کے عادی بنائے جاتے ہیں۔"

"بھائی صاحب۔" وکی نے ذرا سنجیدگی سے سوال کیا۔ "فرض کریں۔ اگر کوئی اور بندہ بھی آپ کے ساتھ اس طرح سے جینا چاہے تو پھر آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"ہم لوگ بڑی خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں۔" آصف کا جواب تھا۔ "فکر نہ کریں۔" اس نے زیور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہمیں قدرت نے زبردست قوتِ برداشت سے نوازا ہے۔ آپ بندہ تو تیار کریں۔ ہم سب کچھ برداشت کر لیں گے۔"

"بس اب یہ معاملہ بھی یو این او میں جانے والا ہے۔" وکی نے کہا۔ "آیئے مل کر دعا کریں کہ تمام معاملات بخیر و خوبی حل ہو جائیں۔"

"بڑی معنی خیز گفتگو ہو رہی ہے۔" نیلوفر بولے بنا نہ رہ سکی۔

"ہم تو سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔" وکی نے کہا۔ "خدا جانے آپ کیا معنی نکالنا چاہتی ہیں۔"

"آپ کے کولیگ کی دعوتِ ولیمہ کیسی رہی؟ پرویز علی شاہ نے خالد بھائی سے پوچھا۔ مگر خالد بھائی کے جواب دینے سے پہلے ہی وکی حسب عادت بول اٹھا۔

"بہت اچھی رہی۔ وہاں پر دانت گرانے کا پورا پورا انتظام موجود تھا۔"

"یعنی کہ؟" کیپٹن آصف نے سوال کیا۔

"یعنی...... یہ کہ پہلے تو معزز مہمانوں کو ٹھنڈا یخ کوک پیش کیا گیا۔ بعد ازاں شدید گرم چائے کی پیالی سے ان کی تواضع فرمائی گئی۔" وکی نے وضاحت کی اور اس قدر دلکش وضاحت پیش کرنے پر اس محفل کے تمام شرکاء مسکرانے لگے۔ جب چائے کے ساتھ اسنیکس سرو کیے جا رہے تھے تو نیلوفر کی خاموشی کا نوٹس لیتے ہوئے پرویز علی شاہ نے پوچھا۔

"نیلو بادشاہ۔ آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"یہاں پر رات کتنی سنسان گزرتی ہوگی۔" نیلوفر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "کس قدر ویرانی اور خاموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہوگا۔"

"جی' ایسی تو کوئی بات نہیں۔" کیپٹن آصف نے کہا۔

"آپ قطعی فکر نہ کریں۔ ہم رات کو گیدڑوں کی آوازیں لوری کی صورت میں سننے کے عادی ہیں۔ کبھی کبھی کسی دل جلے شیر کی دہاڑ بھی سنائی دیتی ہے اور اکثر......!"

"چڑیلیں بھی لڈی ڈالنے آ جاتی ہیں۔" وکی نے ان کی بات کاٹ کر جملہ پورا کر دیا۔

"اف اللہ۔ ماموں۔ آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگتا۔" پنکی نے پرویز علی سے سوال کیا۔

"جی قطعی نہیں۔" کیپٹن آصف نے فوراً جواب دیا۔ "اگر ہم لوگ ابتدا ہی سے چڑیلوں سے ڈرنے لگیں تو بھلا بتاؤ کہ ہم بیگمات کے ساتھ کس طرح زندگی گزاریں گے۔ لہٰذا ہم لوگ ڈرتے ورتے نہیں ہیں۔"

میجر رانا کی آمد کے ساتھ ہی گفتگو نے سنجیدہ رخ اختیار کر لیا۔ تمام حضرات بالخصوص پرویز علی شاہ اور کیپٹن آصف مؤدب انداز میں بیٹھ گئے۔ وکی نے دبے الفاظ میں تبصرہ کیا۔ "فوج کی یہی تو مصیبت ہے کہ سینئر کی موجودگی میں بندہ اپنی مرضی سے پہلو بھی نہیں بدل سکتا۔"

"پہلو بدلنا تو کجا۔ سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" کیپٹن آصف نے بالکل آہستہ آواز میں دبے لفظوں کے ساتھ کہا۔

"پھر آپ لوگ زندہ کس طرح رہتے ہیں؟" پنکی نے مسکرا کر پوچھا۔

"دیکھ لیجیے۔ یہی تو قدرت کا کمال ہے۔" ذاکر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کھانا لگنے کی اطلاع پر تمام شرکائے محفل اس خیمے میں بزم نشین ہو گئے جسے میس کا نام دیا گیا تھا۔ یہاں کی ترتیب بھی دلکش تھی۔ جگ مگ کرتی ہوئی کٹلری دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی اور پنکی کی رائے کے مطابق نہایت ادب و احترام کے ساتھ کھانا کھایا گیا۔ سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا عبدالرزاق کو کرنا پڑا۔ جو اپنے گھر میں تو درگاہ شریف کے اس حصے میں جسے پیر خانہ کہا جاتا تھا' آرام سے چٹائی پر آلتی پالتی مار کر رزق کو اپنے پیٹ کا نصیب بناتا تھا' مگر یہاں اس ماحول میں اللہ پاک کی طرف سے اتاری گئی بے شمار نعمتوں کو ان ہتھیاروں کی مدد سے کھانے کے لیے بے چارے عبدالرزاق کو تقریباً جنگ کی سی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ صورت حال دیکھ کر کیپٹن کرامت نے ڈش اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تکلف نہ کیجئے۔ اپنا گھر سمجھ کر کھائیے۔''

''اور پیٹ کو بھی اپنا ہی سمجھئے گا۔'' پنکی نے مسکرا کر کہا۔ تو خالد بھائی نے بطور ناراضگی اسے بری طرح سے گھورا...... کھانے کے بعد نیلوفر نے باہر نکل کر ذرا قدرت کے ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ٹہلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ذکی نے فوراً کہا۔

''یہاں کے جنگلی جانور کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ لہٰذا مناسب یہی ہوگا کہ آپ یہیں تشریف فرما رہیں۔ ویسے بھی آپ نے مصر جانا ہے اور زخمی حالت میں سفر کرنا مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔''

مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے پنکی اور زبور کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ باہر چیڑ کے درختوں کے نیچے بسی اس دنیا کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ پنکی کہہ رہی تھی۔ ''لگتا ہے' قدرت یہاں سے قریب ترین ہے۔''

''فکر نہ کریں آپا۔ شیر بھی قریب ترین ہے۔'' سعدی نے ڈرایا۔

چائے کے لیے بلاوا آیا تو مہمانوں نے دیکھا کہ وسیع سبزہ زار پر جہاں زمین کے ٹکڑے کو تراش کر اردگرد باؤنڈری وال بنائی گئی تھی' کرسیاں لگا کر چائے سرو کی جا رہی تھی۔ زبور' نیلوفر اور پنکی جب ایک ساتھ آئیں تو وہاں تشریف فرما تمام حضرات احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اس قدر عزت افزائی کا یہ انداز خواتین کے دلوں تک اتر گیا۔

''دیکھا آپ نے۔'' ذکی خالد بھائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''فوج میں اڑھائی عدد خواتین کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔''

''آپ کبھی کشمیر آئیں۔ بہت خوشی ہوگی۔'' رزاق نے پرویز علی شاہ سے کہا۔ وہ مسکرائے اور انہوں نے زبور کی طرف دیکھ کر ذرا شرارتی لہجے میں کہا۔

''پھر آپ ہم سے یہ تو نہیں پوچھیں گے کہ آپ کون ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' رزاق نے بات سمجھے بغیر کہا۔ ''ہماری پہچان بہت تیز ہے۔ ہم بھولتے نہیں۔''

اب خالد بھائی کو جانے کی جلدی تھی۔ چونکہ گڑھی حبیب اللہ کے مقام سے باقی قافلے نے تو پلٹ کر واپس ایبٹ آباد جانا تھا جبکہ وہاں سے اپنے محکمے کی جیپ میں خالد بھائی زبور اور رزاق کو آگے کی منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد دوسرے دن واپسی کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب اس خوبصورت ماحول اور اتنے پیارے لوگوں سے رخصت ہونے کا وقت قریب آیا تو سب ہی کے دل اداس ہو گئے۔ اگرچہ لب خاموش تھے مگر نگاہیں بتا رہی تھیں کہ اگر ضبط کا یارانہ رہا تو ہر آنکھ حوصلے کی دیوار توڑ کر نم ہو سکتی ہے۔ الوداعی کلمات کے بعد جب سب لوگ بہت آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے تو چند قدم پیچھے چلتی ہوئی زبور کا آنچل پرویز علی شاہ کے ہاتھوں نے چھو لیا اور نہایت جذباتی لہجے میں یہ لفظ کانوں کے اندر تک اتر گئے۔

''آپی بہت جلد آپ کے ہاں آئیں گی۔''

جواب میں نگاہیں کچھ نہ بولیں۔ البتہ بہت آہستگی کے ساتھ فقط دو آنسو آنچل کے اس کونے کا نصیب بن گئے جہاں سے پرویز علی شاہ کے ہاتھوں نے اسے چھونے کی جسارت کی تھی۔ جب مناظر نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تو زبور فضل الٰہی نے دیکھا۔ شرکائے قافلہ بچھڑ چکے تھے اور ایک گہری اداسی کا عالم ہر طرف طاری تھا۔ جنگل گرین کلر کی جیپ کا چترالی ڈرائیور آزاد کشمیر کے اس پہاڑی علاقے کی تنگ اور ناہموار سڑک پر بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ آگے خالد بھائی بیٹھے تھے۔ پیچھے بیٹھا رزاق ٹیک لگا کر سو چکا تھا۔ رات کسی دم بے خبری میں اتر آئی تھی۔ ہلکی خنکی میں آسمان کا چاند روشن تھا اور اس پہاڑی سلسلے کے نیچے دور دریائے نیلم کی لہریں روشن تھیں۔ زبور کا دل ایک دم بھر آیا۔

وہ سب لوگ بھلا کہاں رہ گئے تھے؟ ابھی فقط چند لمحات پہلے کے بہت پیارے مسکراتے ہوئے دل کش ہم سفر...... اس صبح کا آغاز کس قدر دلنشین تھا اور اس سفر کی یہ شام کتنی اداسی کے عالم

میں اتری تھی۔ مسکراتے ہوئے ساتھی کچھ نہ کچھ کہتی ہوئی نگاہیں۔ ہر سمت پھیلی ہوئی خوشیاں...... کہیں بہت دور رہ گئے تھے۔

آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے میلوں دور پیر چناسی کے مقام پر جب منزل قریب آ گئی تو کئی ایک تنگ اور چھوٹے موڑ مڑنے کے بعد چترالی ڈرائیور نے خالد بھائی کی ہدایت پر جیپ پیر خانے کی بائیں جانب بنے ہوئے شیڈ کے نیچے کھڑی کر دی۔ یہ جگہ باغ جبیری کہلاتی تھی۔ جیپ کا انجن ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہوا تو پیر خانے کے اوپر چوبارے سے پیر حسن داد کے خلیفہ خاص قربان شاہ کی چمکتی ہوئی آنکھوں نے جھانکا اور ایک پل میں مہمانوں کی آمد کی حقیقت جان کر اس نے ملازم کو آوازیں دیں تاکہ وہ سامان اندر پہنچا سکے۔ زیور جیپ سے اتری اور اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک وحشت کا احساس اس کی ذات کے اندر اتر آیا۔ عجیب قسم کی خاموشی اور سناٹا تھا۔ صرف درگاہ شریف کی نشیبی جانب واقع لنگر خانے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ پیر خانے کا وہ چوبارہ بھی اس وقت خاموش تھا' جہاں دن بھر مریدوں سے زیادہ مریدنیوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور پیر حسن داد اس دربار خاص کے راجہ اندر بنے ہوئے تمام دنیا کے مسائل حل کرنے میں لگے رہتے جبکہ ان کے اپنے گھر کے اندر بی جی (زیور کی ماں) تمام افراد خانہ کے درمیان بھی تنہا تھیں۔ پیر بابا کی نظر کرم کبھی کبھی ان کی جانب اٹھ جاتی تو گویا زندگی اس لمحے مکمل ہو جاتی۔ لیکن اس نظر کرم کے لیے اکثر نور بیگم عرف بی جی کو کچھ عرصے تک انتظار کرنا پڑتا۔

پیر حسن داد کی بڑی شہرت اور دھوم تھی۔ ان کے لکھے ہوئے تعویذ اکثر لوگوں کے مسائل حل کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے اپنے گھر کے اندر کے حالات پر ان کا کوئی بھی تعویذ کارگر ثابت نہ ہوتا۔ ان کی بڑی اولاد پیر اولیاء بادشاہ محمد نبی اپنی زوجہ محترمہ کے بے دام غلام تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی تمام تر طنابیں برضا و رغبت اپنی لاڈلی بیگم حسن آرا کے سپرد کر دی تھیں۔ حسن آرا نے ان کی زوجیت میں آتے ہی چولہا الگ کر لیا تھا۔ اس کے بقول وہ اس قدر کھپ کی عادی نہیں تھیں۔ پیر خانے کے مشرقی حصے کو اس نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ جہاں وہ الگ تھلگ دن بھر اپنے میکے والوں کی خاطر مدارت میں مصروف رہتیں۔ اندر زنان خانے میں پیر حسن داد کی بڑی غیر شادی شدہ بہن نیک بی بی کا راج تھا۔ جو عرف عام میں ''نکی بی'' کہلاتی تھیں۔ خواتین کی تمام فوج ان کے انڈر کمانڈ کام کرتی۔ پیر حسن داد کی پچھلی اولاد شباب شاہ کہلاتی تھی۔

شباب شاہ من موجی آدمی تھا۔ اکثر دوستوں کے ہمراہ سیاحت پر رہتا اور واپسی پر پیر بابا کی جھاڑ سن کر بی جی کی آغوش میں سر رکھ کر آرام سے سو جاتا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جب وہ کسی قابل ہو جائے گا تو اپنی بی جی اور زیور کو لے کر کسی اور مقام پر منتقل ہو جائے گا۔ اس کے بقول یہ دنیا اس کے رہنے کے قابل ہی نہ تھی۔ ایف اے ہی میں تعلیم ادھوری چھوڑنے کے بعد وہ صرف اپنی چرب زبانی کی بنیاد پر کسی نئی دنیا کا متلاشی تھا۔ اکثر کمزور عقیدے کی مریدنیوں کو فرضی تعویذ لکھ کر اس یقین کے ساتھ عنایت فرماتا کہ یہ پیر بابا نے ان کے لیے دیئے ہیں۔ اس طرح سے حاصل کردہ نذرانے کی بنیاد پر وہ نئی دنیا' نئے مقامات تلاش کرنے نکل جاتا۔ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی سمجھ سکتا تھا کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ بی جی عام طور پر اپنے شبو کے لیے پریشان رہتیں۔ زیور کی اپنی ذات کا اکیلا پن جب اسے پریشان کرتا تو وہ باغ جبیری سے نیچے بنی سنگ ریزوں کی اس سڑک پر آ جاتی جو بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان سے بہتے ہوئے دریا کی طرف جاتی تھی۔ اسی دریا کا پرانا نام کشن گنگا تھا جبکہ حالیہ دور میں یہ دریائے نیلم کہلاتا تھا۔ اس دریا کے اوپری سرے کی جانب پیر حسن داد کے چچا زاد بھائی جمال شاہ کا ڈیرہ تھا۔ جمال شاہ پڑھا لکھا اور کھلے دماغ کا آدمی تھا۔ ان کی بیگم زرینہ روایتی اور فرسودہ خیال کی عورتوں کے برعکس سلجھی ہوئی اور باوقار خاتون تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر سمیت اس پاپی دنیا سے اکثر شکوہ کناں رہتی' لیکن زیور کے ساتھ اپنے روایتی رشتے سے قطع نظر اس کی دوستی بہت گہری تھی۔ دونوں اکثر مل کر شام کے وقت دریا کے کنارے ایک مخصوص چٹان کی اوٹ میں زمین پر بیٹھ جاتیں اور دریائے نیلم کی لہروں پر نظریں جمائے ڈھیر ساری باتیں کیا کرتیں۔ یہاں سے اوپر مشرق کی سمت پیر پنجال کا پہاڑی سلسلہ سارا سال برف سے ڈھکا ہوا روشن رہتا اور وادی کے اس طرف بسنے والوں کے لیے ہر پل ایک دل کش نظارے کا سماں پیش کرتا۔ اس تمام پُر امن اور پُرسکون نظاروں کے درمیان بسنے والوں کی زندگی میں اس وقت اچانک ہلچل اور ارتعاش پیدا ہو جاتا جبکہ وادی کے اس پار مورچوں میں تعینات ازلی دشمن کے سپاہی بغیر کسی اشتعال کے نہتے دیہاتیوں پر فائرنگ شروع کر دیتے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان مرد اور عورتیں اکثر اس فائرنگ کی زد میں آ جاتے۔ کسی نہ کسی کے گھر میں کہرام مچ جاتا یا پھر زخمیوں کو قریبی ڈسپنسری تک پہنچانا بھی مشکل ترین امر بن جاتا۔ جب انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی تو حالات پُرسکون ہونے پر کسی وزیر اور مشیر کی جھنڈا لگی گاڑی نیچے محفوظ مقام پر آن رکتی۔ اپنے

مسائل سے اکتائے ہوئے لوگ ان "ناخداؤں" کے گرد جمع ہو جاتے۔ جہاں انہیں دم دلاسہ دینے
کے علاوہ ایک لفافے میں حکومت وقت کی انسانی زندگیوں کی قیمت ادا کردی جاتی۔ "نعرہ تکبیر اللہ
اکبر" کی صداؤں میں لوگ یہ نذرانہ پا کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے۔ وزیر مشیر دعوت اڑاتے
اور شام سے بہت پہلے یہ تمام گاڑیاں واپس دارالحکومت کی جانب روانہ ہوجاتیں اور الوداعی ہاتھ
ہلاتے ہوئے غریب اور بے کس دیہاتی اپنے مسائل سمیت گھروں کو لوٹ آتے۔ حکومت وقت کی
جانب سے عطا کردہ لفافہ کچھ دن تو ساتھ دیتا۔ بعدازاں زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چل نکلتی اور سب
کچھ ویسا ہی ہوجاتا' جیسا کہ برسوں سے ہوتا آیا ہے۔

زیور فضل الٰہی کے لیے یہ سب ہی کچھ قطعی اجنبی اور نیا تو نہ تھا کہ زندگی کے چوبیس برس اسی
طرح کی صورتِ حال کی نذر ہو چکے تھے۔ اس سارے پس منظر میں درگاہ شریف کی سبز چادر والی
اونچی قبر پر جلتے ہوئے دیے کی روشنی سے لے کر پچھلی سمت پھیلے ہوئے قبرستان کی تاریکی تک ہر
ایک چیز اس کی اپنی تھی۔ بی جی کا پیار' شباب شاہ کی محبت' پیر بابا کی توجہ خاص' اولیاء بادشاہ محمد نبی کی
بے اعتنائی اور زرینہ کی دوستی۔ سب ہی کچھ ویسا ہی تھا' مگر اب ایک خلش زندگی میں آن جمی تھی۔
ایک عجب بے چینی کا عالم تھا جو خالد بھائی کی واپسی کے بعد بڑا گہرا ہو گیا تھا۔ وقت بے وقت آنسو
آنکھوں میں آنے لگے۔ کسی نہ کسی وقت عبدالرزاق اپنے معصوم بھولے بھولے لہجے میں پوچھ لیتا۔
"آپی کیا بات ہے؟" تو زبان بڑی مشکل سے یہ لفظ ادا کرپاتی۔ "بچے بہت یاد آتے ہیں۔"
حالانکہ دل چلا چلا کر پکارتا۔ "ہرگز نہیں' زیور بیگم۔ جھوٹ مت بولو۔ یہ تو پرویز علی شاہ کی یاد کی خلش
ہے۔ تم بے شک اس بات کو تسلیم نہ کرو۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ بے شک آج کی شام جا کر درگاہ
شریف کے جلتے دیے کی لو سے پوچھ لینا کہ اس کی جھلملاتی روشنی سمیت یہاں اس خطہ زمین کے
ہر ایک ذرے میں چیڑ اور چنار کے درختوں کے ہر ایک پتے اور بہتے دریا کے پانی کی لہروں کے
ساتھ ساتھ بھلا کس کی یاد کا عکس جھلملاتا ہے؟ یہ تو دلوں کے فیصلے ہیں زیور بیگم۔ بھلے دماغ اور عقل
انہیں مانے یا پھر نہ مانے' کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اپنے دل کی اس مضبوط دلیل پر وہ خود ہی لاجواب
ہوجاتی۔ یہ تو دل کا راز تھا۔ گہرا' بہت ہی گہرا اور گھمبیر۔ زیور کی ذات خود اپنے آپ سے اس قدر
رازداری برت رہی تھی کہ وہ زرینہ بیگم جیسی مخلص ترین ہستی سے بھی اس راز کا تذکرہ نہ کرسکی۔
زندگی تو ہاں وہی تھی۔ ویسی ہی تھی لیکن یہاں کی اترتی ہوئی صبحوں کا رنگ بدل چکا تھا۔ رات

نہایت اداسی کے عالم میں اتر آتی۔ یادوں کا ایک سمندر ذہن میں موجزن ہوجاتا۔ پرویز علی شاہ کا
چہرہ ہر ایک پل نگاہوں کے سامنے رہتا۔ پنکی' سعدی' شیری اور رومی بے حد یاد آتے۔ جب درد کا
پہلا موسم گزر گیا تو عرس کے موقع پر زیور کو ملکہ بھابی کی آمد کا بے حد انتظار رہنے لگا۔ زندگی میں در
آنے والی انتظار کی اس کیفیت نے یادوں کے سمندر کے ساتھ مل کر بے چینی کو بڑھا دیا اور آہستہ
آہستہ یہ کیفیت تقریباً سب پر عیاں ہونے لگی۔ نیک بی بی اسے خاموش دیکھ کر اکثر اپنے شبے کا
اظہار کرتے ہوئے سب کے سامنے بغیر کسی لحاظ اور تمیز کے جرح کرنے کے انداز میں پوچھتیں۔
"کیا ہو گیا ہے تجھے؟ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ یہاں سے تو اچھی بھلی گئی تھی۔ بھلا کون سا
روگ لگا کر آئی ہے؟"

کبھی کبھار زرینہ بیگم بھی سوال کر دیتی۔ "کیا بات ہے زیبی' تو مسکرانا کیوں بھول گئی؟"
شباب شاہ بھی عام طور پر مسکراتا ہوا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی خود غرضی کو سامنے رکھتے
ہوئے پوچھتا۔ "شاہ جی۔ کیا بات ہے۔ بہت عرصے سے آپ نے ہمارے لئے زردہ دم نہیں کیا'
اپنے آوارہ گرد بھائی کو آپ بھی بھول گئیں؟" زیور کو ہمیشہ پیار سے وہ "شاہ جی" کہہ کر پکارتا تھا۔
بی جی اکثر خاموش رہتیں' لیکن کبھی کبھار پوچھ لیتیں۔

"تو ٹھیک تو ہے نا میری بچی؟"

پیر اولیاء بادشاہ محمد نبی جب بھولے بسرے بیوی کی نظر بچا کر ماں بہن کے سامنے آ جاتے تو
ازراہ کرم اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر پوچھتے۔ "ٹھیک تو ہے میری بہن؟"
اب باقی رہ گئی تھی' پیر حسن داد کی ذات شریف تو وہ دن بھر رنگ برنگی مریدنیوں کے درمیان
گھرے رہنے کے بعد جب فرصت پا کر اندر خانے تشریف لاتے تو حکم کی سی صورت میں آواز
آتی۔ "تو کہاں ہے بچی۔ ذرا لوٹے میں پانی لا کر ہاتھ دھلوا دے۔"
بھاری چاندی کا لوٹا لبالب بھرا ہوا زیور بیگم مؤدب انداز میں لئے ان کے سامنے آن موجود
ہوتی۔ پیر بابا کے سفید چوڑے اور خوبصورت لمبی انگلیوں والے ہاتھ اپنے سروں پر گلابی ناخنوں پر
سفید لکیر لئے ہوئے پانی کے قطروں کے ساتھ روشنی میں جگمگاتے۔ یہ دستِ شفقت ہر ایک کے
لیے دست شفا تھے۔ عوام ان ہاتھوں سے فیض پاتے تھے۔ مگر بی جی ان ہاتھوں کی محبت' زیور بیگم ان
کی شفقت اور شباب شاہ ان کے سائے سے محروم تھا۔ عمر کے ابتدائی دور سے جوانی کے اولیں لمحوں

تک عام طور پر ان ہاتھوں کی پٹائی شباب شاہ کا نصیب بنی تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کی طاقت اور اپنے بڑھاپے کا احساس کرنے کے بعد انہوں نے یہ عمل ترک کر دیا تھا۔

زیور اکثر سوچتی اب بابا نے شباب شاہ کو کیوں بخش دیا۔ اب وہ ہاتھوں کا کام زبان سے لینے لگے تھے۔ ہر ایک کی نگاہیں سوالی تھیں، مگر زیور کے پاس کسی بھی سوال کا کوئی بھی جواب نہ تھا۔

ہجر کا موسم دھیرے دھیرے بیت گیا اور جب اترتی شام سوکھے درختوں کے سارے پتے وادی کے دامن میں بکھیرنے لگی تو دل میں جلتے یادوں کے بے شمار چراغوں کی روشنی میں عرس کی تقریبات شروع ہو گئیں۔ دعاؤں کے وسیلے سے رب عظیم کا دامن پکڑنے کے طلبگار لوگ درگاہ شریف پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اک ہجوم بے کراں تھا۔ لیکن ان تمام چہروں کے درمیان کوئی شناسا مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ مہربان آنکھیں نہ تھیں اور نہ ہی قدموں کی وہ مانوس آہٹ۔ جس پر دل بارہا دھڑک جاتا تھا۔ اس عالم میں بھی تنہائی ساتھ تھی۔ ایک بے چینی تھی اور مسلسل سناٹا تھا۔ مگر......لب خاموش تھے۔

جب دعاؤں کے بے شمار نذرانے سمیٹ کر خلق خدا اپنے گھروں کو لوٹ گئی تو درگاہ شریف کے جلتے ہوئے دیے نے زیور کے دل کی پکار سن لی۔ سر شام خالد بھائی کی گاڑی پیر خانے کے نیچے آن رکی۔ ملازم منگو کی رہنمائی اور خلیفہ قربان شاہ کی معیت میں یہ مہمان اندر کی جانب روانہ ہوئے تو رزاق دوڑتا ہوا اطلاع دینے چلا آیا۔ شباب کی فرمائش پر زردہ دم کرتے ہوئے زیور کا ہاتھ لکڑی کے چولہے پر دھرے ہوئے دیگچے کے ساتھ لگ کر جلتے جلتے رہ گیا۔ فقط آنچ سی لگ گئی اور سفید کلائی پر سرخ رنگ کا دھبہ ابھرتے ہوئے دیکھ کر جب وہ اس ہلکی تپش پر پھونک مارتے ہوئے رسوئی سے باہر بنی دہلیز تک آئی تو ملکہ بھابی صحن تک آ چکی تھیں۔ پنکی نے روی کو اٹھا رکھا تھا اور تقریباً بھاری بیگ اٹھائے ہوئے وکی تھکاوٹ کی بے مثال اداکاری کر رہا تھا۔ اس قدر طویل ہجر کے بعد یہ بڑی جذباتی ملاقات تھی، جس میں فریقین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جب سب مہمان برآمدے کی طرف بڑھے تو قربان شاہ نے نہایت مؤدب انداز میں وکی سے کہا۔

"آپ باہر پیر خانے میں تشریف لے چلیں۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولا۔ "میں تو ابھی تقریباً نابالغ ہوں۔"

"مرد حضرات یہاں پیر خانے میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔" قربان شاہ نے ادب سے کہا۔

"تو اس حساب سے سعدی اور روی کو بھی باہر ہونا چاہئے۔" وکی نے کہا۔ "اور جہاں تک میری ناقص عقل کام کرتی ہے تو آپ کا شمار بھی مرد حضرات میں ہوتا ہے۔"

"وکی۔" ملکہ بھابی نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ "بحث نہ کرو۔ باہر جا کر اپنے بھائی صاحب کے پاس بیٹھو۔ ان کے ساتھ ہی اندر آ جانا۔"

"بہت بہتر۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔ جاتے جاتے اس نے پنکی کے کان میں سرگوشی کی۔

"اندر اگر کوئی حسینہ عالم نظر آئے تو مجھے بھی بتانا۔" ملکہ بھابی کے گھورنے پر وہ تیزی سے چلتا ہوا قربان شاہ کے پیچھے ڈیوڑھی سے نکل گیا۔

اندر خانے بی جی سمیت تمام خواتین نے روایتی انداز میں اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔ البتہ نکی بی کو اپنے مزاج کے مطابق یہ آمد کسی قدر ناگوار گزری اور انہوں نے دبے لفظوں میں اس پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر ڈالا۔

اس شب چمکتی ہوئی انگوٹھیوں کے نگینے میں پرویز علی شاہ کی شبیہہ مسکراتی رہی۔ اپنی انگشت شہادت کو گال سے لگائے ہوئے زیور خوشبو کے اس تحفے کو دیکھتی رہی جو ملکہ بھابی نے اسے تھماتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ "یہ پاری نے تمہارے لئے دیا ہے۔" اس پیکٹ کے اوپر ایک چٹ لگی تھی جس پر یہ تحریر درج تھی۔

"خدا کرے، آپ کی زندگی اس خوشبو کی مانند ہمیشہ مسکراتی رہے۔"

وہ یادوں کی شب تھی، جس میں ملکہ بھابی اور پنکی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے زیور کا دل بارہا دھڑکا۔ کیونکہ ہر بار کسی نہ کسی بہانے پرویز علی شاہ کا نام زبان پر آ رہا تھا۔ ملکہ بھابی بتا رہی تھیں کہ ان شاء اللہ کل کسی وقت وہ اور خالد بھائی پیر صاحب کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے اور اس امید کے ساتھ کہ ضرور شرف قبولیت بخشا جائے گا۔

چونکہ یہ مہمان بغیر اطلاع کے آئے تھے۔ اس لئے جب شب کا تقریباً پہلا پہر گزر چکا تو بطور خاص تیار کردہ کھانا لگایا گیا۔ پیر حسن داد کے ساتھ خالد بھائی۔ وکی اور شباب شاہ بھی اندر چلے آئے۔

طعام گاہ میں شب مؤدب انداز میں اتری اور "آپ جناب" کے روایتی مظاہرے کے

ساتھ کھانا تناول فرمایا گیا۔

"میری بہن کے ہاتھوں سے تیار کردہ زردہ آپ کے نصیبوں میں بھی تھا" شباب شاہ کہہ رہا تھا۔ "سچ بات ہے کہ دانے دانے پر لکھتا ہے قسمت لکھنے والا"

"زیور نے ہماری بہت خدمت کی" خالد بھائی مشکور تھے۔ "ہم کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ملکہ بھابی کی طرف دیکھا۔ وہ چاہتے تھے' اسی وقت اس بات کا دامن پکڑ کر یہ بات آگے بڑھائی جائے۔ لیکن انہوں نے ہلکی سی "نہ" کا اشارہ کردیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ پہلے بی جی سے بات کریں تاکہ یہ سارا پروگرام "تھرو پراپر چینل" آگے بڑھ سکے۔

طعام کا سلسلہ تمام ہوا تو مہمانوں کو خواب گاہ میں لے جایا گیا۔ پنکی اور سعدی زیور کے کمرے میں سونے پر مصر تھے۔ بی جی کی ملازمہ خاص شاہ بیگم نے چارپائیاں ڈال کر صاف و شفاف بستر لگا دیئے۔

درگاہ شریف سے رات پرے سرک گئی۔ ہلکے اجالے کی آمد تک باتیں ہوتی رہیں۔ پنکی بھولے پن سے بتاتی رہی۔ "پاری ماموں آپ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ کوئی خط؟؟ کوئی اطلاع؟؟ کوئی خبر؟؟ انہیں آپ کے ہاتھ کا بنا کھانا بھی بہت یاد آتا ہے۔ وہ آنا بھی چاہتے تھے مگر امی نے منع کردیا۔ امی تو ان کا تحفہ بھی نہیں لا رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں ڈر رہی تھیں؟ مگر میں لے آئی تھی یہ تحفہ۔ آپ کو پسند آیا؟؟"

مگر دوسری سمت خاموشی تھی۔ ذہن پر یادوں کی وہ شب طاری تھی' جب ہسپتال کے برآمدے میں وصال کا ایک لمحہ اسے پرویز علی شاہ کے انتہائی قریب لے آیا تھا۔ یا پھر رات کا وہ پہر جب اپنی دانست میں اس نے سوئے ہوئے پرویز علی شاہ کو جگانا چاہا تھا۔ مگر اس طرف نگاہیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ یا پھر وہ سہ پہر جب زیور کے آنچل کو ان ہاتھوں نے چھو کر کہا تھا۔

"آپی۔ بہت جلد آپ کے ہاں آئیں گی۔"

آج...... پہلا وعدہ وفا ہو چکا تھا۔

"آپ...... کیا سوچ رہی ہیں؟" پنکی نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

"کچھ...... کچھ بھی تو نہیں۔" زیور نے چونک کر کہا۔

"پتا ہے۔" پنکی نے اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔ "امی جان تو اپنے ساتھ ہیرے کی

انگوٹھی لائی ہیں۔ پاری ماموں نے دی ہے اور تاکید کی ہے کہ پیر صاحب کا فیصلہ جو بھی ہو انگوٹھی ضرور آپ کو پہنا دی جائے۔" زیور کی آنکھیں اچانک نم ہوگئیں۔

شب دھیرے دھیرے بیت گئی اور درگاہ شریف کی افقی سمت سے اجالا نمودار ہوتے ہی پیر حسن داد نے فیصلہ کردیا۔ پیرخانے کے کمرہ خاص میں بی جی' خالد بھائی اور ملکہ بھابی خاموش بیٹھی تھیں۔ محمد نبی ایک طرف خاموش کھڑے تھے جبکہ سدا کا لاپرواشباب شاہ اپنی لاڈلی بہن کی تقدیر کا فیصلہ سنے بنا سو رہا تھا۔

ادھر ہر ذی نفس خاموش تھا۔ فقط پیر بابا کی آواز آرہی تھی۔ "وہ سید زادہ نہیں ہے۔" انہوں نے پرویز علی شاہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "اس بات کا علم آپ کو بھی ہے اور ہمیں بھی۔" ان کا رُوئے سخن خالد بھائی کی طرف تھا۔ "پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ملکہ بیگم کا سگا بھائی بھی نہیں بلکہ ان کے والد صاحب کی لے پالک اولاد ہے۔ جنم دینا ایک الگ فعل ہے اور پالنا ایک الگ دنیاوی عمل ہے۔ تربیت کے لحاظ سے اگرچہ اس میں کوئی کمی نہ ہوگی مگر شجرہ نسب مشکوک ہوسکتا ہے۔ ہماری کچھ روایات ہیں اور کچھ حدود و قیود بھی۔ ہم پر ان کا احترام لازم ہے۔ ہمیں آپ کی خواہش کا احساس ضرور ہے مگر ہم لوگ اس دائرے میں دوہری زندگی جیتے ہیں۔ اپنے لئے ہماری زندگی کی سمت مختلف ہے اور اپنے چاہنے والوں کے لیے ہم الگ نظریات رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم آپ کی اس خواہش کو' اس خواب کو تعبیر کا روپ نہیں دے سکتے۔ محسوس نہ کیجئے گا کہ ہم نے آپ کا دل توڑ دیا یا پھر آپ کو ہماری ذات سے مایوسی ہوئی' یقین کیجئے کہ ہم مجبور ہیں۔ بہت ہی مجبور۔ اگر آپ کا دل دکھے تو ازراہِ کرم ہمیں معاف فرما دیجئے گا......!"

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

یہ پیر حسن داد کی ذات کا یکطرفہ فیصلہ تھا۔ جس نے اس صبح کے اجالے میں زندگی کا رنگ بھرنے کے بجائے دکھ کے اندھیرے پھیلا دیئے تھے۔ شرع' شریعت اور احادیث نبوی کا دم بھرنے والے اور اپنے مریدوں' مریدنیوں کو اپنی گفتگو' اپنے کلام میں بارہا اس کا حوالہ دینے والے پیر حسن داد نے اپنی بے زبان بیوی اور بیٹی سے مشورہ کرنا تو درکنار پوچھنا تک گوارہ نہ کیا اور فیصلہ ہوگیا۔

امیدوں کا قافلہ مایوس اور نامراد لوٹ گیا۔

گہری شام وادی کے اطراف میں اتر آئی۔

اور اس گہری شام میں برستی آنکھوں کے ساتھ زیور نے دریائے نیلم کے کنارے بڑی چٹان پر اپنی ساری چوڑیاں توڑ دیں۔ اب وہ سہاگن کہلانا ہی نہ چاہتی تھی۔ زرینہ بیگم ان بہتے ہوئے آنسوؤں کی زبانی سب ہی کچھ سمجھ گئیں۔ بی جی کا دل بھی روتا رہا۔ لیکن کہیں کچھ نہ بدلا۔ شباب شاہ کی لاپروائی۔ محمد نبی کی بے اعتنائی' نگی بی کی طنزیہ نظریں اور پیر حسن داد کا اونچا چوبارہ اور اس میں بھی سجائی مریدوں اور مریدنیوں کی محفلیں' سب کچھ اسی طرح جاری وساری رہا۔ البتہ اس دنیا کے بھرے میلے میں زیور فضل الٰہی اور پرویز علی شاہ کی زندگی ہی بدل گئی۔

اس قدر طویل خزاں کے بعد جب بہار کی آمد ہوئی تو نگی بی کے خاص پیام بھجوانے پر ان کی چھوٹی ہمشیرہ کپور بانو اپنے فرزند ارجمند مولوی احمد حسن کے ساتھ آن وارد ہوئیں۔ موصوف کسی اعلیٰ دینی مکتبے سے فارغ التحصیل تھے اور پیر حسن داد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد انہوں نے اپنے نام کے ساتھ "حسن" کا لاحقہ لگا لیا تھا۔ اس طرح وہ پیر بابا کی نظروں میں مزید محترم ہو گئے تھے۔ یہ الگ بات کہ کپور بانو کی ساری زندگی بی جی سے کبھی نہ بنی۔ انہوں نے ہمیشہ انہیں بھابی کے بجائے دشمن ہی جانا۔ محمد نبی کی پیدائش کے بعد جب ان کی گود خالی رہی تو کپور بانو نے اپنی انتہائی کوشش کی کہ پیر حسن داد کسی بھی طرح دوسری شادی کرنے پر راضی ہو جائیں اور بی جی کی چھٹی کر دی جائے۔

زیور کی پیدائش عمل میں آئی تو بی جی کے قدم جم گئے اور کپور بانو کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ پھر جلد ہی شباب شاہ نے آ کر ان کے باقی ماندہ منصوبوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ پیر حسن داد کو اگرچہ اپنی بہن کے تیکھے تیوروں سے اختلاف تھا' تاہم وہ اپنے بہنوئی محمد شاہ کے بے حد مشکور تھے جن کی ذات گرامی نے کپور بانو جیسی آفت کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہ آزاد کشمیر کے محکمہ جنگلات میں آفیسر تھے اور پیر حسن داد خاں کے اونچے چوبارے اور پیر خانے کے لنگر کی لکڑی ان ہی کی مہربانی سے جلتی تھی۔ محمد شاہ شریف النفس انسان تھے لیکن ان کی نیک طبیعت کے بالکل برعکس کپور بانو کی تمام تر عادتیں مولوی احمد حسن اور ثریا بیگم میں سما گئی تھیں۔ اب اس پس منظر کے وہ سب لوگ زیور کی زندگی کی اس کشتی کے ناخدا بننا چاہتے تھے' جس پر کوئی سائبان نہ تھا۔

جب یہ سب کچھ طے ہو چکا۔ تو بی جی کو فقط مطلع کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ انہوں نے آنسوؤں کی زبانی زیور کو سب کچھ بتا دیا۔ بہن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تو شباب شاہ کو

طیش آ گیا۔ پیر خانے کے بالائی کمرے میں اس نے مریدوں کے جاتے ہی پیر حسن داد سے سوال کر ڈالا۔ "آپ نے زیور سے پوچھا ہے؟"

اپنے مریدوں کو شرع اور شریعت کا درس دینے والے پیر بابا نے تھکی ہوئی نظروں سے اپنی جوان اولاد کا تنا ہوا چہرہ دیکھا اور ان لمحات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی......!"

"کیوں؟" شباب شاہ نے پوچھا۔

"وہ میری بچی ہے۔ میرا اپنا خون ہے' مجھے اس پر اتنا زیادہ اعتماد ہے کہ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔"

"کیوں ضرورت محسوس نہیں کی آپ نے؟؟" شباب شاہ کا سوال تھا۔

ہر بات اور ہر کلام میں احادیث نبویؐ کا حوالہ دینے والے باپ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ پھر بھی ہمت کرتے ہوئے انہوں نے کہہ دیا۔ "میں اس بات کو ضروری نہیں سمجھتا۔"

"کیوں ضروری نہیں سمجھا آپ نے؟" شباب شاہ کی آواز اونچی تھی۔ "وہ آپ کی بیٹی ہے۔ درگاہ شریف کے چمن زار میں چرتی ہوئی کوئی بھیڑ بکری نہیں۔ وہ انسان ہے پیر بابا اور یاد رکھئے اس وقت آپ چوتھی صدی میں نہیں بیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔"

"شباب شاہ۔" پیر بابا نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ "بچیوں کو اپنے گھروں میں جانا پڑتا ہے۔ ہم کوئی غیر معمولی عمل تو سرانجام نہیں دے رہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ دستور زمانہ ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اگر آپ کو اپنے اردگرد جمع ہونے والے ہجوم سے فرصت ملے تو ازراہ کرم اپنی بیٹی سے یہ ضرور پوچھ لیجئے گا کہ اس کی آنکھ کے آنسو بھلا کیا کہتے ہیں؟"

"شباب شاہ۔" پیر بابا کی آواز بہت مدھم تھی۔ "طیش میں نہ آ میرے بچے...... میں ایک اچھا فیصلہ کر رہا ہوں۔"

"جی ہاں۔ آپ کا فیصلہ درست اور بہتر ہی سہی۔" شباب شاہ نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ یاد رکھیے گا اگر کبھی کسی بھی جگہ احمد حسن کی طرف سے کوئی بھی زیادتی ہوئی تو وحشت کے

کسی بھی عمل سے میں اپنے آپ کو روک نہیں سکوں گا۔" اپنے باپ کا جواب سنے بغیر ہی شباب شاہ باہر نکل گیا۔

اس لمحے...... پیر خانے کے اونچے چوبارے کی چولیں ہل گئیں۔ مگر فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ کپور بانو کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اب بی جی سے بدلہ لینے کا عزم بیدار ہو چکا تھا۔ بی جی گنہگار تو نہ تھیں فقط ان انجانی خطاؤں کی ماری ہوئی تھیں جو کبھی ان سے سرزد ہوئی ہی نہ تھیں۔ وہ خوش نہ تھیں، مگر خاموش تھیں ہمیشہ ان کی اس خاموشی کو ان کی رضا سمجھ کر تسلیم کیا گیا تھا اور اب کی بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

یادوں کا سمندر موجزن رہا۔ بہت سا وقت بیت گیا اور...... چھم چھم برستی اکھیاں بابل کی دہلیز سے رخصت ہو گئیں۔ ہاتھوں پر مہندی لگنے سے پہلے اس نے ملکہ بھابی کی طرف ایک طویل جذباتی خط لکھا۔ رزاق حویلیاں جا رہا تھا۔ اس نے ملکہ بھابی تک یہ خط پہنچایا، جس میں انہیں بھی یہ دعوت دی گئی تھی کہ خدارا وہ اس وداعی موقع پر ضرور آئیں تاکہ یادوں کا یہ سفر آسان ہو جائے۔ جواب میں یہ مژدہ سننے میں آیا کہ نیلوفر کی واپسی ہو چکی ہے اور وہ بھی آنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ جب یہ سب لوگ آئے تو ادھر زیور فضل الٰہی کی زندگی بدل چکی تھی۔ سب کچھ ہی بخیر و خوبی طے پا گیا تھا۔ کپور بانو اور مولوی احمد حسن جیت چکے تھے اور پرویز علی شاہ نے ایک عدد چمکتا دمکتا ہوا ہار زیور بیگم کی خدمت میں پیش کر کے خدا جانے کیا ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

دل کے شہر پناہ میں بسنے والے سب قافلے جب رخصت ہو چکے تو یادوں کی آندھی اس شب بڑے زور سے چلی اور شہر دل میں نصب شدہ آرزوؤں کے تمام خیمے اڑا کر لے گئی۔ اب دل کا میدان تھا، جس میں احمد حسن نے بڑی آسانی سے نقب لگا کر ایک درد کی فصیل کھڑی کر دی تھی۔

جب سویرے کی دھوپ بھی اپنی سمت بدل کر اونچے چوبارے کی چھت تک پہنچ گئی تو مولوی احمد حسن کپور بانو کے ساتھ زیور بیگم کو لینے کے لیے آ گئے۔ سہ پہر ڈھل کر اب شام کا روپ دھارنے والی تھی۔ چوڑی ڈیوڑھی کے اندر کھلے صحن میں نکی بی جی اور کپور بانو سر جوڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں اور موضوع خاص اس وقت صرف بی جی کی ذات شریف تھی۔ جس میں دنیا جہان کی برائیاں جمع ہو چکی تھیں۔ باقی سارا جگ اچھا تھا۔ مولوی احمد حسن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر موقع غنیمت جان کر اندر زیور کے کمرے میں آ گئے۔ اونچے پلنگ پر بیٹھی زیور کے گورے گورے پیروں پر نظر پڑتے ہی ان کے

ان دیکھے جذبوں میں شدت پیدا ہو گئی اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کے مسکراتے ہوئے لبوں سے صدا نکلی۔

"چلنے کی تیاری کیجئے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

زیور نے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ نیلوفر جاتے جاتے یہ فرمان بھی جاری کر گئی تھی کہ "تم لاکھ کوشش کرو، مرد کی شخصیت میں چھپے ہوئے تضاد کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ جب وہ محبوب کہلاتا ہے تو بہت مہربان ہوتا ہے لیکن جب شوہر بنتا ہے تو نامہربانی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔"

چلنے سے پہلے اس نے اجازت طلب کی۔ "میں جانے سے پہلے درگاہ شریف تک جانا چاہتی ہوں۔ بابا کے مزار پر حاضری دینا ضروری ہے۔"

مولوی احمد حسن خاموش رہے جبکہ کپور بانو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "چلی جاؤ، مگر جلدی لوٹ آنا۔ آج کل فائرنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ اندھیرا ہو جائے گا تو گاڑی کی بتی بھی جلائی نہیں جا سکتی۔" پھر انہوں نے نکی بی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کل سے آئی بیٹھی ہے۔ پہلے جا کر ہو آتی تو بھلا کیا تھا؟" نکی بی کچھ زیر لب بڑبڑائیں، مگر کوئی کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ آخر ان کا اظہار مدعا کیا ہے؟؟

اجازت پا کر زیور باہر چلی آئی۔ پیر خانے سے لے کر چوڑی ڈیوڑھی اور اونچے چوبارے سے نشیب کی جانب بہنے والے دریائے نیلم تک ہر چیز ویسی ہی تھی۔ وادی میں شام قریب تر تھی۔ اونچے درختوں کے سائے سمٹ چکے تھے۔ درگاہ شریف کا سنہری گنبد جاتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اندر مزار کے سرہانے جلتا ہوا دیا اس دم خاموش تھا۔ پتھریلی روش پر اپنا سفر طے کرتے ہوئے وہ درگاہ شریف کی بیرونی دیوار تک چلی آئی۔

اچانک فضا میں رباب کی دلکش موسیقی گونج اٹھی اور ہر شے ہر منظر پر اس کا اثر نمایاں نظر آنے لگا۔ اس نے دکھی دل اور حیران نگاہوں سے اس سمت دیکھا۔ درخت کے ڈھلتے سائے تلے رزاق بیٹھا تھا۔ رباب کے تاروں پر اس کی انگلیوں کی جنبش دل کش موسیقی کا روپ دھار کر فضا میں بکھر رہی تھی اور وہ بڑی مستی کے عالم میں اپنی ہی دنیا میں گم گا رہا تھا۔

آ گئی یاد شام ڈھلتے ہی
بجھ گیا دل چراغ جلتے ہی
کھل گئے شہر غم کے دروازے

اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی
کون تھا تو کہ پھر نہ دیکھا تجھے
مٹ گیا خواب آنکھ ملتے ہی

آخری مصرع اس نے بار بار دہرایا اور زیور ساکت بت کی طرح کھڑی رہی۔ رزاق نے اپنا دکھ اپنی زبانی وادی میں بکھیرا اور رباب اپنی بغل میں دبائے پیر خانے کی طرف چلا گیا۔

شام گہری اور سنسان ہوگئی اور مزار پر خلیفہ قربان نے دیا روشن کر دیا۔ جلتی آنچ کی مدھم روشنی درگاہ شریف کی چھوٹی کھڑکی سے باہر تک چلی آئی اور پھر ہوا کے مدھم جھونکے سے پھڑپھڑانے لگی۔

"شاہ جی۔" شباب کی پیار بھری آواز ابھری۔ "آپ تو یہاں کھڑی ہیں جبکہ مولوی احمد حسن غصے کے عالم میں اپنی ماں کے ساتھ واپس بھی چلا گیا۔ بی جی بہت پریشان ہیں۔"

زیور نے پلٹ کر نم آنکھوں سے اپنے پیارے ماں جائے کو دیکھا اور ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

"شبو۔" وہ بے قرار ہو کر بھائی کے کندھے کا سہارا لئے رو پڑی۔ "میں کیا کروں۔" اس کی آواز میں بے بسی کا تاثر نمایاں تھا۔

شباب شاہ اس سوال پر طنزیہ مسکرایا اور پھر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "بس صرف دو ہی راستے ہیں۔ سمجھوتہ یا پھر بغاوت۔ اب کس راستے کا انتخاب آپ کر سکتی ہیں' اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔"

"اب کیسی بغاوت؟" زیور نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "فیصلہ ہو چکا اور راستے کے ساتھ منزل کا تعین بھی کر دیا گیا۔"

"تو آؤ پھر لوٹ چلیں۔" شباب شاہ نے کہا۔ "مگر ایک بات بتا دوں۔ آج اس لمحے کے بعد اگر میں نے تمہیں دکھی یا اداس دیکھا یا پھر تمہاری آنکھوں میں آنسو آئے تو پھر تمہاری زندگی کے بارے میں آخری فیصلہ میرا ہوگا۔"

اس کا لہجہ مضبوط تھا اور آواز بے حد بھاری۔ اپنے جذبات اور احساسات کو خود ہی کنٹرول کرنے کی کوشش میں بہن کا دکھ جان کر اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مولوی احمد حسن اور

کپور بانو کس حد تک پارسا اور نیک صفت انسان ہیں۔ احمد حسن کی ذات سے آگاہی تو بچپن کی بات تھی۔ محمد شاہ کی اولاد میں جو درندہ چھپا ہوا تھا' اسے وہ بہ خوبی جانتا تھا۔ اس کے لہجے کی برتی ہوئی وحشت کا احساس کرتے ہوئے زیور خاموش ہوگئی۔ جانتی تھی کہ شباب شاہ کس فطرت کا مالک ہے۔ سو اس نے سوچ لیا کہ آج کے بعد خاموشی ہی زندگی کا مقدر رہے گی۔ زبان پر پڑے ہوئے قفل کبھی نہ ٹوٹیں گے۔ پرویز علی شاہ کی یاد مدھم آنچ کا دیا بن کر دل کے نہاں خانوں میں جلتی رہے گی۔ لیکن آنکھ کبھی نم نہ ہوگی۔ یہ زیور کا خود اپنی ذات سے وعدہ تھا' جسے اس نے پورا کر دکھایا......! حالانکہ وہ رات عذابوں میں کٹ گئی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے شباب شاہ پیر بابا کی ہدایت پر اسے چھوڑنے چلا آیا۔ سہمے ہوئے قدموں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ سسرال میں یوں داخل ہوئی جس طرح سزائے موت کا حکم سننے کے بعد قیدی کال کوٹھڑی میں جاتا ہے۔

کپور بانو نے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

مولوی احمد حسن کا پہلا ردعمل ایک ہلکی سی دانستہ مسکراہٹ تھی' مگر شباب شاہ پر نظر پڑتے ہی ان کے ماتھے پر روایتی بل نمودار ہوگئے۔ ثریا بیگم نے کسی قدر صدقے واری ہونے کی اداکاری کی' مگر اپنی کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ شباب شاہ صحن میں کھڑے کھڑے رخصت ہوگیا اور دو آنسو اپنے دامن میں سمیٹ کر زیور اپنے کمرے میں آگئی۔ احمد حسن نے اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی' مگر اماں کی زوردار گرج نے ان کے قدم روک دیئے۔

"تو کہاں جا رہا ہے بھولے بادشاہ۔" وہ تقریباً چلا کر بولیں۔ "جماعت خانے سے تیرا بلاوا آیا ہے۔ جلدی چلا جا اور پھر دوپہر تک لوٹ آنا۔ باغ جمیری والوں کو زیادہ سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ کل شام کی بے عزتی بھول گیا' اتنی جلدی تو۔" اپنے میکے والوں کو وہ ہمیشہ "باغ جمیری والے' کہہ کر پکارتی تھیں۔ مولوی احمد حسن کے قدم اس آواز پر پلٹ گئے۔

ایک انجانی' ان دیکھی سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور چاروں سمت کھلے اس محاذ کے اندر زیور کی ذات تنہا تھی۔ اندھیرے کمرے میں وحشت کا سماں تو تب اترا' جب چوتھی کی دلہن پر کپور بانو کی ذات ظالم آسمان بن کر برسی۔ احمد حسن کے جاتے ہی وہ آن وارد ہوئیں اور انہوں نے روایتی انداز میں ہاتھ نچا کر پوچھا۔

"کل شام تو کس یار سے ملنے دفع ہو گئی تھی؟"

زیور نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ان کا انداز کسی جلاد سے کم نہ تھا۔ جواب میں خاموشی کا صبر پا کر انہوں نے حکم صادر فرمایا۔

"باہر نکل کر چولہا چوکا سنبھال' بہت ہو چکا دلہن بننے کا نخرہ۔"

اپنے غصے کے مزید ردعمل کے طور پر انہوں نے پلٹ کر دروازے کے پٹ کو زور سے بند کیا اور باہر نکل گئیں۔ جبھی ثریا بیگم اندر آ گئیں اور انہوں نے ارشاد فرمایا۔

"بھائی کہہ گئے ہیں۔ آج سے کھانا آپ پکائیں گی۔"

پھر انہوں نے طنزیہ طور پر تیر چلایا۔ "لگتا ہے' وہ زندگی میں کوئی بڑی زبردست تبدیلی چاہتے ہیں۔ خیر سے نمازیں تو قضا ہونا شروع ہو گئی ہیں۔"

زندگی میں جب یہ تبدیلی رونما ہو ہی گئی تو ماسوائے سمجھوتے کے اور کوئی راستہ باقی ہی نہ رہا۔

سرشام جب دسترخوان سج گیا تو جماعت خانے سے مولوی احمد حسن کی واپسی ہوئی۔ بڑے کمرے میں طعام کے لیے سب افراد آن موجود ہوئے اور محمد شاہ کی آمد کے بغیر ہی کھانا شروع کر دیا گیا۔ ثریا بیگم نے اپنی بیٹی کو اس پیغام کے ساتھ روانہ کیا کہ "نانا جان تشریف لائیں۔" تو کپور بیگم کے ماتھے پر خواہ مخواہ کے بل نمودار ہو گئے۔

محمد شاہ نے کمرے میں داخل ہو کر جب زیور کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا تو یہ بل دوگنے ہو گئے۔ اب قدرے تعریفی کلمات کے ساتھ کھانا شروع تھا۔ احمد حسن کا انداز دبا دبا سا تھا۔ اماں کے سامنے زیور کو کھل کر داد بھی نہ دے سکتے تھے۔ اپنی پلیٹ سے اپنے نصیبوں کے لقمے چنتی ہوئی زیور کی زبان خاموش تھی۔ وہ احمد حسن کی طرف جھکی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں اپنائے گئے عام رویے کے مطابق اس وقت بھی اس کا انداز بے صبری کا تھا۔ بڑی سی طشتری نما پلیٹ میں ہر طرف ہاتھ مارتے ہوئے بڑے بڑے لقمے اِدھر اُدھر گرنے کی پروا کیے بغیر وہ اپنے معدے میں انڈیل رہا تھا۔ ہر مرتبہ اپنے دائیں ہاتھ سے وہ باقی ماندہ غذا کو نیچے گرا رہا تھا اور سامنے پڑے ہوئے مخروطی قد کے طویل گلاس پر چکنائی زدہ انگلیوں کے نشان نمایاں تھے۔ جب زندگی میں یہ منظر سامنے آیا تو ذہن کے پردے پر گزری ہوئی شاموں کا عکس اتر آیا۔

کس قدر سلیقے سے ملکہ بھابی کے ہاں کھانا کھایا جاتا تھا۔ ہر بار جب نظریں غیر ارادی طور پر

پرویز علی شاہ کی طرف اٹھ جاتیں تو کتنا بھلا سا احساس ہوتا تھا۔ چینی کی نفیس پلیٹ کے ایک سرے پر ڈالا گیا انتہائی کم مقدار میں سالن اور بائیں ہاتھ میں پکڑا گیا کانٹا اور دائیں ہاتھ میں مختصر سائز کا روٹی کا ٹکڑا۔ وہ بے حد کم خوراک تھا۔ کھانے کے دوران یا پھر بعد میں پانی کے صرف چند گھونٹ لیتا اور وہ بھی بغیر کسی آواز اور کھنکناہٹ کے۔ کھانے کے دوران گفتگو سے اجتناب برتتا اور اپنی بجائے دوسروں کو کھانا پیش کرنے میں خوشی محسوس کرتا۔ اکثر یہ مکالمے سننے میں آتے۔

"آپ لیجیے۔"

"یہ ڈش آپ نے بنائی ہے؟"

"آپ واقعی کمال کی کک ماسٹر ہیں۔" وکی اکثر کہتا۔

"آپ نے تو ہماری عادتیں خراب کر دیں۔"

زیور کچھ نہ بولتی۔ فقط زیرلب مسکرا کر رہ جاتی اور "شکر الحمدللہ" کے کلمے کے ساتھ یہ خوشگوار محفل تمام ہو جاتی۔ لیکن اب تو وقت کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔

اس خواب کا سحر ٹوٹا تو مولوی احمد بہ آواز بلند ڈکار کا اخراج فرمانے کے بعد شکرانے کے کلمات ادا کر رہے تھے۔ دسترخوان پر میدان حشر کا سماں بکھر چکا تھا۔ بچا ہوا طعام اور جھوٹے برتن عجب کراہت زدہ منظر پیش کر رہے تھے۔ زیور کمرے سے باہر آنے لگی تو محمد شاہ نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"صبر سے رہنا بیٹی۔" اس وقت زیور پر اس خاندان کے سربراہ کی اس قدر بے بسی کے تمام راز کھل گئے۔

جہاں زندگی مار دھاڑ کا سا انداز لیے جیتی ہے' وہاں انسان بھلا کس طرح کے بستے ہیں؟ یہ تو پھر وہی جانتے ہیں۔ جو گزارہ کرتے ہیں۔ مولوی احمد حسن کی طرف سے ازدواجی زندگی کا پہلا حکم نامہ نقاب اوڑھنے کی صورت میں سامنے آیا۔ چادر کا طویل پلو چوڑے آنچل اور ڈھکے ہوئے باوقار سراپے بھی اس علاقے کی روایات تھے۔ مگر جو جنونی انداز میں جیتے ہیں' وہ اپنی زندگی کے لیے خودساختہ اصول خود وضع کرتے ہیں۔ نقاب کے لبادے میں زیور کی ذات چھپ گئی۔ وہ صرف پرویز علی شاہ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پہلا برس بیت گیا۔ بہار سے خزاں اور خزاں سے دوبارہ بہار کی آمد تک عذابوں کے سارے

موسم دل پر گزر گئے۔ احمد حسن نے پیار کیا' نہ محبت دی۔ فقط فرائض کی ادائیگی پر اکتفا کرتے رہے۔ جماعت خانے اور مدرسے کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ کپور بانو کے حکم کی تعمیل بھی بجالاتے۔ زیور نے محسوس کیا کہ اس کی کم گوئی اور اداسی کے پیش نظر شک کا ایک کالا ناگ احمد حسن کی ذات کے اندر بھی تلملانے لگا ہے۔ اکثر بھی کسی وقت کسی جذباتی لمحے میں وہ زیور سے ایک سوال کرنے لگا۔ ''سچ بتایئے' اس شام آپ کہاں چلی گئی تھیں؟''

اپنے طور پر تو اس سوال کا جواب دیتے دیتے وہ تھک گئی۔ نڈھال ہوگئی' مگر کسی بھی طرح مولوی احمد حسن کو مطمئن نہ کرسکی۔ کہ یہ امر بلاشبہ بہت ہی مشکل تھا۔

''میں درگاہ شریف گئی تھی۔'' وہ معصوم لہجے میں جواب دیتی۔ ''رزاق کی درد بھری آواز نے میرے قدم روک لئے۔'' اور اس کے ساتھ ہی دل کی پکار ایک ہوک بن کر اٹھتی۔

کون تھا تو کہ پھر نہ دیکھا تجھے
مٹ گیا خواب آنکھ ملتے ہی

''مگر آپ نے اتنی دیر لگا دی؟'' مولوی احمد حسن کی شاکی نظریں وجود کے اندر اتر جاتیں۔

''ہاں دیر تو بہت ہوگئی احمد حسن۔'' زیور کی زبان خاموش رہتی' مگر دل بولتا۔ ''اتنی زیادہ دیر کہ میری اپنی زندگی میرے اپنے ہاتھوں سے نکل گئی اور زمانے کو خبر ہی نہ ہوسکی کہ عشق کے اس شہر بھنبھور کی سسی بے چاری کس جگہ' کہاں اور کس طرح بے خبری میں ماری گئی۔''

یہ جذباتی لمحات ہرگز طول نہ پکڑ سکتے تھے' چونکہ یہ اپنی معراج تک پہنچنے سے پہلے ہی کپور بانو کی کرخت زدہ آواز کی نذر ہوجاتے۔

سوا سال گزر جانے کے بعد باغ جمیری والوں کی بیٹی کی طرف سے ''وارث'' عطا نہ کرنے کا ناکردہ گناہ اس قدر شدید تھا کہ وہ احمد حسن کو مزید وقت دینے کے بالکل حق میں نہ تھیں۔ اب موضوع سخن ''اولاد'' تھا اور مولوی احمد حسن کا وہ اکلوتا پن بھی جس کے تحت شدید خدشہ یہ تھا کہ اگر اولاد کی نعمت عطا نہ ہوسکی تو یہ قدرت کی رضا نہیں' بلکہ زیور کا گناہ ہوگا۔ جس کے نتیجے میں اگر مولوی احمد حسن ''بے نام'' دنیا سے چلے گئے تو خدانخواستہ درگاہ شریف کی تاریخ ہی بدل جائے گی۔ باغ جمیری والوں کا جھنڈا تو ویسے بھی اونچا ہی رہے گا کہ وہاں پیری مریدی وراثت میں چلتی آئی تھی۔ البتہ محمد شاہ کے خاندان کا نام ونشان باقی نہ رہنے کا شدید خطرہ تھا۔

جب یہ موضوع زبان زدعام ہونے لگا اور آنے جانے والیوں کو کپور بانو نے اشاروں کنایوں کے علاوہ اپنے آنسوؤں کی زبانی بھی اپنے اس دکھ کے بارے میں بتانا شروع کردیا تو جماعت خانے اور مدرسے کے سربراہ کی حیثیت سے مولوی احمد حسن کے لیے تبلیغی جماعت کا وہ دعوت نامہ آیا جو ہر دو برس بعد آیا کرتا تھا۔ اس اجتماع میں خواتین کے لیے بھی دعوت تھی۔ پیارے وطن کے صوبہ سرحد کے ساتھ اس علاقے کے میل کی وجہ سے یہ اجتماع چترال میں منعقد ہوا کرتا اور دین اسلام کے پھیلاؤ کے جذبے سے سرشار ہر مکتبہ فکر کے لوگ اس دینی اجتماع میں شرکت فرماتے۔ مذہبی سکالر اور رہنما بھی شریک ہوتے۔ ان میں سے کچھ تو بلاشبہ مخلص تھے اور کچھ کا کردار مولوی احمد حسن جیسا تھا کہ قول وفعل کے تضاد نے خود ان کے اندر کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔

جب یہ دعوت نامہ موصول ہوا تو خدا جانے مولوی احمد حسن کے دل میں کیا سمائی کہ وہ زیور کو بھی ساتھ لے جانے پر مصر ہوگئے۔ کپور بانو نے پہلے تو انتہائی مخالفت کی۔ پھر ایک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ زیور کی غیر موجودگی میں وہ اپنے بعض ارادوں کو بخیروخوبی عملی جامہ پہنا سکتی تھیں۔ انتظار کرنا تو ان کی سرشت میں شامل نہ تھا۔ اب وہ احمد حسن کے لیے کوئی ''لڑکی'' دیکھنا چاہتی تھیں۔ لہٰذا زیور کی عدم موجودگی میں اس پروگرام پر عملدرآمد کرنا آسان تھا۔ لہٰذا کوئی بھی رکاوٹ نہ ڈالی گئی۔ جماعت خانے کی خواتین کا ایک گروپ بھی اس تبلیغی مشن پر جارہا تھا۔ چنانچہ تیاری مکمل ہوگئی۔

حکم کی تعمیل کے لیے زیور نے بھی لبیک کہا اور نقاب کا پردہ اوڑھ کر سفر جاری کیا گیا۔ اتنے طویل سفر میں مولوی احمد حسن کے ساتھ بیٹھے ہوئے اجنبیت کا احساس طاری رہا۔ وہ ہم سفر بے حد یاد آئے۔ جو اگرچہ کچھ نہ تھے۔ ان سے کوئی بھی رشتہ نہ تھا۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے تھے۔

* * *

وہی راستہ تھا اور وہی نظارے۔ لیکن وقت کتنا بدل چکا تھا کہ اب وہ ساتھ نہ تھے۔ وہ جو بہت اچھے بہت پیارے اور معصوم لوگ تھے۔ محبت کرنے والے' خوشیاں بانٹنے والے' دوسروں کو زندگی کی خوشیاں عطا کر کے ان کے دکھ اپنی ذات میں سمیٹ لینے کا حوصلہ رکھنے والے کتنے عظیم لوگ تھے۔ لیکن زیور کی زندگی ان سے بچھڑ چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ سب کے ساتھ تھی۔ سب کے درمیان تھی۔ مگر وہ تنہا تھی۔ بھلا یہ کیسا تضاد تھا؟؟ انسانوں کے درمیان' اپنوں کے درمیان کہ ان اپنوں کے درمیان بھی زندگی اجنبی تھی اور ان بیگانوں نے بیگانے ہوتے ہوئے بھی زندگی کو جیت لیا تھا۔

اس وقت تو کچھ آنسو بھی ہم سفر تھے' جنہوں نے نقاب کے اندر ہی سے اپنے اظہار کے لیے راہ بنا لی تھی۔ مولوی احمد حسن اس وقت زیور کی دنیا کا مالک تو ضرور تھا مگر دل کے اندر برستی اس بارش کو نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی محسوس کر سکتا تھا۔

زندگی کے اس بھرے میلے میں بعض مسافر کسی چلتے ہوئے قافلے سے اس طرح بھی تو بچھڑ جایا کرتے ہیں۔ جدائیاں ایسی بھی تو ہوتی ہیں' جیسی زیور کی زندگی میں تھیں۔ طویل' بامعنی اور خاموش۔

اس وقت بھی خاموشی مقدر تھی اور اُس وقت بھی۔ جب ایک اجنبی چہرے سے سوال کیا گیا تھا۔ ''آپ کون ہیں؟'' پھر اس چہرے نے زندگی کا نصیب بننا چاہا' مگر بن نہ سکا۔ کہ ایسے مقدر ہی نہ تھے اور جو نصیب بنا' وہ اپنا نہ بن سکا۔ دنیا کی نظروں میں دین کی رُو سے اعلیٰ ترین معراج پا کر بھی اجنبی ہی رہا۔ اس لئے کہ یہ دین کی دنیا کا نہیں بلکہ دل کی دنیا کا فیصلہ تھا۔

یہ یادیں دل کی دنیا میں آباد تھیں۔ آج کے اس سفر میں وہ ہار بھی گلے کا ہمسفر تھا' جو دل کی

صلیب پر جھول جانے کی خوشی میں پرویز علی شاہ نے ارسال کیا تھا اور وہ انگوٹھیاں بھی جو انگشت شہادت پر جمی ہر وقت زندگی کے قریب رہتیں۔ اونچے پہاڑوں پر جمے بلند و بالا درختوں اور سبزے کے ساتھ قدرتی جھرنوں سے سجے ہوئے بڑا سی کے سارے موڑ گزر گئے۔ اس سفر کے ایک دن میں بیتے ہوئے کئی پل سامنے آ گئے اور سفر مکمل ہو گیا۔

پشاور سے چترال تک کے ہوائی سفر کی پرواز حسب روایت نارمل تھی۔ بلکہ ہمیشہ کی طرح زبردست ''ایرپاکٹس'' کے سبب کئی ایک مسافروں کی خرابیِ طبیعت کا باعث بنی۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے اندر غموں کی دنیا بسائے ہوئے اپنی زندگی کے احساسات سے عاری تھے۔ خاموش بیٹھے رہے۔ بالکل زیور فضل الٰہی کی ذات کی طرح۔ جو بظاہر تو مطمئن اور خاموش تھی' مگر اندر کی دنیا میں ایک آتش فشاں' کیسا لاوا ہر سمت بکھیر رہا تھا۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا' مولوی احمد حسن بھی نہیں۔

چترال سے آگے چھبیس کلومیٹر دور دروش کے مقام پر اس قافلے کا پڑاؤ پڑا تھا۔ ہوائی اڈے سے آگے تک کا یہ سفر بذریعہ جیپ طے کیا گیا۔ اس سفر کی تھکاوٹ بھی دیدنی تھی۔ یہاں ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس کے علاوہ جماعت والوں نے فوجی میس میں قیام کا انتظام کر رکھا تھا۔ اپنے علاقے کے جماعت خانے کے امیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے مولوی احمد حسن کو خاص طور پر الگ کمرہ دیا گیا۔ تھکاوٹ سے بے حال زیور کمرے میں داخل ہوتے ہی چونک اٹھی۔ کمرے کی فضا بے حد مانوس تھی۔ لگتا تھا کوئی بہت ہی اپنا بہت ہی پیارا یہاں سے ابھی کوچ کر گیا ہے۔ ایک مانوس سی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس فضا میں آتے ہی بے چینی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ باہر برآمدے میں ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ شاید ویٹر نے دروازے پر دستک دی تھی کہ اس کے فوراً بعد ہی احمد حسن چائے کی ٹرے تھامے ہوئے اس کے قریب آ چکے تھے۔

''آپ نے ہماری خاطر بہت طویل سفر طے کیا۔'' وہ بڑے نازک احساسات کو اپنے اوپر حاوی کرنے کی کوشش میں کہہ رہے تھے۔ ''بہت تھک چکی ہوں گی۔ چائے پی کر آرام کیجئے۔ ہم امام صاحب سے مل کر ابھی آتے ہیں۔''

احمد حسن کی واپسی تک ساری دنیا سو چکی تھی۔ اپنے دکھوں کو اپنے کلیجے سے لگائے ہوئے سرخ نگینے والی انگوٹھی والا دایاں ہاتھ اپنے گال کے نیچے رکھے ہوئے زیور اس وقت نیند کی آغوش میں تھی۔ بالکل کسی معصوم بچے کی مانند' جو چاند کو چھو لینے کی ضد میں ناکامی کے بعد روتے روتے سو

گیا ہو۔ احمد حسن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کسی انجانی فتح کے احساس سے ان کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

صبح بے حد روشن اور خوشگوار تھی۔ دروش کی وادی میں ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی تھی۔ مگر زیور کے دل کے اندر وہ الاؤ روشن تھا' جس میں اَن دیکھے اَن جانے جذبے سلگ سلگ کر زندگی کو ایک جلتی ہوئی آنچ کا احساس عطا کر چکے تھے۔ برآمدے میں آوازیں زندگی کے روپ میں زندہ تھیں۔ احمد حسن بھی باہر کسی سے محوِ گفتگو تھے۔ زیور کی آنکھ کھلی۔ فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی۔ دل ہی دل میں افسوس لئے وہ کھڑکی کے قریب چلی آئی۔ باہر قدرت کے تمام نظارے روشن تھے۔ بہت دور اونچی بلند و بالا چوٹیاں برف سے اپنا وجود ڈھک کر سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ درخت' سبزہ اور روشنی زندگی اور خوشحالی کی علامت دکھائی دے رہے تھے۔

"میرا وطن کس قدر خوبصورت ہے۔" یک دم دل کی آواز اس کے لبوں تک آ گئی۔ "مگر کس قدر ناقدرے لوگ ہیں ہم بھی' اس خطہ زمین کی قدر ہی نہ جانی۔ اسے اپنا ہی نہ سمجھا۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی کبھی دین' کبھی سیاست' کبھی کسی مذہب' کبھی زبان اور کبھی تیسری دنیا کے نام پر اس سے دھوکہ کرتے رہے۔ عظیم ہیں' یہ دلکش نظارے جنہوں نے اتنے دھوکے کھا کر بھی ہم سے بے وفائی نہیں کی۔" وطن کے اس دکھ پر بھی آج کی صبح دو آنسو زیور کی آنکھوں کا مقدر بن گئے۔

"آپ کو محتاط رہنا پڑے گا۔" کمرے کے اندر آتے ہوئے مولوی احمد حسن کہہ رہے تھے۔

"کھڑکی سے باہر آپ کا چہرہ بخوبی نظر آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دین کا یہ اجتماع اپنا ہی سہی مگر پھر بھی نامحرم ہیں' یہ سارے لوگ۔" اس وقت احمد حسن کی تیوری پر پڑے ہوئے بل یہ احساس دلا رہے تھے کہ اس غصے کا محور شاید کچھ اور ہے۔ مگر شوہر ہونے کے ناطے اس کی دنیا میں بیوی ہی وہ بنیادی نقطہ تھی جس پر اس محور کے گرد گھومنے والی ہر خلاف مزاج بات کا نزلہ گر سکتا تھا۔ زیور کے لب خاموش رہے۔ مگر دل پوری شدت سے چلا اٹھا۔

"تم بھلا کیا جانو۔ مولوی احمد حسن' دل کی دنیا میں بسنے والے کچھ لوگ نامحرم نہیں ہوتے۔ اس مانوس مگر انجانی فضا میں یہ آنکھیں کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟ یہ تم نہیں جان سکتے اور اگر کبھی جان بھی گئے تو تم دین کے کسی ستون کو پکڑ کر میری زندگی کی عمارت کو ہلا سکتے ہو۔ یہ بات مجھے اچھی معلوم ہے۔"

دروش کی وادی میں یہ اجتماع شام ڈھلے تمام ہوا۔ ڈاکٹر ہاشمی کی تقریر موضوعِ سخن تھی' جس میں سیاست کا عنصر نمایاں تھا۔ چونکہ اپنے آئندہ پروگرام میں وہ دین کی آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے اسمبلی کی سیٹ تک پہنچنے کا پکا پروگرام بنا چکے تھے جبکہ شام کے بعد ہی ان کی اہلیہ محترمہ ماہ جبین افضل صاحبہ خواتین کی محفل میں درس دیتے ہوئے فرما رہی تھیں۔

"دین میں خاموشی رضامندی کے اظہار کا بہترین طریقہ سہی لیکن یہ جبر تو کہیں نہیں کہ ہر بار خاموشی کو دنیوی معنوں میں رضامندی ہی سمجھ لیا جائے۔ عورت کو اپنی زبان سے اظہار کی قوت عطا کی گئی ہے اور یہ اظہار عمل میں آنا چاہئے۔ یاد رکھئے۔ ہمارے مذہب میں زبردستی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس میں تو دلوں کے فیصلے اور نیتوں کی رضا شامل ہے۔"

زیور کا دل یہ سب کچھ سن کر اپنی زندگی کے تضاد پر روتا رہا۔ اس انتہائی متاثر کن اجتماع کے یہ دو دن بہت جلدی گزر گئے۔ تیسرے دن جب اس قافلے کے سفر کا آغاز ہوا تو دروش کا آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وادی میں سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کسی انجانے المیے پر نوحہ کناں تھی۔ جیپ کا سفر تمام ہوا اور وہ لوگ ایئرپورٹ پر آن رکے۔ جہاں یہ مایوس کن اعلان منتظر تھا کہ بے حد گہرے بادلوں کے باعث آج تو پرواز ممکن ہی نہیں۔ کل تک موسم صاف ہونے کا انتظار کیا جائے۔ صلاح مشورے کے بعد سب لوگ اِدھر اُدھر کے مقامی چھوٹے ہوٹلوں میں منتقل ہو گئے۔

کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ مولوی احمد حسن ٹرے تھامے اندر آ گئے۔ زیور کے سامنے ٹرے رکھنے کے بعد انہوں نے اطلاع دی۔ "میں امام صاحب کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔" زیور کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار کئے بغیر ہی وہ باہر نکل گئے۔

زیور نے اٹھ کر بغلی غسل خانے میں ہاتھ دھونا چاہے' اور پھر یک دم وہ بری طرح سے چونک گئی۔ اس کی انگشت شہادت دونوں انگوٹھیوں سے خالی تھی۔ بڑے ہی طویل عرصے کے بعد وہ پرویز علی شاہ کی نشانی کہیں بھول آئی تھی۔ وہ بے چین و بے تاب ہو گئی۔ کھانے کی ٹرے دھری کی دھری رہ گئی اور وہ پریشان و اداس بیٹھی سوچتی رہی۔ آخرکار اس احساس کا کون سا نقطہ یادوں کی بساط سے باہر ہو چلا تھا کہ دروش سے چترال تک کے سفر میں اسے اپنی خالی انگلیوں کا احساس ہی نہ ہو سکا؟؟

ذہن نے یا پھر دل نے آخر کس جگہ مات کھائی تھی؟؟ وہ متاعِ عزیز...... جو دل و جان سے بھی قریب تر تھی۔ یادوں کی کن بھول بھلیوں میں کھو گئی؟ ایسا ہونا ممکن تو نہ تھا اور ایسا ہونا بھی نہ چاہئے تھا کہ وہ ہار بھی تو عام طور پر گلے کی زینت بنا رہتا۔ جو کانٹوں کی صورت میں پرو کر کسی ناکردہ جرم کے صلے میں عطا کیا تھا۔ انگشتِ شہادت کی انگوٹھیاں تو بڑی خوشگوار یاد تھی۔ بھلا کس طرح آج وہ اپنی زندگی کے بیتے ہوئے خوشگوار لمحات کی اس خوبصورت نشانی کو بھول گئی؟ آج اپنی ہی یادوں کے کٹہرے میں اپنے ہی دل کے سامنے وہ مجرم بنی کھڑی تھی۔ اس دل کی عدالت میں دماغ نے آخرکار وکیل صفائی کا کردار پیش کرتے ہوئے یہ یاد دلایا کہ آج صبح جب احمد حسن بار بار اس سفر پر روانگی کی جلدی کرنے کی تاکید کر رہا تھا' وہ اس متاعِ عزیز کو وہیں واش بیسن پر بھول آئی تھی۔

"اب تک تو وہ جانے کہاں پہنچ چکی ہوں گی۔" کمرے میں واپسی پر مولوی احمد حسن نے مقدمہ سننے کے بعد ارشاد فرمایا۔ "اب محض چند گرام سونے کی فقط دو انگوٹھیوں کے لیے دوبارہ دروش تک کا سفر کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ میری مانیے تو آپ انہیں بھول جائیے۔"

"نہیں۔" ازدواجی زندگی کا تقریباً ڈیڑھ برس بیت جانے کے بعد پہلی مرتبہ زیور نے احمد حسن کی اس بات سے اختلاف کیا۔ اس آواز میں ایک روایتی بغاوت کا تاثر نمایاں تھا۔ "میں یہ نہیں کر سکتی۔ خدا کے واسطے آپ مجھے واپس لے چلیے۔" اور آنسو بہہ نکلے۔ دونوں خالی ہاتھ جوڑے ہوئے زیور اس وقت مولوی احمد حسن کے سامنے سراپا التجا تھی۔ آنسوؤں کی اس برسات اور اس دکھی انداز کی زد میں احمد حسن کی ذات بری طرح سے گھر گئی اور وہ اس وقت کی مظلوم عورت کی اس قدر ضد کے سامنے بے بس ہو گئے اور قدرے غصے کے عالم میں انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اگلی نشست پر زیور بے بس اور تنہا ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آنکھیں تو برسنے کی عادی ہو ہی چکی تھیں۔ اب ساتھ اس المیے پر آسمان بھی برس پڑا اور مشکل راستہ مشکل ترین ہو گیا۔

سہ پہر کا تو احساس ہی نہ ہو سکا کہ اس دوران چھوٹے ندی نالے بھی تیز بہاؤ کی زد میں تھے۔ البتہ شام نے ہلکے اندھیرے کے ساتھ اپنی آمد کا احساس دلا دیا اور اس کے ساتھ ہی منزل بالکل سامنے آ گئی۔ مولوی احمد حسن نے جیپ سے اتر کر سامنے موجود ملازم کو "اوئے" کہہ کر آواز دی۔ وہ حیرت سے دیکھتا ہوا قریب آ گیا۔ احمد حسن نے قدرے خطابت کے انداز میں اسے جب

ساری بات بتائی تو اس نے کہا۔

"ہمیں پتا نہیں جناب۔ ہم نے تو اپنے صاحب کا کمرہ آپ کے لیے خالی کرایا تھا۔ وہ چترال گئے ہوئے تھے۔ آج ہی واپس آئے ہیں۔ ٹھہریئے' میں پتا کرتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر اندر چلا گیا۔ زیور دھک دھک کرتے ہوئے دل کے ساتھ باہر ہی کھڑی رہی۔ چند منٹ کے بعد ملازم نے واپس آ کر کہا۔ "صاحب تو اندر موجود نہیں ہیں۔ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"

"ہم انتظار نہیں کر سکتے۔" احمد حسن نے اونچی آواز میں کہا۔ "ہمیں واپس جانا ہے۔"

"تو پھر بیگم صاحبہ خود اندر جا کر دیکھ لیں۔" ملازم نے پیشکش کی۔

"ٹھیک ہے۔" مولوی احمد حسن فوراً مان گئے۔ "چلیے۔" انہوں نے غصے میں زیور کو مخاطب کیا۔ لرزتے ہوئے قدموں سے زیور نے کمرے اور پھر واش روم تک کا فاصلہ طے کیا اور پھر مایوسی کے عالم میں جب وہ پلٹی تو خود فریبی کے کسی احساس کے تحت آواز آئی۔ "زیبی!" اچانک ہی سارا سماں پلٹ گیا تھا۔ وقت' گھڑیاں' پل سب ہی بہت پیچھے کی طرف پرواز کر گئے تھے۔ آدرشوں کے روپ سے سجی ہوئی زندگی سامنے تھی۔ جس میں بڑی چاہت سے بڑی آرزو سے یہ نام پکارا تھا۔

"زیبی!" اس نے شدید مایوسی کے عالم میں تمام تر احساسات کو جھٹک کر دیکھا۔ وہاں تو کوئی نہ تھا۔ کچھ بھی نہ تھا' مگر اس کمرے کی فضا اور مہک بڑی مانوس تھی۔

مایوس قدم آگے بڑھے اور کمرے میں موجود مولوی احمد حسن کی سوالیہ نظروں کی تاب نہ لا کر ٹھہر گئے۔

"آپ نے ہمیں خواہ مخواہ پریشان کیا۔" انہوں نے غصے کے عالم میں اونچی آواز سے کہا۔ "کبھی گمشدہ اشیاء بھی دوبارہ مل سکتی ہیں' ناممکن! یہ معجزوں کا دور نہیں!"

جھکی ہوئی نظروں سے زیور نے واپسی کے لیے قدم اٹھایا تو ڈیڑھ برس بعد ایک مانوس آواز کمرے میں پھیل گئی۔

"آپ کی امانت میرے پاس محفوظ ہے۔ احمد حسن صاحب۔"

دل بڑی تیزی سے دھڑکا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ آنکھوں کی اس برستی برسات کے آگے چھائی ہوئی گہری دھند کے اس پار دروازے میں پرویز علی شاہ بالکل سامنے موجود تھے۔

"ہاں! بے شک یہ معجزوں کا دور نہ سہی لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ گمشدہ اشیاء ہی نہیں' گمشدہ انسان اور گمشدہ آوازیں بھی دوبارہ زندگی کا نصیب بن جاتی ہیں۔"

اس وقت...... لمحے کی دہلیز پر کھڑی زیور اور بالکل سامنے موجود پرویز علی شاہ کی ذات کے درمیان مولوی احمد حسن کا وجود حائل تھا۔ آگے بڑھ کر پرویز علی شاہ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے ایک لفافہ اٹھا کر مولوی احمد حسن کو تھما دیا۔ جس میں زیور کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کے لب خاموش تھے اور وجود گویا کہ بالکل ساکت' لیکن نقاب کے باہر دیکھتی ہوئی آنکھیں اس وقت بھی پرویز علی شاہ سے سوال کر رہی تھیں۔

"آپ......کون ہیں؟"

پھر ان آنکھوں میں ایک شکوہ اتر آیا۔ اس قدر ماورائی رفاقت کے بعد آپ نے غلط بیانی کیوں کی بھلا؟

آپ کو آج بھی مولوی احمد حسن سے یہ کہنے کی بجائے کہ "آپ کی امانت میرے پاس ہے!" یہ کہنا چاہئے تھا۔

"میری ایک امانت آپ کے پاس ہے احمد حسن صاحب!"

ڈیڑھ برس کا عرصہ کوئی مکمل صدی نہیں ہوتا کہ انسان اپنے بچھڑے ہوئے خوابوں کو بھول جائے۔ وقت بڑا سست رفتار مرہم ہے۔ انسانوں کے زخم بھرنے میں ہزاروں لاکھوں لمحے لیتا ہے' تب بھی کچھ گھاؤ ایسے ہوتے ہیں جو کبھی نہیں بھرتے!

پھر...... اس کے بعد دل کچھ بھی نہ سن سکا۔ اگرچہ آوازیں آ رہی تھیں۔ جن میں مولوی احمد حسن پرویز علی شاہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہہ رہے تھے۔

"خدا جانے کیا بات ہے میجر صاحب۔ ہماری بیگم صاحبہ کبھی بھی یہ انگوٹھیاں اپنی انگشت شہادت سے جدا نہیں کرتیں۔ ان کی وصیت ہے کہ بعد از وفات بھی انہیں ان کی ذات سے جدا نہ کیا جائے۔ یہی دیکھ لیجئے کہ ہمیں ان کی اس خوشنودی کی خاطر چترال سے دروش تک کا سفر دوبارہ طے کرنا پڑا۔"

دونوں طرف سے خاموشی پا کر مولوی احمد حسن نے خود ہی اکیلے مسکرا کر اس ساری صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"عجیب معاملہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

تب ایک عورت کے بت کے اندر دھڑکتا ہوا دل اپنی بے آواز پکار میں فریادی ہوا۔ "تم شاید کبھی نہ سمجھ سکو گے' احمد حسن کہ یہ کیا معاملہ ہے؟" دل کی اس انجانی بستی کے کچھ ہی نہیں بلکہ اکثر معاملات ایسے ہوتے ہیں جس میں آباد ایک خاموش جہان کے اندر دکھ درد کے کئی موسم بیت جاتے ہیں۔ کبھی خوشیوں کا ساون برستا ہے' کبھی غم کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ کہیں کبھی خوشی کی کرنیں پھوٹ جاتی ہیں اور کبھی جدائیوں کی خزاں کے زرد پتے ہر سو بکھر جاتے ہیں۔ اس جہان کے اندر کبھی کبھار زندگی اپنے انجانے دکھوں پر بڑے ہجر زدہ بین کرتی ہے۔ مگر اس سے باہر بسنے والے زندگی سے قریب تر لوگوں کو بھی اکثر پتا ہی نہیں چلتا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

شام...... ڈھل گئی۔

احمد حسن نے واپسی کی اجازت طلب کی اور زیور کے ہجر زدہ دل میں رک جانے کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ مگر کسی نے بھی رک جانے کے لیے نہیں کہا۔ پرویز علی شاہ کی ذات میں سارے تاثر بیگانگی کے تھے۔

عمارت کی آخری سیڑھی اتر کر جب وہ سبزہ زار تک پہنچی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اوپر برآمدے میں کھڑا پرویز علی شاہ اسی راستے کی طرف دیکھ رہا تھا' جدھر وہ جا رہی تھی۔ بالکل غیرارادی طور پر اس کا ہاتھ الوداعی سلام کے لیے اٹھ گیا۔ جواب میں تیز ہوا کے سنگ جھومتے ہوئے درختوں کی آواز کے علاوہ اور کچھ بھی نصیب میں نہ تھا۔ زیور کی نگاہیں دوبارہ اسی سمت اٹھیں' مگر پھر پلٹ نہ سکیں۔ پرویز علی شاہ کے ساتھ اس شام کے دھندلکے میں کھڑی نیلوفر کھڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ تیز ہوا میں جس کا اُڑتا ہوا آنچل فتح کا پرچم بن کر اس لمحے زندگی کے افق پر لہرا رہا تھا۔

نقاب کے اندر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اب واپس پلٹ جانے کا کوئی بھی راستہ باقی نہ بچا تھا۔ مسافرت کے سارے پل دکھوں کی گہری کھائی میں سفر طے کرتے ہوئے گزر گئے اور واپسی کا سفر مکمل ہو گیا۔ البتہ دل شکوہ کناں رہا۔ "ہاں! بے شک یہ دنیا ہے پرویز علی شاہ جہاں تم میری چاہت تھے' مگر میرا نصیب نہ بن سکے۔ احمد حسن کو بے شک میری چاہت نہ تھی مگر میں اس کی طلب بن گئی۔ یہ تو تقدیر کا کھیل ہے' پرویز علی شاہ نصیبوں کے فیصلے ہیں۔ جسے چاہا وہ ملتا نہیں

اور جسے ہم چاہتے نہیں' وہ ہمارا نصیب بن جاتا ہے۔

"احمد حسن کو میری چاہت نہ تھی مگر وہ میرا مالک بن گیا۔ نیلوفر تمہاری چاہت نہ تھی مگر وہ تمہارا نصیب بن گئی۔ ہم تقدیر کو کبھی نہیں ٹال سکتے۔ لوح محفوظ پر لکھے گئے حروف مٹانے کی ہم میں سکت نہیں ہے۔ یہ تو تقدیر کا فیصلہ ہے۔ لمحوں کا کھیل ہے کہ بارش کی اس شب میں تمہارے ساتھ تھی اور آج دل کی برسات میں بھیگتی ہوئی اس شب میں نیلوفر تمہارے ساتھ ہے۔"

گھر واپسی ہوئی اور اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اس شب مولوی احمد حسن نے نہایت پُراسرار انداز میں کئی مرتبہ کا پوچھا گیا سوال دہرایا۔

"سچ بتایئے۔ یہ انگوٹھیاں آپ کو کس نے دی تھیں؟" جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ لب خاموش رہے۔ مگر دل نے کہا۔ "تم نے صرف میری انگشت شہادت پر جمی ان انگوٹھیوں کو دیکھا ہے۔ جن کے گول دائرے میں زیور کی ساری زندگی قید ہو کر رہ گئی ہے' مگر نقاب کے اندر میرے گلے کا وہ ہار تمہاری نظروں سے اوجھل رہا' جسے پرویز علی شاہ کی طرف سے آخری تحفہ سمجھ کر میں نے ہمیشہ اپنے قریب ترین رکھا ہے۔ یا تو تم جانتے ہی نہیں مولوی احمد حسن اور اگر جانتے ہو تو پھر سمجھتے ہی نہیں کہ کچھ جذبے لافانی ہوتے ہیں' ان کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ کہ وہ بتا سکیں' ان کا دکھ کیا ہے؟ خاموشی کی فصیل اس مرتبہ ٹوٹ گئی اور اپنے خدائے مجازی کے سامنے سر جھکا کر زیور نے کہا۔

"بہتر ہوگا' آپ آئندہ یہ سوال نہ کریں۔"

"کیوں؟" مولوی احمد حسن کو بے حد غصہ آ گیا۔ "بھلا کیوں نہ کروں؟ یہ سوال میرا شرعی حق بنتا ہے۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"میں ایک بار اس سوال کا جواب دے چکی ہوں۔" زیور نے مدھم آواز میں کہا۔ "اگر آپ کے دل میں کوئی شک ہے تو اسے دور کر دیں۔ کیونکہ میرا ماضی ایک کورا کاغذ ہے' اس پر کوئی تحریر نہیں۔"

خدا جانے کیوں زیور کی یہ بات سن کر مولوی احمد حسن طنزیہ طور پر مسکرائے۔ شاید وہ اس بات کو ایک جھوٹ سمجھ رہے تھے۔ لیکن زیور نے سچ کہا تھا۔ بھلا اس نے کب اعتراف کیا تھا کہ اسے بھی پرویز علی شاہ سے محبت تھی۔ زبان سے اعتراف کا لمحہ تو نصیب ہی نہ بنا تھا۔ ماضی میں دل نے اپنا فیصلہ دیا اور نگاہیں تائید کرتی رہیں۔ یہ تو اندر کی دنیا کے معاملات تھے۔ باہر کے تمام وسیلوں اور

رابطوں سے دور' زندہ' تنہا اور دکھی۔

واقعی......! پھر احمد حسن نے پلٹ کر کوئی سوال نہ کیا۔ کپور بانو نے انہیں ایک نئی رنگین دنیا کی جھلک دکھا دی تھی۔ "شرع میں شرم کیسی؟" کہہ کر اب وہ اپنی ہر گفتگو کا آغاز کرتیں۔ "اسلام میں تو چار شادیاں جائز ہیں۔ ارے دو سال گزر گئے۔ کیا دنیا سے بے نام ہی چلا جائے گا میرا بچہ۔" سننے والوں کی مزید ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے وہ اپنی آواز کی رقت اور آنسو بھی اس آواز میں شامل کر دیتیں اور زیور کی نااہلی اور نکھے پن کے قصے کچھ اس طرح بیان کرتیں کہ تمام سامعین ان کی اس بے مثال اداکاری پر عش عش کر اٹھتے۔ خود تو انہیں چین سے جینا کبھی نصیب ہی نہ ہوا۔ لیکن اہل خانہ کی زندگی میں بے چینیاں بھرنا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہی کھیل مولوی احمد حسن کی زندگی میں ایک نئی بے چینی لے آیا۔

ان دنوں وہ بے حد الجھے الجھے سے رہنے لگے تھے' اس کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ کپور بانو نے انہیں زرتاج کی ایک جھلک دکھا دی تھی' جسے انہوں نے زیور کی غیر موجودگی میں بڑی محنت کے بعد تلاش کیا تھا۔ زرتاج سیاہ شریف والے پیروں کی بیٹی تھی۔ اولاد کے معاملے میں اس نسل کی خواتین خود کفیل تھیں۔ ویسے بھی زرتاج کے والد گرامی بڑے "پہنچے" ہوئے پیر تھے۔ علاقے کی اکثر خواتین اولاد کے حصول کے لیے ان ہی کے در پر ماتھا ٹیکتیں اور گوہر مراد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ پھر بھلا کیونکر مولوی احمد حسن اس در سے اپنی مراد حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوتے۔

کپور بانو نے بیٹے کی زندگی میں زہر بھرنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ "مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ زیور بیگم نے ضرور ہی ماضی میں کوئی عشق پالا ہے۔ احمد حسن تم کیسے شوہر ہو؟ سمجھتے کیوں نہیں۔ عورت کی زندگی میں کوئی بھی روگ بلاوجہ نہیں ہوا کرتا۔ آخر کیا بات ہے؟ کہ اسے تم سے یا اس گھر سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔"

اس قدر برین واشنگ کے نتیجے میں مولوی احمد حسن کو اپنی سہاگ رات یاد آ گئی۔ جب انہوں نے زیور کا ہاتھ تھام کر اپنے نام کی انگوٹھی پہنانی چاہی تو وہاں سرخ نگینہ چمک رہا تھا۔ تب زبان کا زہر شدت اختیار کر گیا۔ تمام امور کی ادائیگی کے دوران جب زیور کی بھیگی ہوئی آنکھیں نظر آ جاتیں۔ مولوی احمد حسن کا سوال اپنا رخ بدل کر سامنے آ جاتا۔ "کس کے لیے رو رہی ہو؟"

کوئی جواب نہ پا کر احمد حسن کی ذات تلملا اٹھتی۔ ان کے دل پر چاقو چھریاں چل جاتیں۔ شک کے سارے ناگ پھنکارنے لگتے۔ جنہیں تھپک کر سلانے کی کوشش میں وہ اس زندگی کے خواب دیکھنے لگتے' جس میں زرتاج کی رنگینی کی صورت میں بڑی دلکشی تھی۔

خزاں پھر سے آ گئی اور گھاؤ گہرے ہوتے چلے گئے۔ کہیں سے کوئی نہ آیا۔ نہ ہی ملکہ بھابی اور خالد بھائی نے پلٹ کر خبر لی۔ جب کپور بانو کے گھر کا کچا صحن زرد پتوں سے بھر گیا تو شباب شاہ زیور کو لینے آ گیا۔ بی جی کی طبیعت خراب تھی۔ یہ پیام پاتے ہی کپور بانو نے بنا کسی مروت اور لحاظ کے اپنے تمام تر حتمی جذبات کا اظہار شباب شاہ کے سامنے کر دیا' جس میں بی جی کی شان میں بھی شاندار کلمات ادا کیے گئے۔ ان کلمات کے تحت زیور کی غلط تربیت کا الزام بھی شامل تھا۔ اس ساری صورت حال کو دیکھ کر شباب شاہ نے زیور سے ایک سوال کر ڈالا۔

"تم...... بھلا اس طرح سے جی رہی ہو؟"

"جی ہاں۔" زیور کی ذات کا جواب تھا۔" دیکھ لیجیے۔ ہمیں اس طرح سے بھی جینا پڑتا ہے۔ عورت تو ہر دور' ہر صدی اور ہر ماحول میں تہی دست اور لاچار رہی ہے۔ ہمیشہ سے مرد ذات کی محتاج' چاہے وہ مرد احمد حسن ہو۔ شباب شاہ ہو۔ پیر بابا ہو۔ یا پھر پرویز علی شاہ۔ اپنے ہوتے ہوئے بھی وہ سب اس کے لیے اجنبی رہتے ہیں۔ اپنے دل کی پکار میں اپنے آنسوؤں کی زبان سے وہ ساری زندگی ان رشتوں سے ایک ہی سوال کرتی ہے۔"

"آپ کون ہیں؟"

اپنے بھائی کے پیچھے چلتے ہوئے قدم اسے دوبارہ بابل کی دہلیز تک لے آئے تھے۔ بی جی نے گلے لگایا۔ پیر بابا نے سر پر ہاتھ پھیرا اور باقی سب لوگ اپنی ہی ذات میں مگن رہے۔ بی جی کی خدمت میں اسے بہت سکون ملا۔ وہ وقتی طور پر اپنے دکھ بھول گئی۔ ذرا سے سکون کے جو یہ نامانوس لمحات نصیب ہوئے تو شباب شاہ نے اس کے لیے اپنا فیصلہ سنایا۔

"سنو۔ اب تم واپس نہیں جاؤ گی۔"

زندگی کے اس سنگ میل پر جب شوہر' محبوب اور باپ کے بعد بھائی نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ تو چپ کی ایک مہر لبوں پر آ کر رک گئی۔ کہیں کوئی سوال سامنے نہ آیا۔ کہ آخر مرد کے رشتے اور نسبت سے جاری استحصال کا یہ سلسلہ آخر کہاں جا کر ختم ہوگا۔ زندگی کے تمام پہر اس وقت لمبے پر

آ کر تھم گئے' جب دہلیز پہ بکھری چولہے کی گرم راکھ میں تنکوں سے راستہ بناتی ہوئی زیور کو شاہ بیگم نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"زرینہ بیگم نے آپ کو بلایا ہے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے۔"

بی جی سے اجازت طلب کرنے کے بعد وہ کئی دنوں کے بعد اونچی ڈیوڑھی سے باہر آئی۔ وادی کا سماں وہی تھا۔ اونچے درختوں سے نیچے بہتے ہوئے دریا تک خزاں میں ہر چیز مرجھا چکی تھی۔ تیز ہوا کا شور انجانے دکھوں پر نوحہ خواں تھا۔ رنگ' راستے اور پیر خانے کی طرف جانے والی گلی پر خاموشی کا عالم طاری تھا۔ زیور کے اندر اس وقت ایک ڈر کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نشیبی چٹان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس سے ذرا اوپر زرینہ بیگم کے گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ وادی میں اس سے بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ دریائے نیلم کے وسطی حصے میں بے چارا رزاق اپنے رباب کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے دکھ کی آواز شاہ حسین کی کافی کی صورت میں سنا رہا تھا۔

ماہے نی میں کینوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

سامنے زرینہ بیگم کے گھر کا کھلا ہوا دروازہ اس کا منتظر تھا۔ قدم آگے بڑھے اور وہ برآمدے میں آن رکی۔

اسی پل ایک معجزہ رونما ہو گیا۔

عرش پر بسنے والے رب عظیم نے اپنی طویل خاموشی کی طرح زیور کی بے زبانی اور خاموشی پر ترس کھا کر آج پرویز علی شاہ کا دیدار نصیبوں میں کر دیا تھا۔ زرینہ بیگم کی بیٹھک کے دروازے میں وہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے موجود تھا۔ اپنے اردگرد کے ماحول کا احساس کرتے ہوئے زیور نے کترا کر دوسری سمت نکل جانے کا قصد کیا' مگر دوسری جانب سے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ پرویز علی شاہ کے بازوؤں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

آخر کب تک...... کوئی بھلا کس طرح دکھوں سے مسلسل نبرد آزما رہ کر زندگی کو ایک زحمت کی طرح جھیل سکتا ہے۔ ہر انسان سکھ کا متلاشی ہے۔ سکون چاہتا ہے۔ صبر کے چشمے جب سوکھ جائیں تو ایسے ہی معجزے رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ انسانی جذبات کوئی سائنس کا کارنامہ نہیں بلکہ قدرت کا عطیہ ہیں۔ مولوی احمد حسن کی منکوحہ کو اس قدر قریب تر کرنے پر آج پرویز علی شاہ دنیا کی نظر میں

سنگسار کرنے کے قابل ہی سہی' مگر وہ اپنے دل کی دنیا میں مطمئن تھا...... کہ مذہب میں کہیں بھی زندگی کسی جبر کا نام نہیں۔ پھر یہ کہ دل کی دنیا کے اپنے کچھ معاملات ہوتے ہیں۔ ورنہ ہیر رانجھا اور سسی پنوں جیسی داستانیں کبھی زبان زدعام نہ ہوتیں۔

ادھر جب صبر کے بندھن ٹوٹ گئے تو اشکوں کی برسات میں زیور کی ذات کے سارے بادل بڑی شدت سے گرجے اور انہوں نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ ساری دنیا سے بے خبر اور ان لمحات کی نزاکت سے لاتعلق وہ اس وقت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

''نہیں...... میں اس طرح نزع کے عالم میں نہیں جی سکتی۔ بہت مشکل ہے پیا! بہت ہی مشکل۔ کوئی تو کہیں سے آئے۔ کوئی نجات دہندہ' کوئی خضر راہ' کوئی دوست' کوئی غمگسار' کوئی ہمسفر' کیا ساری دنیا کہیں کھو گئی؟؟'' جب یہ ساون برس کر تھم گیا تو بیٹھک میں فرش پر بیٹھی ہوئی زرینہ بیگم شکوہ کناں تھیں۔

''پیروں کی دنیا کا دستور بھی نرالا ہے۔ اپنی بیٹیاں غیر سیدوں کو رشتے میں نہیں دیتے' لیکن غیر سیدوں کی بیٹیاں اپنے ہاں بیاہ کر لے آتے ہیں۔ جن سے ان کی وہ نسل آگے بڑھتی ہے جس کے سر پر دستار فضیلت رکھ کر وہ خود مزاروں میں جا سوتے ہیں۔ کیا خوب ہے' یہ دستور بھی۔ غیر سیدوں کی اولاد گدی نشین تو ہوسکتی ہے' داماد نہیں بن سکتی۔ ہم بھی تو ان ہی خود ساختہ اصولوں کے تحت مارے گئے۔ زیور بیگم' ہم نے تو کبھی اپنے دکھوں کا اظہار ہی نہیں کیا۔ پرویز علی شاہ میرا بھائی ہے۔ میری اپنی ماں کا بیٹا۔ ملکہ کی ماں میری پھوپھی تھیں' جنہوں نے میری ماں سے میرے اس بھائی کو مانگ لیا اور کبھی کسی پر بھی اس بات کو ظاہر نہ کیا۔ مگر وقت ساری بات سامنے لے آیا...... میں تمہاری چاہت سے لاعلم تھی۔ ملکہ نے مجھے بے وقت آگاہ کیا۔ افسوس......! کہ اب وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے...... بے شک' یہ زندگی کا زہر ہے جو نہ چاہتے ہوئے پینا پڑ جاتا ہے۔''

آنسو پونچھ کر زرینہ بیگم کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔

''پیر صاحب نے جب غیر سید کہہ کر ہمیں ٹھکرایا۔ تو دل بہت تڑپا۔'' پرویز علی شاہ کہہ رہے تھے۔'' ملکہ آپی نے مجھے میری انگوٹھی لوٹا دی۔ تو یہ دکھ اور گہرا ہوگیا۔ میری ماں حیات نہیں تھیں کہ انہیں اپنا درد بتا سکتا۔ میری پالنے والی بھی دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ میں اپنے دکھوں میں تنہا ہوں۔ بے حد تنہا اور اداس' کوئی در ایسا نہیں کہ جہاں فریاد کرسکوں۔ میری ذات بے حد انتشار زدہ

ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔ شاید مجھے کوئی سہارا چاہئے زیور بیگم۔ کسی بھی طرح' کسی بھی قیمت پر۔ ہاں! درویش کی اس شام جب تم خود فقط میری نشانی دوبارہ پا لینے کو پرانی یادوں کی تلاش میں واپسی کا سفر طے کرنے کے بعد میرے سامنے آئیں تو مولوی احمد حسن کے سنگ تمہیں دیکھ کر میری حیات کرچی کرچی ہوگئی۔ میں نہ رہ سکا اور میری بہن میرا دکھ دیکھ نہ سکی۔ ہم نے اس طرح جینے کا تو سوچا ہی نہ تھا۔ بڑی آرزوئیں تھیں۔ بڑے سپنے تھے۔ لیکن دکھ ہے کہ اظہار ہی نہ ہوسکا اور ہم بے خبری میں مارے گئے۔''

حیرت زدہ زیور بیگم کی نظریں آج پرویز علی شاہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے لبوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر ایک سوال کیا۔

''نیلوفر کو پانے کے بعد بھی آپ مطمئن نہیں ہے؟''

بڑی دکھی مسکراہٹ پرویز علی شاہ کے چہرے پر پھیل گئی۔'' یہ نگاہیں اکثر دھوکہ کھا جاتی ہیں زیور بیگم۔'' پرویز علی شاہ کہہ رہے تھے۔'' اس شام جب تمہیں نیلوفر میرے عقب میں کھڑی نظر آئی۔ اندر کمرے میں اس کا مصری شوہر حسین بن عبداللہ آرام کر رہا تھا۔ وہ دونوں میرے مہمان تھے۔ تب میں نے جانا کہ یہ لوگ زندگی کو جیت لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ نیلوفر نے تمام روایتیں توڑ دیں! اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان صرف مسلمان ہوتا ہے۔ وہ عورت ہو کر جیت گئی اور میں مرد ہوتے ہوئے بھی ہار گیا۔ یہ تو حوصلوں کا فرق ہے۔ ہمتوں کی بات ہے۔ ہم شاید ہار گئے زیور بیگم اور آج اس اعتراف کے لیے تقدیر آپ کو سامنے لے آئی۔ ہاں! اب صرف اعتراف ہی ہوسکتا ہے۔ ہمیں شاید اپنے اپنے حصار میں اب اسی طرح سے جینا ہے!''

بڑی گہری خاموشی چھا چکی تھی۔ اب کہیں کوئی بھی لفظ ادا کرنے کو باقی نہیں بچا تھا۔ ہواؤں کی سنسناہٹ اور دریا کے پانی کا شور زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔

''اب اجازت چاہوں گا۔'' اپنے مخصوص انداز میں کہہ کر وہ اٹھ گیا اور جیب سے چمکتی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی نکال کر زیور کی طرف...... بڑھاتے ہوئے اس کی رقت آمیز آواز آئی۔

''زندگی کے باقی دکھوں کی مانند اسے بھی قبول کر لیجئے۔ یہ میرے پاس موجود ہے تو خدا جانے کیوں مجھے آپ کی اپنائیت کا احساس دلاتی رہتی ہے اور میں بارہا یہ بھول جاتا ہوں کہ اب تم...... وہ نہیں ہو! وہ! جس کے سپنے ایک گہری شام کو اس سوال کے ساتھ میری آنکھوں میں آ کر

ٹھہر گئے تھے۔

"آپ کون ہیں؟"

"ان اجنبی ساعتوں میں بھی؟ جبکہ تم پرائی ہو! میں میں تم سے آج بھی یہ سوال نہیں کرسکتا۔

گ "آپ کون ہیں......؟ کہاں ہیں زیور بیگم۔ ہمارے ساتھ کیوں نہیں؟"

اس "آپ" سے "تو" تک کا سفر طے کرنے میں پرویز علی شاہ نے صدیوں کے فاصلے لگا دیئے۔ کوئی بغاوت نہ کی۔ نہ روایتیں توڑیں۔ اپنے دل کے اندر بسی دنیا کو باہر کے لوگوں پر عیاں نہ کیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ صدیوں کی اس مسافت میں صرف دو مرتبہ اس نے زیور کی قربت پا کر ایک سہانی دنیا کے خواب ضرور دیکھ لئے۔

اور باقی زندگی کے لیے یہی خواب عذاب بن گئے۔ بہت گہرا اندھیرا ہر سمت چھا گیا۔

کئی پل صدیوں کا سفر طے کر چکے تھے۔ آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر زیور نے دیکھا۔ وہ جا چکا تھا۔ وہ ان جانا ہمسفر۔ وہ اجنبی دوست۔ سامنے میز پر پڑی ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی، مگر اس کی جگمگاہٹ اب زندگی کے اندھیروں میں کوئی اجالا نہ لاسکتی تھی۔ باہر صحن میں اندھیرا گہرا تھا اور خزاں رسیدہ پتوں نے صحن کا وجود چھپا لیا تھا۔ دریا کی لہریں بڑی تیزی میں تھیں۔ باہر بالکل سامنے پیر خانے سے متصل لنگر خانے میں آگ کے سارے الاؤ روشن تھے، جن کی روشنی میں چوبارہ صاف نظر آرہا تھا۔ زیور انگوٹھی اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے باہر برآمدے میں آگئی۔ جہاں اپنے جوان جہان بھائی کی اس نامرادی پر زرینہ بیگم بین کر رہی تھیں کہ اس دکھ کا ازالہ کرنا ممکن ہی نہ تھا اور اس گھر سے نیچے رزاق نشیب میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا رباب کے سنگ گا رہا تھا۔

یہ درد کے ٹکڑے ہیں یہ شعر نہیں ساغر
ہم سانس کے دھاگوں میں زخموں کو پروتے ہیں

زیور نے واپسی کا قصد کیا۔ وہ زرینہ بیگم کے گھر کے صحن میں آکر دم بھر کے لیے ٹھہر گئی۔ شاہ بیگم بی جی کی ہدایت پر اسے لینے آئی تھیں۔ واپسی کے لیے مڑتے ہی زیور کی نظر پیر خانے کے اونچے چوبارے کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں مولوی احمد حسن کھڑا تھا۔ آگ کے جلتے ہوئے الاؤ میں اس کی روشن آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے وہ خاموش کھڑا تھا اور زیور صاف محسوس کرسکتی تھی کہ یہ خاموشی بلاشبہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔

گھبرا کر کسی خطرے کا احساس کرتے ہی زیور باہر نکل آئی۔ شاہ بیگم اور زرینہ بھی ڈیوڑھی سے باہر آگئیں۔ اوپری چوبارے سے بڑی تیزی کے ساتھ مولوی احمد حسن نیچے تک آیا اور اوپر چٹان پر آکر ٹھہر گیا۔ اب لہروں میں طغیانی آچکی تھی۔ سارے خزاں رسیدہ پتے بھی اُڑ اُڑ کر پیر خانے کے قبرستان میں پھیلی ہوئی قبروں کی پہلی قطار کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ آج مولوی احمد حسن پر ایک شوہر ہونے کے ناطے ایک ایسی حقیقت آشکار ہوئی تھی جس کو برداشت کرنا مشکل تھا۔ ایک ایسی عورت جو منکوحہ ہو، اپنے ہاتھوں میں کسی پرائے مرد کی نشانیاں سجائے بیوی ہونے کا کردار ادا کرتی رہے، ناقابل برداشت تھی! قطعی ناقابل برداشت!

وہ تو آج ہی زیور کو لینے آئے تھے کہ شرعی لحاظ سے زرتاج کو نکاح میں لانے سے قبل اس کے جائز حقوق کا تعین کرنے کے بعد وہ اس کی اجازت کے بھی طلبگار تھے۔ اب خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ زندگی میں اس قدر ناروا رویے کے بعد بھی اور اس اہم فیصلے کے بعد ایک ناکردہ گناہوں کی ماری ایک عورت کی اجازت بھلا کیا اہمیت رکھتی تھی۔ لیکن وقت تو یہ سماں سامنے لایا تھا کہ خلیفہ قربان کی زبانی زیور کی زرینہ بیگم کے گھر آمد اور بعدازاں ملازم مٹھو کو نذرانہ ادا کرنے کے بعد وہ اوپری چوبارے سے کئی ایک حقیقتوں کا سامنا کر چکے تھے۔

انسان کبھی اس طرح بھی تو بک جایا کرتے ہیں۔

اب وہ اس عدالت میں بلاشرکت غیرے منصف تھے۔ جس کے کٹہرے میں زیور ایک گنہگار کے روپ میں کھڑی تھی۔

اور پھر......! فیصلہ ہوگیا۔

وحشت کے عجب لمحات مولوی احمد حسن کی ذات میں اتر آئے تھے۔ ان کے چٹان جیسے کھردرے ہاتھ ہر سمت سے زیور پر برسنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان نے وہ آگ اگلی کہ لہروں میں بھی اس آگ کی تپش اور زہر گھل گیا۔ زرینہ اور شاہ بیگم چھڑانے کے لیے آگے بڑھیں، لیکن دھکے دے کر ان کے وجود کو پرے کردیا گیا۔ شور سن کر رزاق دوڑتا ہوا چلا آیا۔ مولوی احمد حسن اس کی طرف بڑھے۔ رباب کے سارے تار ٹوٹ کر بکھر گئے۔ معصوم رزاق اپنے زخموں سے بے نیاز پیر خانے کی طرف مدد کے لیے چلاتا ہوا دوڑا۔ مگر وہاں کون تھا؟ شباب اپنی دنیا کی کسی رنگینی میں کہیں بہت دور مگن تھا۔ محمد نبی اپنی سانس کی عیادت میں مصروف تھا۔ البتہ پیر حسن داد ایک ساتھ

سالہ بزرگ کے روپ میں مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوئے اپنے در پر حاجت کی طلب میں آئے ہوئے مریدوں سے کہہ رہے تھے۔

"عشق ایک لافانی جذبہ ہے۔ رب کے اندر ابھرا تو اس نے بذاتِ خود اپنے پیارے محبوب کی تخلیق کی۔ زلیخا کے وجود میں اس جذبے کی بیداری پر یوسف کے روپ میں سامنے آ کر قرآن کے پارے میں ایک سچی داستان بن کر بج گیا۔ انسان تو کمزور ہے۔ بے بس ہے۔ عشق کے جذبے سے اس کی تخلیق ہوئی اور اس کمزور مخلوق نے اسی بل بوتے پر اس عالم کو فتح کر لیا۔"

چیختا چلاتا ہوا رزاق پیر خانے کے در پر آن گرا...... زخموں سے رستے ہوئے لہو نے کسی انجانی داستان کا انوکھا رخ سامنے کر دیا پیر حسن داد کے مرید کسی ناگہانی آفت سے نبٹنے کے لیے اونچی نیچی چٹانیں پھلانگتے ہوئے جب زرینہ بیگم کے گھر کے سامنے پہنچے تو مولوی احمد حسن زیور بیگم کی انگشت شہادت سے ماضی کی ساری داستانیں ہیرے کی انگوٹھی سمیت چھین کر دریائے نیلم میں پھینک چکا تھا۔

کایا پلٹ چکی تھی۔

پیر حسن داد کے وہاں پہنچنے سے چند ساعتیں پہلے ان کے مریدوں کے سامنے اپنی باکردار بیوی کو گنہگار ثابت کرتے ہوئے چلا چلا کر مولوی احمد حسن کہہ چکا تھا!

"طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔"

اس ایک لفظ نے شرعی طور پر مرد ذات کو کتنا بڑا حق عطا کر دیا تھا۔ فقط چار حروف ہی ایک وفادار اور وفا شعار بیوی کو شوہر کی زندگی سے نکالنے کے لیے کافی تھے۔ کتنی کم قیمت تھی! اس وفا شعاری اور قربانی کی! دریائے نیلم کی ساری لہریں بپھر بپھر کر اپنا سر سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرانے لگیں اور خزاں رسیدہ پتے ایک ہجوم کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ پیر خانے میں جلتے آگ کے الاؤ بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے اور پھر...... ہر چیز راکھ بن گئی۔

ہر آنکھ برسات کا بادل بن گئی۔ گرج گرج کر برسنے والا بادل نہیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ برسنے والی درد کی پھوار! پیر حسن داد فضل الٰہی کی دختر نیک اختر زیور فضل الٰہی ایک داستان بن کر ہر طرف پھیل گئی۔ مرید مریدنیوں کا ایک ہجوم اس سانحہ عظیم پر گویا تعزیت کے لیے امڈ آیا۔ جھکے ہوئے چہرے کے ساتھ پیر حسن داد رقت آمیز آواز میں اعتراف کرتے رہے۔

"پیروں فقیروں کی اولاد پر بھی آزمائش کے روپ میں یہ وقت آتا رہا ہے' اس لافانی جذبے سے انکار ممکن ہی نہیں۔ ورنہ رب عظیم اپنا محبوب بھلا کیوں تخلیق کرتا۔ قرآن مجید کے پارے میں زلیخا اور یوسف کی داستان کو جگہ نہ ملتی۔ میری بیٹی تو کمزور تھی۔ اس پر اس جذبے نے اگر اثر کر دکھایا تو بھلا کون سا گناہ عظیم سرزد ہو گیا؟"

بہت گہری' سیاہ اور اُداس رُت ہر سمت چھا گئی۔

اول شب نئی نویلی دلہن کے آنچل کو جائے نماز کا درجہ دے کر اس نعمت کے حصول میں کامیابی کے بعد شکرانے کے نفل ادا کرنے والا مولوی احمد حسن کسی اجنبی راہ کا مسافر ہو گیا۔ عرس شریف کی تقریب کے بعد منعقدہ میلاد کی محفل میں زرتاج کی جھلک نظر آنے کے بعد بے تابی بڑھ گئی۔ وہ زیور بیگم کو بھول گئے۔ جو اب ان لمحوں کی تلاش میں تھی' جو اس کی دسترس سے باہر تھے۔ اس پر ایک خاص مدت کی قید تھی۔ وہ کمزور عورت تھی۔ مولوی احمد حسن کی طرح مرد نہ تھی کہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد نئے عشق کو شروع کرنے کے لیے اسے وقت کا محتاج ہونا پڑتا۔ اب تو ایک آزاد پنچھی کی طرح وہ زرتاج کے در پر جب ہر وقت منڈلاتے ہوئے پائے گئے تو ایک شام شباب شاہ کی واپسی ہوئی۔ خدا جانے کس جذبے کی تلاش میں کہاں کہاں کی خاک چھان کر لوٹا تھا۔ پیر خانے کے نشیبی راستے ہی میں رباب کے تار جوڑتے ہوئے رزاق نے اسے آنسوؤں کی زبانی ساری کہانی کہہ سنائی۔ وہ بپھرا ہوا بی جی اور زیور کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی خاموش نگاہوں میں بے شمار سوالات تھے۔ دونوں نے نظریں چرا لیں۔ ماں اور بہن کے پاس کوئی بھی جواب نہ تھا۔

"ادھر دیکھیں میری طرف۔" اس نے بی جی کے پاس آ کر کہا۔ "یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہمیں اس گھر کے معاملات سے لاتعلق رکھا گیا تھا۔ اولاد کے روپ میں جنم ہم نے لیا' مگر فوقیت احمد حسن کو دے کر اپنے نام کا آدھا حصہ اسے عطا کیا گیا...... کیوں کیا بے اولاد تھے آپ لوگ؟ اب مان ٹوٹا ہے تو نظریں مت چرائیں۔ شکر کریں' جان بخشی فرما دی گئی میری بہن کی اور یاد رکھیں اب وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔"

ماں اور بہن کا ردعمل دیکھنے کی کوشش کئے بغیر وہ پیر خانے کے اوپری چوبارے میں آن رکا' جہاں پیر حسن داد اپنے مریدوں کے ہجوم میں گھرے درس دے رہے تھے۔ ساری فضا ساکت اور

خاموش تھی۔صرف ایک بلند بانگ مبلغ کی طرح ان کی آواز آرہی تھی۔

''نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک عہد ہوتا ہے۔لہٰذا فریقین کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں اور اپنے حقوق احسن طریقے سے ادا کریں۔مرد عام طور پر عورتوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔یہ طرزعمل قرآن کے منافی ہے۔سورۃ النساء کی آیت انیس میں واضح حکم ہے۔

ترجمہ:''وہ تم سے عہد لے چکے ہیں۔ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔اگر وہ تمہیں کسی وجہ سے ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو' مگر خدا نے اس میں تمہارے لئے بہت بھلائی رکھ دی ہو۔یاد رکھو' عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔''

''ان آیات کی روشنی میں خاوند اور بیوی دونوں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عزت کریں اور عیب پوشی بھی کریں۔انسان اچھائی اور برائی کا مجموعہ ہوتا ہے۔لوگ غلط فہمی اور حسد کی بناء پر بہتان تراشی بھی کرنے لگتے ہیں۔لہٰذا میاں بیوی کو چاہئے کہ وہ غلط فہمیوں کو پروان نہ چڑھنے دیں بلکہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور معاون ہونے کی حیثیت سے تبادلہ خیال کر کے غلط فہمی کو دور کریں۔رسول اکرمؐ نے فرمایا۔

''سب سے زیادہ کامل ایمان والا شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ بااخلاق ہو اور جس کا سلوک اپنی اہلیہ کے ساتھ اچھا ہو۔''

''حضرت علیؓ کا قول ہے......''اپنی بیوی کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غیرت کا اظہار نہ کرو۔کیونکہ اس میں بھی خطرہ ہے کہ کہیں وہ تمہاری وجہ سے کسی برائی کا ارتکاب نہ کر گزرے۔''

''جبکہ سورۃ حجرات کی آیت بارہ میں ارشاد ربانی ہے۔

ترجمہ:''اور بے جا تجسس نہ کرو۔''

''لہٰذا ثابت ہوا کہ اسلام میں طلاق نہایت ہی ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔رسول اکرمؐ کی حدیث پاک ہے کہ''طلاق خدا کو پسند نہیں۔''لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ طلاق جیسے انتہائی اقدام سے گریز کریں۔کسی بھی بات میں مسلمان مرد کا رویہ اس قدر شدید نہیں ہونا چاہئے۔اسی بنا پر ہمارے مذہب میں غصہ حرام قرار دیا گیا۔

''میرے دوستو! بہت مختصر ہے یہ زندگی۔یہ وقت! ایک پل اگر ہے تو دوسرے کا پتا نہیں۔

آیئے پیار کے ساتھ جئیں اور جینے دیں۔کسی پر اس جذبے کی بنا پر بہتان تراشی نہ کریں۔عزت بڑا نازک آبگینہ ہے۔اسے کبھی ٹھیس نہ پہنچائیں۔جس دل میں پیار کی رمز نہیں' وہ ویران ہے۔ہم انسان ہیں' سمجھ ہی نہیں سکتے! اس جذبے کی پہنچ ہماری دسترس سے باہر ہے۔اس جذبے کی خاطر تو عرش وفرش کی تخلیق کی گئی۔یہی پیار فقیروں کا درس ہے۔یہ بڑی انمول دولت ہے۔یوں ہی کسی کا نصیب نہیں بن سکتی۔بڑی پہنچ اور معراج والے لوگ ہوتے ہیں' جن کے مقدر میں عشق لکھا جاتا ہے۔یہ جذبہ تو خود رب کے اندر بستا ہے۔منصور یوں ہی سولی پر نہیں لٹک گیا تھا' جس دل میں پیار کا ڈیرہ ہوتا ہے' وہ دل رب کی ذات کے قریب ہوتا ہے۔''

''بہت خوب!'' وہ چلایا اور سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔''اب یاد آیا آپ کو یہ سب۔بیٹی کی زندگی برباد کرنے کے بعد۔اب اس قسم کا درس دینا کیا معنی رکھتا ہے' حضرت پیر صاحب۔جب اس جذبے کی تذلیل فقط سید اور غیر سید ہونے کی بنیاد پر کی گئی' تب آپ کا یہ درس کہاں تھا؟ بابا جان' آپ نے ساری زندگی ایک مفروضے کی بنیاد پر گزار دی! حقیقت کا سامنا کرنے سے ہمیشہ کتراتے رہے۔اپنی اولاد کو غیر سمجھا اور غیروں کو گلے لگایا۔آج اس کا نتیجہ دیکھ چکے آپ؟ اپنی اولاد سے دوری کا سبب آپ تھے۔ساری زندگی غیروں کے ہجوم میں گھرے ان کے دکھ درد' ان کے مسائل کے حل کرنے کی سعی کرتے رہے۔لیکن کیا اپنی اولاد' اپنی بیوی سے بھی آپ نے یہ پوچھنے تک کی زحمت گوارا کی کہ بھلا وہ کس طرح جی رہے ہیں۔ان کا بھی کوئی مسئلہ ہے یا نہیں؟''

پیر بابا خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔شباب شاہ چیخ کر مریدوں سے مخاطب ہوا۔

''کیوں آتے ہو تم اس در پر؟ کیا ملے گا تمہیں۔کچھ بھی نہیں ہے یہاں۔جاؤ' جا کر اپنے رب سے مانگو۔وہی عطا کرنے والا ہے۔بے شک وہ ہر شے پر قادر ہے۔

''ارے اندھے ہو تم لوگ! دیکھ نہیں سکتے۔سمجھ نہیں سکتے۔پیر بابا بھی ایک بے بس اور کمزور انسان ہیں۔اپنے رب کی عبادت کر کے اس کا قرب تو حاصل کر سکتے ہیں' تمہاری حاجتیں پوری نہیں کروا سکتے۔دعا کا وسیلہ پکڑ سکتے ہو تو جاؤ۔اس رسی کو تھام کر اپنے اللہ سے طلب کرو۔وہ تمہیں ضرور نوازے گا۔کاغذ کے کسی ٹکڑے کو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لینے سے تمہارا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔وہ رب ہی ہے جو تقدیر لکھ کر زندگی کے سارے راستے خود ہی متعین کر دیتا ہے۔جاؤ'

مذہب کو مذاق مت بناؤ۔ کچھ بھی نہیں ہے یہاں۔ اس مزار پر جلتے ہوئے دیے کے نیچے ہماری زندگیوں میں بہت گہرا اندھیرا ہے۔ ہماری زندگیوں میں قبرستان جیسی خاموشی ہے...... یہ پیرخانے کا اونچا در' یہ چوبارہ' یہ درس دیتی ہوئی زبانیں' سب ایک خواب ہیں۔ ایک سہانا خواب۔ ان خوابوں سے نکل کر حقیقت کا سامنا کرو۔ ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

شباب کا چہرہ آنسوؤں سے گیلا تھا' مگر آواز بھرائی ہوئی نہ تھی۔ "اجازت دیجئے پیر بابا۔" وہ باپ کے قدموں میں جھک گیا۔ "اب کی بار میں آپ کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ کو اپنا حسب نسب مبارک ہو۔ ہم اپنی دنیا خود تلاش کرلیں گے۔"

لیکن...... پیر بابا کے وجود کے اندر گہری خاموشی چھا چکی تھی۔ شباب شاہ نے ان کا ہاتھ تھاما۔ برف جیسی ٹھنڈک ہرسمت تھی۔ ان ہاتھوں میں گرمی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ تو چلے گئے تھے۔ وہاں! جہاں انسانیت کے اعلیٰ ترین درجات کی کبھی بھی کہیں پر بھی توہین نہیں کی جاتی۔

ہر طرف کہرام مچ گیا۔

درگاہ شریف میں ہر طرف بین کی آوازیں آنے لگیں۔

ان میں آج بی جی کی پکار نمایاں تھی۔ وہ اپنے دل کے' اپنی زندگی کے زخموں کے لیے چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ "بے شک! پیروں فقیروں کی اولادیں تو مزار پر جلنے والا وہ دیا ہیں جو اپنا وجود جلا کر خاکستر کردے' تب بھی کسی قبر کا اندھیرا دور نہیں کرسکتا۔"

رات گئے پیر بابا درگاہ شریف کے احاطے میں اپنے ماں باپ کے پہلو میں جا کر بہت آرام سے سو گئے۔

یہ جسد خاکی جب خاک نشین ہوا تو کبھی کی گئی وصیت کے مطابق سوگواری کی ساری صفیں لپیٹ دی گئیں اور دستار فضیلت محمد نبی کے سر پر سجادی گئی۔ وہ اپنی اہلیہ سمیت پیر بابا کی طرف سے بخشے گئے تین کمروں کے چھوٹے سے مکان سے اٹھ کر اوپر چوبارے میں مقیم ہوگئے۔ پیرخانے کے بالائی حصے پر اب ان کا تسلط تھا اور اس سے نیچے وہ بے بس مخلوق مقیم تھی' جن کے دکھوں سے اب بھی محمد نبی کو ہرگز کوئی واسطہ نہ تھا۔

زندگی......! کچھ قدرے معمول پر آگئی۔ درگاہ شریف پر نذرانے چڑھانے والوں کے ہجوم میں اضافہ ہوگیا۔ عقیدت مندوں کا خیال تھا کہ یہ نذرانہ اب درس میں سبق پڑھنے والوں کے علاوہ

تین یتیموں یعنی کہ محمد نبی' شباب شاہ اور زیور بیگم اور پیر بابا کی بیوہ یعنی بی جی کے کام آتا ہے۔ لہٰذا ان کی بخشش کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ محکمہ اوقاف والے ہر ہفتے یہ سبز بکس چھان کر لے جاتے ہیں۔ کچھ ان کے گھروں میں جاتا ہے اور کچھ حکومت کے خزانے میں جمع ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی سڑک بنتی ہے' نہ کوئی مدرسہ چلتا ہے۔ نہ ہی کوئی پل زیر تعمیر نظر آتا ہے۔ بلکہ اس آزاد خطے کے وزراء کی فوج ظفر موج اکثر موسم گرما میں یہاں کی گرمی سے گھبرا کر اس نذرانے کو کسی نہ کسی فنڈ کے نام پر وصول کرنے کے بعد برطانیہ کی سیر کرنے روانہ ہو جاتی ہے۔ ہاں کبھی کبھار کسی کو علاج کی ضرورت پیش آتی ہے تو بھی نذرانہ فنڈ کے نام پر کام آتا ہے۔ لیکن عقیدت مند تو ضرورت مند تھے' وہ چڑھاوے چڑھاتے اور نذرانے پیش کرتے۔ اس لئے کہ ضرورت بلاشبہ اندھی ہوتی ہے۔

سب کچھ ہی بدل گیا تھا' مگر قدرت نے اپنی روش نہ بدلی۔ یہ خزاں جب بیت گئی تو وادی میں پھر سے بہار کا موسم چلا آیا۔ پرانے خزاں رسیدہ پتے زمین بوس ہوگئے اور نئی کلیاں' نئی کونپلیں زمین کے سینے پر اُگ آئیں۔ دریائے نیلم کی شوریدہ لہریں بھی ذرا تھم تھم کر بہنے لگیں۔ انسانوں کی اس قدر سنگدلی کو دیکھ کر اب انہوں نے سنگلاخ چٹانوں سے اپنا وجود ٹکرانا چھوڑ دیا تھا۔ اونچے سبز درخت نئے پتوں کا لباس پہن کر اب دوبارہ جوبن پانے لگے تھے۔ پیر بابا کے لنگر خانے میں جلتی تمام لکڑی راکھ بن چکی تھی اور اونچی ڈیوڑھی کے پیچھے مقید زیور بیگم کا وجود اپنے آپ سے شکوہ کناں تھا...... "آخر کیوں سپنے دیکھے ان آنکھوں نے۔ حالانکہ پرویز علی شاہ میرے لئے نامحرم تھا اور ابھی تک ہے۔ میرا محرم تو مولوی احمد حسن تھا۔ پھر بھلا میں نے اس کی منکوحہ ہوتے ہوئے بھی کسی غیر مرد کی نشانی کیوں اپنے پاس رکھی۔ اس گلے کا یہ ہار اسی جرم کے بدلے پھانسی کا ایک پھندا ہے۔ بہت اچھا ہوا' مجھے ضرور سزا ملنی چاہئے تھی۔ اے میرے دل' اب زندگی بھر اسی سولی پر لٹکو۔ یہی تمہاری سزا ہے۔" سارے آنسو برسات بن گئے اور اس طوفان میں زندگی بھر کی خوشیاں بہہ گئیں۔

پیروں فقیروں کی اولاد پر یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔

پھر اس شب...... جب شباب شاہ نے پیر بابا کو خواب میں دیکھا تو ایک بڑی قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں چلاتا ہوا حجرے سے باہر نکل آیا اور اوپر پیرخانے کی طرف بھاگتا ہوا چلا گیا۔ بی جی اور زیور گھبرا کر ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر آگئیں۔ تب تک وہ ڈیوڑھی

پار کر کے جا چکا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اس کے پیچھے مزار تک چلی آئیں۔ جہاں شام سے جلتا دیا اب خاموش تھا۔ شباب شاہ پیر بابا کے مزار سے لپٹا ہوا اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا' چلا رہا تھا' مگر قبر کی مٹی خاموش تھی۔

بڑی مشکل سے محمد نبی' خلیفہ قربان اور منگو اسے اٹھا کر واپس حجرے تک لائے تھے۔ صبح کاذب نمودار ہونے تک وہ شدید ترین حرارت کے زیر اثر جھلس رہا تھا۔ محمد شاہ جو شریف النفس تھے' کسی مریدنی کی زبانی یہ واقعہ سن کر خیریت دریافت کرنے چلے آئے تھے۔ ان کے ساتھ علاقے کے معنی حکیم بھی تھے جنھوں نے شباب شاہ کی حالت دیکھ کر فرمایا۔ ''کسی خوف کا اثر ہے' ٹھیک ہو جائے گا۔''

چولہے کی لکڑیاں اپنے آنسوؤں سے سلگانے کی کوشش کرتے ہوئے زیور نے شاہ بیگم کی طرف دیکھا۔ حجرے سے نکلتے ہوئے محمد شاہ کو سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''یہ سب دکھاوے کی ہمدردی ہے۔ آج ہی کپور بانو مولوی احمد حسن کو ساتھ لے کر زرتاج کے رشتے کی بات کرنے جا رہی ہیں۔ زیور جواب میں کچھ نہ بولی۔ شباب شاہ کے لیے تیار کردہ قہوے کا پیالہ لے کر حجرے کے اندر چلی گئی۔ اب وہ قدرے ہوش میں تھا۔ بی جی اس کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھیں۔ ذرا سہارا دے کر انہوں نے اسے اٹھایا۔ زیور نے آگے بڑھ کر اسے قہوہ پلانا چاہا' لیکن یک دم اس کا ہاتھ کانپ گیا اور گرم قہوے کا پیالہ چھلک گیا۔ شباب شاہ کی گردن کے گرد لپٹی ہوئی سونے کی زنجیر کے آخری سرے پر پرویا گیا وہ لاکٹ کھلا ہوا تھا اور اس میں زرتاج کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

''تو کیا......؟ ہم سب بے خبری میں ہی مارے گئے میرے بھائی!'' زیور کا دل رو دیا۔ ''میں' تم اور ہمارے خواب' ہمارے آدرش' تو ہم سب سے بے خبر۔ ہم سے الگ تھلگ کس راہ کا مسافر رہا؟ اگر زرتاج تمہاری زندگی سے اس قدر قریب ہے تو اب آنے والا وقت کیا رنگ دکھائے گا؟ ہم بھلا عاجز انسان اور کتنی زیادہ آزمائش کا سامنا کریں گے؟ یہ کیسی مسافرت ہے؟ کیسا سفر ہے؟ کیسی زندگی ہے؟ میرے مولا۔ اب تو ہمیں بخش دے!'' مگر عرش پر بیٹھا ہوا رب خاموش رہا۔

البتہ زرتاج کے در سے مولوی احمد حسن اور کپور بانو کو طلب کا حصول نہ ہو سکا۔ پہلی بیوی کو بغیر کسی جرم کے طلاق دینے کا معاملہ اٹھایا گیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

شباب شاہ کا بخار نہ اتر سکا۔ پیر بابا کی گستاخی کی سزا اسے بہت سخت بیماری کی صورت میں

ملی۔ ذرا ہوش میں آ کر وہ بھاگ بھاگ کر مزار کی سمت جانے لگتا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگتا۔ بی جی جیتے جی مر گئیں۔ ان کی آنکھیں غم کا بادل بن گئیں اور پیر خانے کی اس اونچی ڈیوڑھی کے اندر ایک مستقل ساون کا سا سماں رہنے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ یہ پیر بابا کی بڑی سخت بددعا کا اثر ہے کہ ان کی اولاد اس قدر سخت آزمائش سے دوچار ہے۔

جب زیور' شباب شاہ اور بی جی کی ذات ایک داستان بن کر ہر طرف پھیل گئی تو ایک دن سہ پہر کے ڈھلتے سائے تلے کپور بانو اور مولوی احمد حسن پیر بابا کی ڈیوڑھی کے اندر آن رکے۔ نکی بی فوراً خوش آمدید کہنے کے لیے آگے بڑھیں اور باقی تمام افراد کے دکھوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ان مہمانوں کو مہمان خانے سے متصل بیٹھک میں لا بٹھایا۔ محمد نبی بھی ازراہ مہربانی چلے آئے۔ کپور بانو کا اصرار تھا کہ زیور بھی شریک محفل ہو۔ شاہ بیگم کی زبانی پیام بھیجا گیا تو جواب ملا۔ ''مولوی احمد حسن اب میرے لئے نامحرم کی حیثیت رکھتا ہے۔'' یہ بڑا زبردست طمانچہ تھا۔ مولوی احمد حسن تلملا اٹھا۔ مگر ضبط کر کے خاموش رہا۔ بی جی خاموشی سے آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے احمد حسن شرمندہ تھا۔ کسی بھی طرح اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔

''بھائی صاحب۔'' وہ محمد نبی سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کی بہن نے کچھ کم ستم نہیں کئے ہم پر۔ ہم نے برداشت کیا اور کرتے رہے۔ یہاں تک کہ زرینہ بیگم کے گھر پرانی شناسائی کے حوالے سے جو منظر ہم نے دیکھا' وہ کسی بھی غیرت مند شوہر کی غیرت کو للکارنے کے لیے کافی تھا۔ ذرا سوچئے۔ وہ میری منکوحہ تھی' مگر اس کی یادوں میں کوئی اور بستا تھا۔ گناہ کبیرہ ہے یہ۔ اس کی معافی ہو ہی نہیں سکتی مگر......!''

''مگر۔'' محمد نبی نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''تو پھر اب آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟''

''ہم یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں' پیر و مرشد ہم سے ناراض اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ ہم عقیدت مندی کی صف اول کے لوگ ہیں۔ بھائی صاحب' جس دن سے پیر و مرشد نے ہم سے منہ موڑا ہے' ناکامی نے ہماری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ جماعت کی امامت ہم سے چھن گئی ہے۔ مدرسے کے طالبعلم اب ہم سے مذہب کے نام پر کوئی بھی سبق لینے کو تیار نہیں۔ دنیا کی نظر میں آج بھی آپ کی بہن سرخرو ہے اور ہم گنہگار ہیں۔ ہم جانتے

ہیں کہ طلاق مؤثر ہو چکی ہے مگر مذہب میں اس بات کی گنجائش موجود ہے۔"

"یعنی کہ؟" مولوی احمد حسن کی بات کاٹ کر محمد نبی نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ حلالہ۔" وہ اپنے لہجے میں کوئی دلیل دینے کے لیے مضبوطی لاتے ہوئے بولے۔" حلالہ کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ......!" انہوں نے کچھ واضح کرنا چاہا۔

"خاموش رہو۔" محمد نبی نے ہاتھ اٹھا کر کہا...... "آج برسوں کے بعد زندگی کے اس اہم فیصلے کے موقع پر ان کی غیرت پر زبردست چوٹ پڑی تھی۔ بڑی گہری نیند کے بعد آج ان کا وجود پوری طرح سے جاگ اٹھا تھا اور انہوں نے درگاہ شریف کے سجادہ نشین کی حیثیت سے پورے جلال کے ساتھ مولوی احمد حسن سے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کتنا مشکل سوال کر رہے ہو تم؟ حلالہ کے لیے کون آمادہ ہوگا؟ جو زیور کو دوبارہ تمہاری دسترس میں دینے کے لیے ایک دن کی دلہن کا روپ دے کر اس کی ذات سے دستبردار ہو جائے گا۔ جاؤ' اب چلے جاؤ۔ احمد حسن' فقیروں کی اولاد سے اب اور مذاق نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں مزید قہر کا سامنا کرنا پڑے۔" محمد نبی خاموش ہوئے تو بی جی مارے حیرت کے بیٹھی انہیں دیکھتی رہی گئیں۔ کپور بانو نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے بیٹے کو کہنی ماری اور مولوی احمد حسن نے ان کے اس قدر غصے سے قطع نظر پھر سے بات شروع کر دی۔

"ہم تو بے قصور ہوتے ہوئے بھی معافی کے طلبگار ہیں۔ لہٰذا خود ہی آپ کی خدمت میں چلے آئے۔ ہماری تجویز ہے کہ حلالہ کے لیے زیور بیگم کا نکاح رزاق سے کر دیا جائے اور اس کے بعد طلاق لے کر......!"

لیکن مولوی احمد حسن کی بات پوری نہ ہو سکی اور بیٹھک میں ایک حشر کا سماں پیدا ہو گیا۔ اپنے حجرے سے اٹھ کر شباب شاہ دروازے میں آن موجود ہوا تھا اور احمد حسن کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے ناتوانی کی حالت میں بھی جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"مذہب کو مذاق مت بناؤ احمد حسن۔" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "یہ پیغمبروں کا دور نہیں ہے۔ ہم تو فانی انسان ہیں۔ عاجز اور بے بس مخلوق۔ ہمیں ہماری زندگی جینے دو۔ جاؤ' چلے جاؤ۔ بے شک ہم پر کفر کے فتوے لگا کر ہمیں اپنی حدود سے خارج کر دو۔ مگر ہمیں ہماری مرضی کے مطابق

زندگی گزارنے دو۔ کیا سمجھے ہو مولوی احمد حسن تم مرد ہو' لہٰذا تم ہر عمل اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔ جب دل چاہا نکاح کر لیا' جب دل چاہا' بیوی کو طلاق دے کر کسی زرتاج کی تلاش میں نکل گئے۔ یاد رکھنا احمد حسن' زرتاج میری محبوبہ ہے۔ میرا عشق ہے۔ ایسا عشق جس کے سائے میں' میں نے اپنے رب کو پہچانا ہے۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ مگر زرتاج نے مجھے خواب میں آ کر تمہاری ذات سے بچاؤ کی دہائی دی ہے۔ یہ ہے سچے عشق کی معراج۔ انسانیت کا درس دینا آسان ہے احمد حسن۔ انسانیت برتنا بہت مشکل ہے۔ سب سے پہلے شک کی بنیاد تم نے رکھی۔ زیور سے چودہ برس چھوٹے رزاق کو شادی کی پہلی صبح تم نے اس کے لیے نامحرم قرار دیا اور آج تم عمر میں برسوں برس چھوٹے نابالغ بچے سے اپنی مطلقہ بیوی کا نکاح پڑھوا کر اس کا وجود پھر سے اپنے لئے جائز قرار دینا چاہتے ہو؟ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ مردوں کے اس سماج میں تم اپنی من مانی ضرور کر سکتے ہو' مگر کسی عورت کا دل زبردستی نہیں جیت سکتے۔ وہ جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب تر ہے ناں۔ وہ ہمارے نفس کو ہمارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لئے کہ ہر مومن مسلمان کا دل خدا کا گھر ہے۔ تم جیسے لوگ دوہری زندگی جی کر اس دل کو' خدا کے اس گھر کو بدنام کر رہے ہو۔ جاؤ چلے جاؤ۔ اب تمہیں یہاں سے کچھ نہیں ملے گا اور ہاں' اب اگر کبھی زرتاج کا خیال تمہارے دل میں آیا ناں۔ تو اتنا ضرور سوچ لینا کہ پھر قاتل کہلانا میرے لئے کچھ مشکل نہ ہوگا۔"

شباب شاہ کے آخری الفاظ کی گھن گرج نے مولوی احمد حسن کا دل دہلا دیا۔ وہ اندر سے کانپ گئے اور کپور بانو کے پیچھے سر جھکائے ہوئے بیٹھک سے نکل آئے۔ محمد نبی کسی اَن جانی مصالحت کی کوشش میں انہیں روکنے کی سعی کرتے رہے۔

"جاؤ۔ چلے جاؤ!" شباب شاہ چلاتا ہوا ان کے پیچھے تک چلا آیا" اور یاد رکھنا۔ ہر عورت پیر حسن داد کی بیٹی زیور فضل الٰہی نہیں ہوتی۔ تم نے زرتاج کی صرف ایک جھلک دیکھی ہے۔ اگر زندگی میں کہیں تم سے ٹکرا جاتی تو تمہیں بھی سمجھ آ جاتی۔ ارے! اس نے تو شباب شاہ جیسے سر پھرے کو سیدھا کر دیا۔ تم......! مولوی احمد حسن' تم بھلا کیا چیز ہو۔ جاؤ چلے جاؤ۔ تم جیسے لوگ ہمیشہ نامراد ہی رہتے ہیں۔"

پیروں کے در پر گہری شام پھر سے چھا گئی۔

سر جھکائے مولوی احمد حسن باہر جانے لگے تو اچانک اس گہری شام کا سناٹا ٹوٹ گیا۔

"ایک منٹ۔" پردے کی دوسری سمت سے زیور کی آواز آئی اور سب لوگ چونک گئے۔

"مولوی احمد حسن' ولیوں اور پیغمبروں کو جنم دینے والی عورت کو تم نے اتنا ارزاں کب سے سمجھ لیا کہ جب چاہا اسے اپنی زندگی میں شامل کرلیا اور جب چاہا نکال کر پھینک دیا۔ قرآن' تفسیر اور فقہ کا مذاق اُڑاتے ہوئے تم لوگ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے حلالہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ عورت کا وجود کوئی پتھر نہیں۔ اس کا دل تمہاری راہ کا کوئی معمولی سنگ ریزہ نہیں جسے تم پاؤں کی ایک ٹھوکر سے اپنے راستے سے ہٹا دو گے۔ نہیں مولوی احمد حسن' یہ بہت مشکل ہے۔ بہت ہی مشکل۔ رشتے بار بار نہیں بنائے جا سکتے۔ اس لئے کہ رشتے قدرت کی طرف سے وجود میں آتے ہیں اور قدرت تخلیق اور انتقال کا عمل صرف ایک بار سرانجام دیتی ہے' بار بار نہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ کسی مرد اور عورت کا شادی کی صورت میں ایک بندھن میں بندھ جانا کوئی کھیل ہے۔ عورت بھی انسان ہے احمد حسن۔ ایک انسان' اور انسان زندگی چاہتا ہے۔ پیار چاہتا ہے۔ وفا چاہتا ہے۔ لیکن لوگ اسے تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں۔ اپنے غصے اور وحشت کو ایک جنون کا انداز بنا کر تم لوگوں نے بہت ستم ڈھالئے۔ اب جاؤ' چلے جاؤ۔ اس لئے کہ نامرادوں کے لیے اس درگاہ شریف کے کسی بھی احاطے میں کوئی جگہ نہیں۔ تم نے پیر حسن داد کا مان توڑ دیا۔ زندگی بھر دوسروں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا درس دینے والے تم جیسے عالم خود اپنی زندگی میں قول وفعل میں بے پناہ تضاد اپنا کر بذات خود کہاں اور کس طرح مات کھاتے ہیں' یہ ہم نے دیکھ لیا۔ اب چلے جاؤ۔ بہت کچھ ہو چکا احمد حسن۔ درگاہ شریف والوں کی بددعا اگر تمہیں لگ گئی ناں تو پھر کسی اَن دیکھی آتش کے زیر اثر آجانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ایک ایسی آتش جس کی چنگاریاں اس جرم کی سزا کے طور پر زندگی بھر تمہیں جلاتی رہیں گی۔ ہاں۔ جب تپش حد سے بڑھے تو اس امر پر ضرور غور کرنا کہ مردوں کی اس ساری خدائی میں مجازی خدا کا روپ پا کر مرد جس آنچل پر اول شب شکرانے کے نفل ادا کرتا ہے' اس آنچل کو سر سے اتار کر بھری دنیا میں تنہا کرتے وقت بے آسرا اور لاوارث چھوڑتے ہوئے وہ فقط ایک لفظ ادا کرتا ہے "طلاق" اور ساری عمر کی مسافت' ریاضت' وفائیں' آرزوئیں' سب ہی کچھ مٹی ہو جاتا ہے۔ مرد ذات کو اس ایک لفظ کی طاقت عطا فرما کر قدرت نے یہ کیسا انصاف کیا؟ مرد کی دنیا کا دستور ہی نرالا ہے احمد حسن۔ زندگی بھر کوئی انجانی پکار اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ پہلے ماں کے روپ میں' پھر بہن' اس کے بعد بیوی اور پھر بیٹی کے روپ میں ساری زندگی عورت کے وجود میں

اپنے لئے جائے پناہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ جس رشتے کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا ہے' مگر اس کی یہ پکار کسی سنگ میل پر نہیں رکتی۔ قناعت اور شکر کا کوئی بھی لمحہ اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ یاد رکھو احمد حسن' عورت صرف عورت ہے۔ وہ زیور ہو یا پھر زرتاج۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ شب عروسی میں وقت تہجد زیور کے آنچل پر نوافل ادا کرنے والا مولوی احمد حسن کسی اور راہ کا مسافر ہو گیا اور صرف آنسو ہی آنسو اس وقت ہمسفر تھے۔

یہ باب بند ہوا تو ایک وقتی سا سکون خدا معلوم کس بزرگ کی دعا سے نصیب ہو گیا۔ شباب شاہ بھی اپنے اندر کی ساری تلخیاں باہر نکال کر اب کسی قدر رُوبصحت تھا۔ ہاں! اب وہ بی جی اور زیور کے سامنے کھل کر زرتاج کے متعلق بات کرنے لگا تھا۔ تب بی جی کو کبھی کبھار اس پر دیوانگی کا شک ہونے لگتا اور انہیں برسوں پرانی حضرت جی کی بات یاد آنے لگتی۔ "جب دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں ناں۔ یا پھر کسی معصوم بے ضرر دل کی آہ لگ جاتی ہے تو پھر پیروں فقیروں کی اولادیں مجذوب بن جاتی ہیں۔"

شباب شاہ بھی اسی مجذوبیت کی لکیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کبھی بھلا چنگا دکھائی دیتا اور کبھی درگاہ شریف پر آئے ہوئے مریدوں سے سوال کرتا دکھائی دیتا۔ "تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟" ایسے میں عقیدت مندوں کی عقیدت ڈگمگا جاتی۔ اکثر کا ایمان متزلزل ہو جاتا' خلیفہ قربان کو یہ صورت حال سنبھالنے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ کوشش کرتا کہ کسی بھی طرح شباب شاہ کو حجرے سے باہر نہ آنے دیا جائے۔

برس بیت جانے پر کچھ دن باقی تھے کہ پت جھڑ کی اداسی میں ایک معجزہ رُونما ہوا۔ اس سہ پہر اپنے رباب کو نئے تاروں سے جوڑنے کے بعد معصوم رزاق دوڑتا ہوا اونچی ڈیوڑھی سے اندر داخل ہوا اور صحن میں بندھے طویل تار کے وجود پر سے سوکھے کپڑے سمیٹتی ہوئی زیور کے سامنے آ کر رک گیا۔

"آپی۔" وہ اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر بمشکل قابو پا کر بولا۔ "آپ...... آپ کی انگوٹھیاں مل گئیں!"

حیرت زدہ زیور نے سوال کیا۔ "کیا......؟ دونوں؟"

"نہیں۔ تینوں!" وہ مسکرا کر بولا۔ "دریائے نیلم کے کنارے ایک ساتھ سنگ ریزوں کے درمیان پڑی ہوئی تھیں۔ بالکل ایک ساتھ۔" وہ بولتا چلا گیا۔ "میری نظر چمکتے ہوئے ہیرے پر پڑی

اور میں نے اٹھالیں۔ یہ دیکھئے۔" اس نے اپنی بند مٹھی کھول دی۔ واقعی' تینوں انگوٹھیاں جو اس شام مولوی احمد حسن کے بے جا تھم کا نشانہ بنی تھیں' بالکل سامنے رزاق کی سفید ہتھیلی پر چمک رہی تھیں۔

"اللہ قسم آپی۔" رزاق نے معصومیت سے کہا۔ "میرا ایمان ہے کہ ضرور کوئی معجزہ ہوگا۔ آیئے آپ میرے ساتھ پیر بابا کی درگاہ پر چل کر دعا تو کیجئے۔"

"نہیں رزاق۔" زیور نے دکھی آواز میں کہا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ فیض ہمارے لئے نہیں ہے۔ ہماری زندگیوں میں تو قبرستان جیسا اندھیرا ہے۔ ہم اس دیے کی روشنی سے محروم ہیں رزاق۔ ایک عالم یہاں سے مرادیں پاتا ہے۔ مگر مجھے دیکھو۔ شباب شاہ کو دیکھو۔ بی جی کی طرف نظر ڈالو۔ کیا ملا ہمیں؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ماسوائے آہوں اور دکھوں کے۔ پیر بابا تو زندگی میں ہمارے دکھوں سے لاتعلق رہے۔ اب ان کی قبر کی مٹی ہمیں کچھ نہیں دے سکتی۔ کچھ بھی نہیں......"

زیور نے انگوٹھیاں اپنی مٹھی میں سمیٹ لیں۔

"ایسے مت کہو آپی۔" رزاق نے سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا۔ "تم نے دریائے نیلم کے کنارے وہ چٹان دیکھی ہے جہاں پیر بابا نے چلہ کشی کی۔ ان کے قدموں کے نشان آج بھی وہاں ثبت ہیں۔ شدید ترین سردی میں جب سارا جہان اپنے گھروں کے اندر محو خواب ہوتا تھا' پیر بابا اپنے رب کی رحمت کے طلبگار ہوتے تھے۔ تو کیا رب عظیم کے پاس ایک فانی انسان کی اس قدر ریاضت کا کوئی بھی صلہ نہیں ہے؟ ایسا ہرگز نہیں۔ تم اپنے رب سے مانگو' ان بزرگوں کی دعا کا صرف وسیلہ پکڑو۔ وہ رب ہم سب کی ضرور سنے گا۔"

بڑی حیرت سے رزاق جیسے نابالغ بچے کی عقیدت مندی کا احساس کرتے ہوئے اس کا فرمان سنا۔ وہ چھوٹا تھا۔ بہت ہی چھوٹا' مگر اس وقت وہ کسی مبلغ کے روپ میں دکھائی دیا۔ ایک عالم و فاضل دکھائی دیا' جس کے اندر علم اور فصاحت و بلاغت کا ایک جہان آباد تھا۔

"کسی پیش آنے والے معجزے کی ابتدا ہو چکی ہے آپی۔" رزاق کہہ رہا تھا۔ "ورنہ میرے رباب کے ٹوٹے ہوئے تار کبھی نہ جڑتے اور نہ ہی تمہاری انگوٹھیاں تمہاری انگشت شہادت کا نصیب بننے واپس آتیں۔ آج چاند کی پہلی جمعرات ہے...... آؤ آج کی شب ہم دعا کریں کہ ان اونچی درگاہوں میں خاک نشین ہونے والے بزرگوں کا وجود ہرگز بے مقصد اور بے معنی نہیں تھا۔"

شام ڈھلنے تک انگوٹھیاں مٹھی میں دبائے ہوئے وہ اندر ہی بیٹھی رہی۔ جب رات کا سماں نکھر

آیا تو اس کے قدم خود بخود سارا فاصلہ طے کرنے کے بعد اوپر درگاہ شریف کی دہلیز پر آن رکے۔ پار سامنے لنگر خانے میں الاؤ روشن تھا اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پیر خانے کا وہ خاموش چوبارہ اداس پڑا تھا جہاں کبھی پیر بابا کے عقیدت مندوں کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ زیور درگاہ شریف کی دہلیز پر کھڑی ہوگئی۔ اندر بہت ہی گہرا اندھیرا تھا۔ آج تو دیے کا وجود بھی خاموش تھا۔ اس قدر اندھیرے اور خاموشی میں زیور کا سارا وجود کسی انجانے خوف سے پسینے میں ڈوب گیا۔

"آپی۔" ایک دم اس اندھیرے میں شباب شاہ کی آواز آئی۔ "تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

پار سامنے جلتے ہوئے الاؤ کی روشنی سیدھی درگاہ شریف کے اندر تک چلی آئی اور سبز چادر کا کونہ پکڑ کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتا ہوا شباب شاہ صاف نظر آ گیا۔

"میں اپنے رب سے اپنے اور تمہارے حصے کی وہ خوشیاں واپس مانگنے آئی ہوں جو ہمارے انجانے گناہوں کے سرزد ہونے کے باعث ہم سے روٹھ گئی ہیں۔ میں زندگی مانگنے آئی ہوں' شباب شاہ۔ ایسی زندگی جس میں پیار ہو' محبت ہو' خلوص ہو اور وقار ہو۔ شاید ہم نے عقیدہ توڑا۔ رب کے حضور دعا نہ کی۔ اپنے کسی مسئلے کو رب کی ذات پر نہ چھوڑا' خود ہی سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر سلجھا نہ سکے۔ ہم بری طرح سے الجھ گئے شباب شاہ۔ ہم نے چڑھتے چاند کی ساری رتوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید قدرت نے ہمیں سزا دی۔ آؤ مل کر معافی مانگ لیں۔ ان بزرگوں کے وسیلے سے اپنے رب سے کچھ طلب کر لیں۔ کچھ بھی سہی۔ محبت' روشنی' خوشی یا پھر زندگی۔ آؤ ہاتھ اٹھا کر دیکھیں۔ ہماری پہنچ کہاں تک ہے؟ کہاں تک؟؟"

زیور نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے اور اسی لمحے...... خاموش دیا روشن ہوگیا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھیں پھر سے کھل گئیں۔ پیر بابا کے مزار پر پڑا ہوا سبز غلاف مسکرایا اور اس کی چمکیلی پٹیاں چمک چمک کر احساس دلانے لگیں۔ "کیا سمجھتے ہو تم لوگ؟ یوں ہی بے مقصد یہاں خاک نشین نہیں ہیں ہم۔ ارے' تمہارے دلوں کے اندر کی دنیا کی طرح کا ایک جہان آباد ہے یہاں۔ ایک مکمل جہان۔ ہمیں ہماری ریاضت کے صلے میں غوث' ولی' قطب اور پھر ابدال کے درجے پر ہمارا رب فائز کرتا ہے اور پھر خلق خدا اس در سے فیض پاتی ہے۔ ہمیں رب کریم ولایت عطا فرماتا ہے۔ تب کہیں جا کر سبز غلاف کا پیرہن ہمارا نصیب بنتا ہے۔ یہ ایک جہان ہے۔ ایسا جہان جس کا تم شعور نہیں رکھتے۔ لہٰذا بحث نہ کرو اور مذاق نہ اڑاؤ۔ مانگو اپنے رب سے ضرور

مانگو۔ مگر اپنے انہی بزرگوں کی دعا کا وسیلہ پکڑ کر۔ رب کریم یقیناً تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ تم ذرا ہاتھ تو اٹھاؤ۔"

اٹھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ زیور کا سر عقیدت مندی سے جھک گیا۔

"زیور بیگم۔" اچانک اسے کسی نے پکارا۔ ایک دم اس آواز پر اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تو وہاں تنہا تھی۔ شباب شاہ بھی شاید اپنی مراد پا کر وہاں سے جا چکا تھا۔ پھر یہ آواز کیسی تھی؟ اس کی نظر درگاہ کی دہلیز پر پڑی۔ جہاں زرینہ بیگم کھڑی تھی۔

آگے بڑھ کر زرینہ بیگم نے مزار کے سرہانے پڑی ہوئی وہ انگوٹھیاں اٹھالیں جنہیں زیور نے چند لمحے پہلے تک ایک نذرانے کے طور پر پیر بابا کے سرہانے رکھ دیا تھا۔

"آؤ۔ آج ایک نئے بندھن کے آغاز پر میں یہ انگوٹھیاں تمہیں پہنا دوں۔" زرینہ بیگم کی آواز ایک معجزاتی کرشمے کے طور پر آئی۔ "آج میں نے اپنے بھائی کے لیے تمہیں بی جی اور محمد نبی سے مانگ لیا ہے۔ ہم اس طرح سے نہیں جی سکتے زیور بیگم۔ یہ بہت مشکل ہے۔ بہت ہی مشکل۔ آؤ ذرا سکھ کے ساتھ جئیں۔ یہ نشانیاں بے معنی نہیں تھیں۔" اس نے انگوٹھیاں اٹھا کر زیور کو پہنا دیں۔ "ورنہ اس قدر ستم زدہ حالات میں بھی اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکتیں۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ رزاق کو یہ نشانیاں عین اس چٹان کے قریب سے ملیں جہاں پیر بابا نے عبادت میں عمر گزاری اور جہاں ان کے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔"

حیرت زدہ زیور گنگ کھڑی رہی۔ زرینہ بیگم اب رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"بات تو ساری ایمان اور عقیدے کی ہے۔ رب کی ذاتِ عظیم کو بھلا کس نے دیکھا ہے۔ میں بھی برسوں بے عقیدہ رہی۔ لہٰذا لاوارثی میرا مقدر بنی۔ اس در سے غیروں نے مراد پائی' لیکن زرینہ بیگم کی جھولی خالی رہی۔ آؤ اس رب کی ذات پر اپنا ایمان پختہ کرلیں۔ جو ان بزرگوں کی دعاؤں کے وسیلے سے کسی کو مایوس نہیں کرتا۔"

زیور نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے پیر بابا کے مزار کی طرف دیکھا۔ قبر کا کتبہ خاموش تھا۔ جس پر پیر بابا کا فرمان درج تھا۔

"بے شک اعلیٰ وارفع ہے اس رب کی ذات' جو دو جہانوں کا والی ہے۔ ہم ادنیٰ سے بندے اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کی مدد کے طلبگار ہیں۔ التجا ہے کہ دعا کی جائے۔ صرف دعا۔

شرک نہ کیا جائے۔ کہ رب کریم کے حضور اس امر کی قطعی بخشش نہیں ہے۔"

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ وادی میں بڑی تیز ہوا کا ہلکا شور تھا۔ پیر بابا کے لنگر خانے میں جلتے الاؤ کی ساری لکڑیاں اب ٹھنڈی راکھ بن چکی تھیں اور درگاہ شریف کی دہلیز سے باہر آتے ہوئے زرینہ بیگم کہہ رہی تھیں۔ "بس لمحوں ہی میں فیصلہ ہوگیا۔ شاید اس لئے کہ وقت سے پہلے اور مقدر کے بغیر کبھی کچھ نہیں ملتا۔ تمہاری محبت سچی تھی' چنانچہ تم لوگ آج سرخرو ہوگئے۔ میں نے پیام بھیج دیا ہے۔ ملکہ اور خالد آرہے ہیں۔ ہم بیٹھک بازار سے تمہاری برات لے کر آئیں گے۔ جہاں میرا میکہ ہے۔ ہم غیر سید ہوئے تو کیا بھلا کیا ہم مسلمان نہیں ہیں۔"

دونوں جب اونچی ڈیوڑھی سے اندر آئیں تو بی جی جاگ رہی تھیں۔ ان کے لبوں پر بڑی آسودہ قسم کی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔ شباب شاہ ان کی گود میں سر رکھے ضدی انداز میں کہہ رہا تھا۔

"آپ سیاہ شریف جائیں گی ناں بی جی۔ زرتاج میری زندگی کا پہلا اور آخری عشق ہے۔ میں اس کے بغیر ادھورا ہوں۔ نامکمل ہوں۔ وعدہ کریں' آپ پیر بابا کی دعا لے کر جائیں گی اور مایوس نہیں لوٹیں گی۔"

دروازے میں کھڑے محمد نبی مسکرائے۔ "ہاں ضرور۔ ایسا ہی ہوگا۔ ہم تمہارے دکھوں کا ازالہ کریں گے۔"

شباب شاہ بھائی کے سینے سے لگ گئے۔ بی جی مسکراتی رہیں' آج بڑی کڑی آزمائش کے بعد دعائیں مستجاب ہوچکی تھیں۔

پھر...... پھر بڑی سنہری دوپہر میں خالد بھائی اور ملکہ بھابی کی سواری اتری۔ وہ سب مہربان پھر سے شریک زندگی تھے۔ مسکراتے چہروں کے ساتھ روشن آنکھوں سے وہ زیور کو دیکھ رہے تھے۔ پنکی اور وکی تو بے حد خوش تھے۔ لگتا تھا' درمیان کے کٹھن پل بس ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ جسے دیکھنے کے بعد بس ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی۔ جب تمام بڑوں اور بزرگوں کی محفل اس انتہائی اہم اور حساس نقطے پر بات چیت کے لیے بیٹھک میں جم گئی تو زیور کے کمرے میں وکی اور پنکی مسکراتے ہوئے داخل ہوگئے۔ وکی نے اپنی روایتی بے تکلفی سے پوچھا۔ "کیسی ہیں آپ زیبی آپا؟"

اور بعد مدت کے ہر طرف جلترنگ بج اٹھے۔

"اکیلی اور تنہا ہی آپ سب دکھوں کا مقابلہ کرتی رہیں' آخر کیوں؟" وہ شاکی انداز میں

پوچھ رہا تھا۔ "ہمیں کسی بھی طرح بتایا تو ہوتا۔ ہم تو آپ کے اپنے تھے۔ بالکل اپنے۔ پھر آپ نے ہمیں اپنی زندگی سے اس قدر بے خبر کیوں رکھا؟"

"آپ لوگ دور تھے۔" زیور کی آواز بھرا گئی۔ "بہت ہی دور۔ کون پیام لے کر جاتا؟ رشتوں کی ان بھول بھلیوں کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی۔ جواب سامنے آئی ہیں۔ سوائے شباب شاہ اور بی جی کے اور کوئی بھی ہمدرد نہ تھا۔ میں تو مجبور تھی' میرے پیار و محبت ہی مجبور۔"

آنسو...... ایک مرتبہ پھر آنکھوں کے حجروں سے باہر آ گئے تھے۔

"اچھا اب آپ روئیں گی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" وکی نے بزرگانہ انداز میں زیور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مکمل تیاری کر کے آئے ہیں۔"

زیور نے بھیگی ہوئی آنکھیں خشک کر کے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے عمر میں کتنا چھوٹا تھا وہ۔ مگر کس قدر خلوص کے ساتھ کتنے وثوق سے کہہ رہا تھا۔ "ان شاء اللہ بہت جلد ہی ہم آپ کو لینے آئیں گے۔ آپ کو پتا نہیں ادھر والوں کا کیا حال ہے؟" وہ جان بوجھ کر رکا۔ تاکہ زیور کا ردعمل دیکھ سکے۔ اس کے ساتھ پنکی نے بھی دیکھا. کہ آج بھی پرویز علی شاہ کے نام کا اشارہ پا کر شفق کی ساری لالی زیور کے چہرے پر اتر آئی تھی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" وکی نے بات دوبارہ شروع کی۔ "صرف مجھے اور پنکی کو ہی پتا ہے کہ وہ جب بھی آتے ہیں' بہت افسردہ' بہت اداس پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو اس وقت بھی ان کے گلے کے گرد لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور واقعی بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔"

وہ جان بوجھ کر رکا۔ تاکہ اپنی بات میں تجسس پیدا کر سکے۔

"اچھا۔" پنکی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کون چاچو؟"

"بھئی' وہی ٹائی۔ جو ہم لوگوں نے انہیں ان کی پروموشن کی خوشی میں بطور تحفہ دی تھی!" وکی نے کہا اور ہنستے ہنستے زیور اور پنکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اور ایک اور خبر بھی ہے......" اس نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔ "وہ اپنی محترم خاتون نیلوفر تھیں ناں۔ وہ مصر سے ڈگری لینے گئیں' مگر ایک عدد شوہر بھی درآمد کر کے لے آئیں۔ سنا ہے کہ بے چارہ بہت مشکلات کا شکار ہے اور واپس بھاگ جانے کی سوچ رہا ہے۔"

"وہ ہماری طرف آئے تھے۔" پنکی نے بتایا۔ "بے چارے مظلوم اور مسکین قسم کے شوہر

دکھائی دے رہے تھے۔"

"شادی کے بعد مردوں کی اکثریت کا یہی حال ہوتا ہے۔" وکی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "میں تو آج درگاہ شریف پر دعا مانگ کر جاؤں گا کہ رب کریم مجھے اس قسم کے عذاب سے زندگی بھر بچائے رکھے۔ (آمین)" وکی نے دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر کر (آمین) پڑھی۔ اسی وقت ملکہ بھابی اور خالد بھائی کے ساتھ زرینہ بیگم بھی اندر داخل ہوئیں۔ وقت نے آج پھر سے ان سب کو قریب تر کر دیا تھا۔ اہم ترین خوشخبری تو یہ تھی کہ تقریباً تمام تفصیلات طے ہو چکی تھیں۔ شباب شاہ کی شدید ترین آرزو اور زرتاج کی ضد بھی تسلیم کر لی گئی تھی۔

سیاہ شریف والے پیروں نے بہ امر مجبوری ہی سہی مگر اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ درگاہ شریف سے نیچے اترتی ہوئی وہ شب جاگتی آنکھوں کے ساتھ گزر گئی۔ صبح میں اداسی کا رنگ نمایاں تھا کہ بہت ہی پیارے لوگ واپس جا رہے تھے۔ مگر ایک حسین امید اور وعدہ وفا کے ساتھ واپسی کا مژدہ بھی تھا۔ جاتے سمے کی اس خزاں میں قدرت نے بہار کی آمد سے پہلے ہی کئی رنگ بھر دیئے تھے۔

زندگی میں ان شاموں کا رنگ مدت کے بعد کھل مل گیا تھا' جن شاموں میں زیور نے پھر سے چاند کے چڑھنے اور ڈھلنے کی ساری رُتوں کا حساب رکھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے چاند کی مدھم روشنی میں زرتاج کی ڈولی اس ڈیوڑھی کے اندر اتر رہی تھی اور چودھویں شب زیور ایک بار پھر بابل کے آنگن سے رخصت ہو رہی تھی۔ شباب شاہ خوش تھا۔ بے حد خوش! تیاریاں جاری تھیں۔ لگتا تھا کہ دکھ اپنے سائے سمیٹ کر دور کہیں دور جا چکے ہیں۔ وقت آزمائش شاید رخصت ہو چکا ہے۔ باغ جمیری میں بہار جاتے جاتے لوٹ آئی تھی۔ ہر طرف امن ہے۔ سکون ہے اور خاموشی ہے۔ ایسی خاموشی جو کسی بھی طوفان کا پیش خیمہ نہیں...... اس خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک سرگوشی اس وقت بی جی کا دل دہلا گئی' جب شاہ بیگم کی زبانی یہ بات سامنے آئی کہ خلیفہ قربان کی خاص اطلاع کے مطابق مولوی احمد حسن اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا خاص اور مضبوط ارادہ رکھتا ہے۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ بیٹھک بازار والے کسی قسم کے ہنگامے کے بغیر صرف چند آدمیوں کی موجودگی میں کسی بھی پروگرام کا اعلان کئے بغیر زیور بیگم کو لے جائیں۔ بی جی نے یہ خبر پا کر محمد نبی اور شباب شاہ کو خبردار کر دیا۔ بیٹھک بازار والوں کی نمائندگی زرینہ بیگم کر رہی تھیں۔ جب انہیں مطلع کیا گیا تو انہوں نے خالد بھائی کو بلا بھیجا۔ تاکہ اس نئی صورت حال کے پیش نظر لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔ خالد

بھائی ویسے بھی ذرا کمزور دل کے واقع ہوئے تھے۔ لہٰذا ایسی گھمبیر صورتِ حال کو سامنے پا کر گھبرا گئے۔ شب کے آخری پہر جب نگی بی سو چکیں تو بیٹھک میں متفقہ طور پر سب نے یہ فیصلہ کیا کہ اس چاند کی چودھویں شب بیٹھک بازار والے محض چند احباب کو لے کر اکٹھے نہیں بلکہ ٹکڑیوں کی شکل میں تشریف لائیں گے اور یہ انتہائی اہم فرض ادا کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں بے حد رازداری سے کام لینے کی تاکید اور احتیاط کی گئی۔

واپس جا کر خالد بھائی نے جب یہ پروگرام سامعین کو سنایا تو بقول وکی کے سب کے حسین ارمانوں پر سوا سیر اوس پڑ گئی اور پنکی کا اس خاص و حسین موقع پر عظیم الشان لہنگا زیب تن فرمانے کا پروگرام التوا میں پڑ گیا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر فیصلہ کیا گیا کہ فریضے کی ادائیگی کے بعد دولہا دلہن کو ایبٹ آباد لایا جائے گا اور سب احباب کو ایک عدد تقریب میں مدعو کر کے باقی ماندہ ارمان پورے کیے جائیں گے۔ یعنی کہ اس حسین داستان کا انجام بھی ان شاء اللہ وہیں ہوگا جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔

وکی نے یہ سارا تبصرہ سن کر کہا۔

''شکر ہے اللہ پاک کا' کہ ہماری بھی من کی مرادیں پوری ہوں گی۔ ورنہ میرا تو خیال تھا کہ ہمارا بھی وہی انجام ہوگا جو فلم ''انجمن'' کے آخر میں بے چاری ''رانی'' کا ہوا تھا۔''

جب یہ ساری پارٹی اپنے ترتیب شدہ پروگرام کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں بیٹھ گئی تو چودھویں کی شب بیٹھک بازار والے پرویز علی شاہ کو ساتھ لئے ہوئے پیر خانے کے نشیبی راستے پر جا اترے۔ درگاہ شریف کا دیا اس دم روشن تھا اور اوپری چوبارے میں محمد نبی' شباب شاہ اور خلیفہ قربان کے ساتھ رزاق بھی ان کی آمد کا منتظر تھا۔ پیروں کی روایت کے مطابق پہلے پرویز علی شاہ نے جھک کر درگاہ شریف کی دہلیز کو چھوا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر بیٹھک میں تشریف فرما ہو گئے۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد امام صاحب شباب شاہ کی ہمراہی میں اندر داخل ہوئے اور انہوں نے عین اسلامی روایات کے تحت شرعی حق مہر کے مطابق رسمِ نکاح کی ادائیگی فرمائی۔ زیور سے ایجاب و قبول کے مراحل طے ہو چکے تھے۔ اس وقت شباب شاہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بالکل سامنے درگاہ شریف کے کھلے دروازے سے اندر مزار پر جلتے ہوئے دیے کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ نکاح کی رسم کی ادائیگی کے بعد گلابی رنگت والی کشمیری چائے اور خستہ کلچوں

سے احباب کی تواضع کی گئی اور پھر......!

چودھویں کا چاند درگاہ شریف کی نشیبی جانب ڈھل چکا تو تاروں کی چھاؤں میں گلابی جوڑا پہنے ہوئے دلہن بنی زیور پر بی جی نے بھیگی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے پیر بابا کا دوشالہ ڈال کر اس اونچی ڈیوڑھی سے رخصت کر دیا۔ شباب شاہ بہن کو تھام کر درگاہ شریف تک لائے۔ جانے سے پہلے پیر بابا کے مزار پر حاضری ضروری تھی۔ شاہ بیگم زیور کو شانوں سے تھام کر مزار کے قریب لائی۔ زیور کا کمزور وجود بھیگی آنکھوں کے ساتھ کانپتا رہا۔ لوحِ مزار خاموش تھی اور جلتا دیا بڑی شان کے ساتھ اپنی لو سے روشنی بکھیر رہا تھا اور ساری دعائیں...... آج قبولیت کے درجے تک پہنچ چکی تھیں۔

شباب شاہ نے آگے بڑھ کر زیور کے بازو تھامے اور جیپ میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔
دریائے نیلم کا پانی بہتا رہا۔ لہریں اب خاموش تھیں اور سارے آنسو دریائے نیلم کے پانی میں گھل مل گئے تھے۔

سفر بخیر و خوبی تمام ہوا۔ بیٹھک بازار والے بڑی تیز روشنیوں کے ہنڈولے اٹھائے ہوئے راستے ہی میں منتظر تھے۔ یہاں استقبال کے زبردست مناظر دیکھنے میں آئے۔ آگے بڑھ کر ملکہ بھابی اور زرینہ بیگم نے زیور کو تھام لیا اور سجی سجائی ہوئی بیٹھک میں لے گئیں۔ اندر کی دنیا روشن تھی اور باہر دکھ کہیں دور بہت دور رہ گئے تھے۔

باہر یاروں نے عین وقت پر آ کر جشن برپا کر دیا اور بے شمار پیاری گالیوں کے درمیان کیپٹن آصف نے پرویز علی شاہ کو اٹھا کر صحن میں گھما ڈالا۔ پھر بیٹھک بازار کا کچا صحن زبردست دھمال کی زد میں آ گیا۔ یہ تو یاروں کی خوشی تھی' جس سے انکار کسی صورت ممکن نہیں تھا۔

وادی میں جب صبحِ کاذب کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو پرویز علی شاہ نے اس دہلیز کے دوسری جانب قدم رکھا۔ جہاں نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔ ان کی نظروں کے سامنے آتشی گلابی رنگ کے دوشالے میں لپٹا ہوا زیور کا روپ سامنے تھا۔ بالکل معصوم اور بہت حسین' دل کو چھو لینے والا' نازک اور دلکش' شدید تیز گرم اور دھوپ میں جھلسا دینے والا زندگی کا صحرا دور...... کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آج جل تھل کی سسی اپنا سفر مکمل کر کے اس سیج پر آ بیٹھی تھی۔ کسی رانجھے کی ہیر نے اپنے من کی مراد پالی تھی اور کسی فرہاد نے شیریں کو سینے پر تیشہ کھائے بغیر حاصل کر لیا تھا۔ آج کشمیر کی وادی

میں ایک نیا سورج طلوع ہوا تھا‘ جس کی ہر کرن روشن تھی۔

لیکن......آج کی شب کے ساتھ ہی سارے لفظ سو چکے تھے۔

ہاں! دل ضرور کہہ رہا تھا۔ ”تم ازل سے میری تھیں۔ زیور بیگم صرف میری۔ یہ احمد حسن تو یوں ہی بیچ میں آ گیا تھا۔ یہ قدرت کی طرف سے آزمائش تھی۔ یقیناً ہم سرخرو ہوئے۔“

دوشالے میں لپٹی ہوئی زیور نے پہلو بدلا اور یہ جلترنگ لمحے دل میں اتر گئے۔ پرویز علی شاہ کا دل اس لمحے پکار رہا تھا۔ ”یاد رکھنا۔ زیور بیگم۔ اگر اس زندگی میں تو لاکھ مرتبہ بھی کسی اور کی کہلائے۔ تب بھی مجھے قبول ہے۔ اول شب کی کسی نوخیز اور کنواری دوشیزہ کی طرح کہ بس یہی اس دل کا فیصلہ ہے۔ اس لئے کہ پیار کرنے والے لوگ اس دنیا میں پرویز علی شاہ کہلاتے ہیں۔ مولوی احمد حسن نہیں۔“

ساری فضا اگرچہ خاموش تھی۔ مگر زیور کی جھکی ہوئی نگاہوں میں ایک پیام تھا۔

”وہ ایک پل جب زندگی میں پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا اور جانا۔ مگر اجنبیت کے ناطے ایک سوال زبان پر آیا...... ”آپ کون ہیں؟“ وہی ایک پل پرایا تھا۔ باقی سب کچھ اپنا تھا۔ تمہارا دل‘ تمہارا درد‘ وہ ہجر اور یہ وصال۔ اس لئے کہ واقعی آج کی اس دنیا میں بھی معجزے ہوتے ہیں۔“

”زیبی۔“ پرویز علی شاہ نے بڑی مدت کے بعد اسے پکارا اور لمحے وہیں رک گئے۔ اس ساکت فضا میں پرویز علی شاہ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہلکی سی لرزش کے ساتھ اس ہاتھ میں وہ کنگن نمایاں تھے جو ملکہ کی نشانی تھے۔ یہ نشانی آج تک ان کی وصیت کے مطابق سنبھال کر رکھی گئی تھی‘ جس کے احترام میں آج کے دن کا انتظار کیا گیا تھا کہ بہرحال اس نشانی نے پرویز علی شاہ کی دلہن کی کلائی کی زینت بننا تھا۔

”ملکہ آپی کا اصرار تھا کہ یہ کنگن آپ کو میں ہی پہناؤں۔“ پرویز علی شاہ کہہ رہے تھے۔

چند ساکت لمحات بے حد گراں گزرے۔ پھر دوشالے کا پردہ ہٹا اور زیور کا دایاں ہاتھ سامنے آیا۔ جس کی لانبی مخروطی سفید انگلیوں میں پرویز علی شاہ کی دی ہوئی انگوٹھیاں زندگی کی نشانیاں بن کر چمک رہی تھیں۔ انہوں نے زیور کے چہرے پر نظر ڈالنا چاہی۔ دوشالہ ذرا سا کھسک گیا تھا اور روشن صبح کے تمام نظارے سامنے تھے۔

”زیبی۔“ وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولے۔ ”آج ہم درگاہ شریف والوں کو مان گئے۔“

زیور کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان ابھری۔ انگوٹھیوں کے ساتھ پہنائے گئے کنگن کو اپنے ماتھے سے لگا کر شرف قبولیت بخشتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر زیور نے کنگن والی کلائی اپنی آنکھوں پر رکھ لی۔ ایک دکھ کا اختتام ہو چکا تھا۔

”آپ تھک تو نہیں گئیں؟“ پرویز علی شاہ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ زیور نے جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

طویل ہجر کی ایک صدی کے بعد آج اس گزری ہوئی شب کی نیند بڑی پرسکون بہت گہری تھی۔

دوسری ڈھلتی سہ پہر میں وقت عصر دونوں بیٹھک بازار سے اوپر درگاہ شریف تک چلے آئے۔ آج پرویز علی شاہ کی ہمراہی میں بھی زیور کے قدم کانپ رہے تھے۔ درگاہ شریف کی دہلیز پر کھڑے ہو کر دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور زیور کے دل نے صدا دی۔

”پیر بابا آپ جیت گئے۔“ شکرانے کے آنسو لوح مزار پر گرے اور خاموش دیا اس حسین ملاپ پر مسکرایا۔

اور پھر ایک طویل عرصے کے بعد بی جی کے لبوں کی مسکان اس وقت واپس آئی‘ جب شباب شاہ دولہا بنا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ چمک رہا تھا۔ آرزوؤں کے تمام رنگ اس کی ذات پر چھائے ہوئے تھے۔ اگرچہ کسی بڑی بارات کا اہتمام تو نہ تھا۔ فقط گنتی کے چند پرخلوص دوست احباب اس خوشی میں شریک تھے۔ محمد نبی خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی اہلیہ کے مزاج کو نظرانداز کرتے ہوئے خوشی سے تمام رسوم کی ادائیگی میں شریک تھے۔ سیاہ شریف کے مکینوں نے روایتی گرمجوشی کے ساتھ ان مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور میٹھے دودھ اور زردے سے تواضع کرنے کے بعد شرعی حق مہر کے عوض زرتاج کی ڈولی ان کے حوالے کر دی۔

من کی مراد پانے کے بعد شباب شاہ واپس اپنے مسکن کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے علاقے کی روایت کے مطابق پیر خانے کے نیچے سڑک تک زرتاج کے بھائی بذات خود رخصت کر کے واپس چلے گئے۔ یہاں سرخ غلاف والی ڈولی منتظر تھی۔ جس میں بیٹھ کر زرتاج نے شباب شاہ کے گھر کی اونچی ڈیوڑھی سے داخل ہو کر اس کے دل کی جاگیر پر اپنا قبضہ پکا کرنا تھا۔ ایک انمول اور اٹوٹ رشتے میں جڑنا تھا۔ پر یہ دنیا ہے دوستو......! روایت ہے کہ جب زرتاج کا دلہن بنا روپ آنکھوں میں کھلتا ہوا شباب شاہ کے دل میں اترنے کے بعد ڈولی میں مقید ہو گیا۔ تو بالکل اچانک غیر متوقع

طور پر خوں آشام لمحات وادی پر چھا گئے۔ کہیں سے ایک پہلی گولی چلی اور اس کے ساتھ ہی ساری وادی فائرنگ کی زد میں آ گئی۔

دوست احباب نے اِدھر اُدھر بھاگ کر چٹانوں کے پیچھے پناہ لی۔ بالکل سامنے مورچہ بند مولوی احمد حسن نے اپنے ساتھیوں سمیت نشانہ لیا اور لوہے کی گولی شباب شاہ کا بازو چیرتی ہوئی نکل گئی اور ڈولی کے اندر مقید زرتاج کا وجود مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ نیم بے ہوش آنکھوں سے زمین پر گرے ہوئے شباب شاہ نے دیکھا۔ سرخ غلاف والی ڈولی میں سے نکلتا ہوا لال سرخ خون سارے سنگ ریزوں کو سرخ کرتا ہوا انجانی سمت بہہ نکلا تھا اور آخری لمحات میں کسی غیبی مدد کی آس میں ڈولی کے پردے سے باہر نکلے ہوئے زرتاج کے انتہائی دلکش اور خوبصورت ہاتھ کی سرخ ہتھیلی پر مہندی سے شباب شاہ کا نام تحریر تھا۔

اس ساکت فضا میں کچھ دیر تک ٹھہراؤ رہا۔ دشمن اپنا وار کامیاب سمجھ کر واپس جا چکے تھے۔ چند ملی جلی آوازوں نے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر قدرے امن کا احساس کرتے ہوئے لوگ بچتے بچاتے ہوئے چٹانوں کے پیچھے سے باہر نکل آئے۔ پیر خانے کے اوپر چوبارے اور اونچی ڈیوڑھی سے نیچے تک ہر طرف کہرام مچ گیا۔

زیور کی ذات اس قدر ستم سہنے پر اس وقت غش کھا کر گری، جب زخمی شباب شاہ کے ساتھ دلہن بنی زرتاج کا لاشہ ڈیوڑھی سے اندر لایا گیا۔ یہ عجب شب غریباں تھی۔ جس کی شام میں ایک دلہن سہاگن کا روپ پانے سے پہلے ہی میت کے روپ میں ڈھل کر آخر شب درگاہ شریف سے ملحقہ قبرستان میں جا کر سو گئی اور ہوش آنے پر زخمی شباب شاہ ہر ایک سے یہی پوچھتا رہا۔

"تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

آج بھی درگاہ شریف کا وہ در ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔ عقیدت مند بڑی دور سے اپنی مرادیں پانے یہاں آتے ہیں۔ قدرت ہر ایک کو نوازتی ہے۔ لیکن درگاہ شریف کے اس در پر جدی پشت گدی نشینوں کا بیٹا شباب شاہ آج بھی ایک دیوانے مجذوب کی صورت میں اس مزار پر آنے والے عقیدت مندوں سے یہ سوال ضرور کرتا ہے۔

"تم لوگ...... یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

* * *

تجدید وفا

اس شام وقت سے کچھ پہلے ہی فائیو اسٹار ہوٹل کی بتیاں جل اٹھی تھیں، جبکہ ڈوبتے سورج کے سائے ابھی ماند نہ ہوئے تھے اور اس کا ہولے ہولے کانپتا وجود آسمان کے ساحل پر روشن ابھی دنیا کے وسیع سمندر کو اپنی ڈوبتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہوٹل کے چاندنی لاؤنج میں بیٹھے ڈاکٹر کے۔ ایم آصف گھبرا گئے۔ میز پر سے ان کی قیمتی گاڑی کی چابی غائب تھی۔ انہوں نے میز پر ہاتھ پھیرا۔ انگلیاں ٹھنڈک کا احساس لیے لوٹ آئیں۔ بالکل سامنے ہی تو کٹ گلاس کی ایش ٹرے پڑی تھی، جس کی دوسری طرف ان کی سوا دو لاکھ مالیت کی گاڑی کی چابی تھوڑی دیر پہلے تک موجود تھی۔ وہ صرف چند منٹ کے لئے ہی تو بالکونی تک گئے تھے کہ واپسی پر انہیں اس پرابلم کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ آج کی شام وہ صرف اپنے ساتھ اور بغیر کسی پریشانی کے گزارنا چاہتے تھے۔

وہ اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میز کی داہنی جانب جھکے تو حیران سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اُن کے قریب سے ہی تو گزری تھی۔ لمبا چوڑا سفید دوپٹہ بکل مارنے والے انداز میں اوڑھ رکھا تھا۔ عام سا بے تکلف لباس تھا اور تقریباً ڈیڑھ گز عرض والا دوپٹہ۔ ڈاکٹر آصف کی نظریں اس لمبے پلو کے آخری کنارے پر ٹک گئیں، جہاں اُن کی گاڑی کی چابی کسی نامراد عاشق کی طرح لپٹی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ فرانس کی اعلیٰ ترین دکان سے خریدا گیا کی رنگ کا نوکیلا سرا دوپٹے کے کونے میں جکڑا ہوا تھا اور اب یہ کونا بھی گول زینے کے نیچے غائب ہونے ہی والا تھا۔ قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ دونوں ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترتے گئے۔ بالکل سامنے لگے آئینے میں دونوں کا عکس ایک ساتھ اُبھرا آیا اور وہ رک گئی۔

"مجھے اس طرح تعاقب کرنا قطعی پسند نہیں۔" سادہ لہجہ اور معصوم لفظ ڈاکٹر آصف کو تقریباً پریشان کر گئے۔ انہوں نے ایک دم پلو سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بالکل عام سا چہرہ تھا۔ محنت کش اور مقدر کی سختیاں سہنے والا۔ گالوں پر حالات کی سیاہی بکھری ہوئی تھی۔ بس ذرا سی تاثر انگیز آنکھیں ضرور تھیں اور بلا کی خود اعتمادی لیے ہوئے اس کا کمزور سا وجود۔ وہ سنبھل کر بولے۔

"یقین کیجئے میں آپ کا تعاقب نہیں کر رہا' مگر آپ میری ایک چیز چرا کر لیے جا رہی ہیں۔"

اس کی تاثیر انگیز معصوم آنکھوں میں حیرت اور پریشانی کی ایک ملی جلی کیفیت اتر آئی۔ اس نے انگشت شہادت سے ان کی طرف اشارہ کیا اور مؤدب لہجے میں بولی۔

"دیکھیے جناب! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر آصف خاموش رہے۔ جھک کر آنچل سے چابی چھڑائی اور مڑ کر بولے۔

"شکریہ' اب آپ جا سکتی ہیں۔"

ساری سچویشن جان کر وہ شرمندہ ہو گئی۔ "سوری سر!" اس کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ "میں یہاں کام کرتی ہوں۔ جس میز پر آپ تشریف فرما تھے میں وہاں تک چیک کرنے گئی تھی کہ "Reserved" کا کارڈ تو نہیں لگایا گیا۔ میرا خیال ہے جبھی یہ۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ اس کی وضاحت سن کر بولے۔ "آپ جا سکتی ہیں۔"

"شکریہ جناب!" وہ پہلی بار مسکرائی۔ "برائے کرم اس بات کا ذکر کسی سے مت کیجئے گا۔ یہ بڑی جگہ ہے۔ یہاں چھوٹے لوگوں کی غلطی معاف نہیں کی جاتی۔"

"آپ اطمینان رکھئے۔" انہوں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ وہ کچھ جلدی میں لگتے تھے۔

"شکریہ۔" وہ مؤدب انداز میں جھکی اور باہر کی سمت چل دی۔ ڈاکٹر آصف اوپر واپس چلے گئے۔

چاند جب آدھے آسمان کا فاصلہ طے کر چکا اور چاندنی کی کرنیں مدھم پڑ گئیں تو ایک دم انہیں اس لڑکی کی یاد آ گئی۔ ہوٹل کے ہنگامے اس دم خاموش تھے۔ احباب جا چکے تھے اور جو کے پانی کا نشہ بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ آج کی شب وہ سکون سے سو جانا چاہتے تھے۔

صرف دو دن پہلے ہی تو اُن کی پوسٹنگ یہاں یونیورسٹی میں فلسفے کے اعلیٰ ترین پروفیسر کی حیثیت سے ہوئی تھی اور صبح انہیں رپورٹ کرنی تھی کہ زندگی کی خوبصورت اور اعلیٰ ترین شاہراہ پر وہ لڑکی ایک سیل خوردہ سنگ میل کی طرح سامنے آ گئی تھی۔

"ایسی بھی کیا بات تھی؟" انہوں نے کروٹ بدل کر سوچا۔ "کوئی بات؟ کوئی ادا؟ یا پھر کوئی حیا کا روپ؟ آخر کچھ تو تھا' جس نے اپیل کیا تھا۔ شاید وہ سیاہ آنکھیں تھیں۔ جن کے اندر ایک دنیا بس رہی تھی۔ بے بسی اور بے چارگی کی ایک داستان رقم تھی۔ وہ باوجود کوشش کے اس انتہائی غیر اہم واقعہ کو ذہن سے نہ مٹا سکے اور وہ ان کی زندگی کی پہلی شب تھی جس میں انہیں ایک معمولی سی لڑکی کے خیال کو ذہن سے مٹانے کے لئے سکون کی گولی کا سہارا لینا پڑا۔

صبح سارے ہنگامے جوان تھے۔ وہ نک سک سے تیار ہو کر جب اپنی لمبی سی گاڑی میں یونیورسٹی پہنچے تو ان کی آمد کی خبر طلباء و طالبات کے حلقے میں تہلکہ مچا گئی۔ اُن کی راہ میں چشم ماروشن دل ماشاد کیے لوگ پہلے تو اُن کی جدید طرز کی گاڑی سے متاثر ہوئے۔ بعد ازاں گاڑی کے اندر سے برآمد ہوتا ہوا اُن کا شاندار سراپا کئی ایک دلوں پر تقریباً قیامت ڈھا گیا۔ قد اتنا ضرور تھا کہ کئی ایک کو اپنے سر بلند کر کے دیکھنا پڑا۔ چہرہ صبح کا سارا اُجالا لئے ہوئے تھا۔ سر پر گھنے بال نہایت قرینے سے جمے ہوئے تھے۔ آنکھیں کچھ کہتی' کچھ سنتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

گاڑی بند کر کے وہ وی سی کے آفس کی جانب بڑھے تو قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ کئی ایک دل دھڑکنے لگے۔ سٹاف اور یونین ممبرز کے ساتھ تعارف کے بعد باہر آئے تو پہلی کلاس ایم۔ اے فائنل کی تھی۔ کلاس میں پہنچے تو ان کی آمد سے پہلے ہی اُن کی ذات پر رواں تبصرہ جاری تھا۔

طلباء و طالبات سے مناسب خطاب کے بعد انہوں نے جب اصل موضوع کی مناسبت سے بولنا شروع کیا تو فن خطابت کے بڑے بڑے ہیرو مات کھا گئے۔ کیا بات تھی؟ اور کیا انداز تھا؟ لگتا تھا کہ زندگی کے اعلیٰ ترین فلسفے کا سارا نچوڑ دماغ کے اندر جمع ہے۔ اس وقت جبکہ وہ انسانی زندگی کے ارتقاء پذیر ہونے کے بارے میں دلائل دے رہے تھے۔ اچانک اُن کی زبان کو بریک لگ گیا۔ وہ کلاس روم کے آخری کونے والے دروازے کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ سامنے سے وہی چلی آ رہی تھی۔ نظریں جھکائے' بڑا سا دوپٹہ اوڑھے۔ وہ بظاہر کچھ بھی نہیں' مگر بہت کچھ نظر آ رہی تھی۔

اس نے ایک نظر ڈائس کے پیچھے کھڑے وجود پر ڈالی۔ شناسائی کا ایک پل اُبھرا اور ڈوب

گیا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور فائل کا فیتہ کھولنے لگی۔ کلاس روم میں خاموشی چھا گئی۔

"سر! آپ کچھ کہہ رہے تھے۔" کسی شریر طالب علم نے آواز لگائی۔ ڈاکٹر آصف نے سلسلہ وہیں سے جوڑا' مگر سب نے یہی محسوس کیا کہ اب کی بار بات کچھ جمی نہیں۔ لیکچر جس شدومد سے شروع کیا گیا تھا۔ اس طرح مکمل نہیں ہوا۔ جانے اضطراب کا کون سا پل کدھر سے آن نکلا تھا کہ ڈاکٹر آصف "تھینک یو" کہہ کر چلے گئے۔ وہ سب سے آخر میں اٹھی اور کامن روم کی طرف بڑھ گئی۔ جب ساری کلاسز ختم ہونے کے بعد وہ واپس جا رہی تھی تو بیرونی سیڑھیوں کے داہنی جانب سے ڈاکٹر آصف نمودار ہوئے۔

"آپ!" وہ کچھ بے تابی اور حیرت سے بولے۔

"آپ...... یہاں......؟"

"میں یہاں پڑھتی ہوں۔" وہ اُسی قدر اعتماد سے بولی۔

"میں کلاس میں لیٹ آنا پسند نہیں کرتا۔" انہوں نے موقع جان کر اپنی استادی کا رعب جھاڑا۔

"مس......؟"

اس نے دیکھا بالکل کل شام والے انداز میں ان کی انگشت شہادت کا رُخ اس کی طرف تھا۔

"وفا......" وہ پلکیں جھکائے بولی۔ "وفا مہر علی۔"

"ہوں!" وہ بڑے اسٹائل سے سگار سلگا کر بولے۔ "وفا مہر علی۔ آئندہ آپ لیٹ نہیں ہوں گی۔"

ڈاکٹر آصف اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

اس نے ان کی روانگی کے بعد نظریں اٹھائیں۔ وہ اب چاروں طرف سے نرغے میں تھی۔

"تم انہیں پہلے سے جانتی ہو؟" پہلا سوال کیا گیا۔

"ہاں۔" اس نے وضاحت کے ساتھ اعتراف کیا۔

"کیسے ہیں؟" دوسرا سوال کیا گیا۔

"تقریباً بالکل سیدھے اور ویسے ہی جیسے کہ اس ملک کے صرف بیس فیصد امراء۔" وہ مسکرائی۔

"دیکھنے میں تو تخت بھائی کا خربوزہ نظر آتا ہے۔" کسی شوخ نے جملہ کسا اور باقی گفتگو ہنسی کی لہروں کے ساتھ بہہ گئی۔

شام کو جب وہ پارٹ ٹائم جاب کے طور پر اپنائی گئی ملازمت نبھانے ہوٹل پہنچی تو اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ ڈاکٹر آصف کل والی میز پر ایک انتظار کی کیفیت میں بیٹھے تھے۔

"ہیلو!" وہ بے تابی سے بولے۔

"ہیلو سر!" وہ مسکرائی۔

"یہاں تو آپ وقت پر پہنچ گئیں؟" انہوں نے بات بڑھائی۔

"یہاں نوکری کا معاملہ ہے۔" وفا نے جواب دیا۔

"اور وہاں ڈسپلن کا۔" انہوں نے صبح والی بات یاد دلائی۔

"مجھے احساس ہے سر۔" اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔

اور ایک خاموشی کا سماں ہر طرف بکھر گیا۔

"آپ۔" ڈاکٹر آصف کی آواز اس سکوت میں اُبھری۔

"آپ کچھ دیر کے لیے یہاں بیٹھ سکتی ہیں؟"

"میں ڈیوٹی پر ہوں سر۔" اس نے یاد دلایا۔

"اچھا۔" وہ کچھ سمجھ لینے والے انداز میں بولے۔ "ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی فرمائیے؟" وفا کے دل کی دھڑکن منتشر ہو گئی۔

"آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟"

وہ اس سوال پر حیران رہ گئی۔ بڑی عجیب بات تھی۔ زندگی کو فلسفے کی آنکھ سے دیکھنے اور طالب علموں کو اتحاد و یگانگت کا سبق دینے والا استاد اپنی شاگرد سے ایسی بات پوچھ رہا تھا۔

"اسی ملک سے سر۔" وہ اعتماد سے بولی۔ "میں پاکستانی ہوں' ویسے بھی انسان کی پہچان کا باعث کوئی خطہ یا علاقہ ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات بھی ہوتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر آصف نے کوئی خاص تاثر دیئے بغیر پوچھا۔ "پھر بھی کوئی علاقہ تو ہو گا ناں کہ۔"

"تو کیا آپ علاقائی سطح پر سوچتے ہیں؟" اس نے بات کاٹ کر سوال کیا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ تیزی سے بولے۔ "مگر پہچان اکثر علاقے کی نسبت سے بھی تو ہوتی ہے نا۔" انہوں نے بات بنائی۔

"سارا وطن اپنا ہے سر۔" وفا نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے ہنس کر کہا۔ "یہ وطن پرایا کس طرح ہوسکتا ہے' جس کے لیے میری ماں کے بھائی قربان ہوئے' میرے باپ کی جائیداد لٹ گئی اور وہ اسی غم میں مرگیا کہ وہ آزاد تو تھا' مگر صاحب حیثیت نہ تھا۔"

ڈاکٹر آصف خاموش ہو گئے۔ وفا نے گھڑی دیکھی اور بولی۔

"میں اب کی بار سات منٹ لیٹ ہو گئی۔" وہ جانے کے لیے آگے بڑھی۔ اچانک اس کی نظر میز پر پڑی چابی پر جا رکی۔ اس نے چابی اُٹھا کر اُن کی طرف بڑھائی اور بولی۔ "اسے سنبھال لیجئے ورنہ یہ پھر میرے ساتھ چل پڑے گی۔"

تھینک یو کہہ کر ڈاکٹر آصف نے چابی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ کام ختم کر کے آئی تو بیلے کی ڈھیر ساری منہ بند کلیاں ڈاکٹر آصف کی میز پر مرجھائی پڑی تھیں۔ وفا رُک گئی اور کسی نامعلوم احساس کے تحت اس نے وہ ساری کلیاں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔

وقت کچھ آگے بڑھا۔ شناسائی کے در کھلے۔ ڈاکٹر آصف کا قیام اسی ہوٹل میں تھا۔ یہ انکشاف بھی باعث حیرت تھا۔ اس رات جب شاہراہ فیصل پر ہوٹل کی گاڑی کا ٹائر جواب دے گیا اور جبکہ کوئی متبادل انتظام نہ ہونے کے باعث وہ پریشان کھڑی تھی تو طلسماتی کہانی کے کسی اُڑن کھٹولے کی مانند ڈاکٹر آصف کی گاڑی بالکل قریب آن رُکی۔ چند لمحوں بعد وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"کس طرف کو جانا ہے؟" ڈاکٹر آصف نے پوچھا۔

جواب میں لب نہ کھلے۔ صرف آنکھیں اُٹھیں مگر بہت کچھ کہہ گئیں۔

"کچھ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب! ذرا آگے کی سمت تو دیکھئے کس قدر گہرا اندھیرا ہے۔ منزل کا کوئی نشان؟ اُمید کی کوئی کرن؟ کچھ بھی تو نہیں۔ میں تو دوسروں کے لیے جینے والوں میں سے ہوں اور ایسے لوگوں کی کوئی منزل' کوئی راستہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ تو تہی دامن ہوتے ہیں۔ اپنے لیے بڑھتے ہیں اور دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ قدرت بھی آس کے سورج سے محرومی ان کی قسمت میں لکھ دیتی ہے۔ دھنک کے رنگوں میں سے کوئی رنگ بھی اُن کا نصیب نہیں بن سکتا۔

آکاش پر چمکتے چاند کو پانے کی تمنا میں وہ صرف مرسکتے ہیں۔ اُسے پا نہیں سکتے کہ وہ تو ان کے نصیب کے دائرے سے باہر ہوتا ہے۔ وہ صرف خواب دیکھ سکتے ہیں' تعبیر نہیں پا سکتے کہ تعبیر کی ڈوری اللہ پاک نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔"

مگر وہ کچھ نہ بولی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموش بیٹھی ونڈ اسکرین کے اس پار اُترتے سیاہ اندھیرے کو دیکھتی رہی۔

"وفا مہر علی!" ڈاکٹر آصف کی گمبھیر آواز اس سکوت میں مخل ہوئی۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"آپ کو کس طرف جانا ہے؟" وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"میرا قیام تو اسی ہوٹل میں۔" وہ مسکرائے۔ "میں تو یونہی ذرا لانگ ڈرائیو پر جا رہا تھا۔"

"کمال ہے سر!" وفا نے ہنس کر کہا۔ "ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بتایئے میں سمجھا دوں گا۔"

"جہاں تک میرا علم ہے پٹرول بہت مہنگا ہے۔ چلیے یہ مان لیا کہ یہ گاڑی تو آپ کی موروثی ہوسکتی ہے مگر اس تنخواہ میں اس فائیو اسٹار ہوٹل اور لانگ ڈرائیو کا خرچہ برداشت کرنا کیا مشکل نہیں ہے؟"

"ضرور ہے۔" ڈاکٹر آصف نے بھی مسکراہٹ کے زاویے بھینچتے ہوئے جواب دیا۔ "وفا شاید آپ نہیں جانتیں کہ میرا باپ ایک جاگیردار تھا اور میں اس کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہوں۔"

"اچھا۔" وہ حیرت سے بولی۔ "تو پھر یہ نوکری؟"

"ارے شغل ہے اپنا۔" وہ لاپروائی سے ہاتھ جھٹک کر کہنے لگا۔ "آپ بتایئے کس طرف کو جانا ہے؟"

"پبلک اسٹاف کالونی۔" وہ اس قدر خود اعتمادی سے بولی۔ گویا کہہ رہی ہو۔ "وائٹ ہاؤس" میں تو وہائٹ ہاؤس میں رہتی ہوں۔

"آپ اپنے متعلق اور کچھ نہیں بتائیں گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے اتنی صفائی سے انکار کیا کہ وہ حیران رہ گئے۔

"کیوں......؟" آواز میں ذرا سا خفگی کا تاثر نمایاں تھا۔

"پھر شاید آپ مجھ پر ترس کھانے لگیں گے اور یہ بات کسی بھی صورت میں مجھے پسند نہیں۔"

ڈاکٹر آصف کچھ نہ بولے۔ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے۔

"بس اس طرف۔" وہ اگلے موڑ پر بولی۔ "داہنے ہاتھ کو روک لیجیے۔ آگے گاڑی نہیں جا سکتی۔"

گاڑی رک گئی۔

"بہت بہت شکریہ سر۔" وہ باہر نکلی اور جھک کر مؤدب لہجے میں بولی۔ "اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

ڈاکٹر آصف منتظر بیٹھے رہے۔ اس نے تکلفاً بھی انہیں اترنے کو نہیں کہا۔ وہ کچھ دُور تک اپنا بیگ ہلاتی ہوئی چلتی رہی اور پھر سڑک کے بیرونی کونے پر اس کا ہیولا غائب ہوگیا۔

* * *

صبح یونیورسٹی میں بڑا ہنگامہ لے آئی۔ یہ خبر ایک سرخی کی شکل میں پبلک کی صفوں میں گردش کر رہی تھی کہ رات کسی وقت وفا مہر علی جو بقول لڑکوں کے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ ڈاکٹر آصف کی گاڑی میں شاہراہ فیصل سے اپنے گھر تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے پائی گئی تھی اور یہ نظارہ اردو ڈیپارٹمنٹ کے ناصر شاہ نے بذات خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' جو اس وقت غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور ٹیوشن پڑھا کر پیدل واپس جا رہا تھا۔ ناصر شاہ تو ویسے بھی دل جلا تھا کہ ایک عرصہ سے وفا مہر علی کے لیے دل میں نازک احساسات لیے اظہارِ تمنا کے انتظار میں تھا' جبکہ وفا مہر علی نے اس کی نگاہِ التفات کا کبھی لحاظ نہ کرتے ہوئے اس کے مسکین چہرے کے زیرِ اثر اس کا نام ملائم شاہ رکھ دیا تھا۔ اب یہ یار لوگوں کا اپنا ظرف تھا کہ وہ ایک لڑکی کے بخشے ہوئے خطاب کے تحت مرعوب ہو کر اس کا اصل نام بھول چکے تھے اور وہ خاص و عام کے حلقے میں ملائم شاہ کے نام سے مشہور تھا۔

پُر اثر آنکھوں والی وفا مہر علی ملائم شاہ کو بے طرح بھا گئی تھی۔ وہ اُسے جذبات کی زبان میں بتا دینا چاہتا تھا کہ بیشک اللہ نے اُسے زندگی جیسی نعمت بخش کر بڑا ہی کرم کیا ہے' مگر اب تک تو وہ ویسے ہی جی رہا تھا کہ اس کی رضا تھی' مگر اب وہ باقی زندگی اس کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ اظہارِ تمنا کی خواہش تو ضرور تھی' مگر ہمت نہ تھی کہ بدلے میں وفا مہر علی کے بدلتے ہوئے تیور وہ خوب جانتا

تھا۔ اب اس عاشق نامراد کو قدرت نے بدلہ لینے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا تھا۔

وفا یونیورسٹی پہنچی تو ملائم شاہ گیٹ کے قریب ہی بنچ پر بیٹھا تھا۔ گھاس کے سبز فرش پر اُس کے چند طالب علم ساتھی براجمان اس کا بیان کردہ فلسفہ سن رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا کہ "تمہیں یہ نہیں معلوم میرے دل میں کیا ہے۔ تم لوگ تو صرف یہ جانتے ہو کہ میری زبان پر کیا ہے۔ لہٰذا دل میں خواہ کچھ بھی ہو زبان میں اخلاق کا عنصر ہونا چاہئے۔"

وفا کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مس وفا!" وہ قدرے سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"فرمایئے۔" وفا رُک گئی۔ ملائم شاہ کا وجود کپکپا گیا۔

"آپ!" وہ بڑی مشکل سے تھوک نگل کر بولا۔ "آپ ڈاکٹر آصف کو کیسے جانتی ہیں؟"

اب یہ بڑا ذاتی سا سوال تھا۔ غضب کی کئی ایک لہریں سیاہ آنکھوں میں اتر آئیں۔

"جیسے آپ جانتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے چھوڑیں۔" وہ طنزیہ ہنسی سے بولا۔ "آپ اپنی بات کریں۔"

"تم یہ سوال پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" وفا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"آپ کی اس طالب علم برادری کا ایک فرد۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "ویسے اُن کی آمد کے پہلے ہی دن آپ اُن کے سامنے نظر جھکائے کھڑی کیا کر رہی تھیں؟"

"شیروانی کے بٹن گن رہی تھی۔" ایک شوخ آواز آئی اور ہنسی کا طوفان ہر طرف بکھر گیا۔

یہ اس کی ذات پر بلاواسطہ طور پر حملہ تھا یعنی کہ دوسرے لفظوں میں اُسے صاف طور پر بتایا گیا تھا کہ وہ جو کچھ ہے سب کو پتہ چل چکا ہے۔ اس بے عزتی کا احساس اس کی انا و خودداری کی مضبوط دیواریں ہلا گیا اور یہ احساس ملائم شاہ کی فتح بن کر سامنے آیا۔ وہ اپنی حیثیت واضح کرنے کی مجبوری میں ملائم شاہ سے بات کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"ناصر صاحب!" اس نے ٹک شاپ کی بیرونی دیوار کے پاس کھڑے ناصر شاہ کو مخاطب کیا۔ مگر وہ انجان بنا کھڑا رہا۔ کسی کی توجہ دلانے پر چونک کر بولا۔

"آپ نے مجھے پکارا؟"

"جی ہاں۔" وفا کا سر جھکا ہوا تھا۔

"مگر میرا نام تو ملائم شاہ ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ "بھول گئیں کیا؟ آپ ہی نے تو رکھا تھا۔"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ نظریں جھکائے بولی۔

"فرمایئے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ "میرے لائق کوئی خدمت؟"

"دراصل بات وہ نہیں جو آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔" وفا نے بات شروع کی۔

"تو پھر کیا کوئی خاص بات ہے؟" وہ انتہائی نامناسب طریقے سے ایک آنکھ بند کر کے بولا۔

"نہیں۔نہیں۔" وہ چلائی اور پھر جھر جھر بہتے بے شمار آنسو بھری برسات کا سماں لے آئے اور آنسوؤں کے اس طوفان میں ملائم شاہ کی ذات قطرہ قطرہ کر کے بہہ گئی۔ بظاہر کرخت مگر اندر سے نازک اور لرز جانے والی وفا مہر علی کس طرح رو رہی تھی۔ وہ آنسوؤں کی زبانی فریاد کر رہی تھی۔

"تم کیا جانو؟ ملائم شاہ کیسی ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو اپنوں کا مستقبل بنانے کے لئے رات دن کام کرتی ہیں۔ ناریل کے سخت اور نہ ٹوٹ سکنے والے خول کی طرح ایک خول ان کی زندگی اور ذات کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے۔ جس کے اندر گودے کی طرح ان کی اصل زندگی اور نرم ذات بند ہوتی ہے۔ مگر وہ پھر بھی زندہ رہتی ہیں کہ شاید کبھی اُن کا نصیب ہوتا ہے۔ کسی غیر مرد کا قرب اس خول کو نہیں توڑ سکتا کہ ذرا سا چٹخ جانے کی صورت میں بھی آواز ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اب وہ وہ نہیں رہیں' جو پہلے تھیں۔ وہ ہنستی ہیں تو صرف اپنے آنسو چھپانے کے لیے۔

مردوں کا دل بہلانے کے لیے نہیں ہنستیں اور یہ ہنستی نظریں اس شکست کا اعتراف ہوتی ہیں کہ وہ زندگی سے نہیں جیت سکیں۔ اپنے سارے آدرش' سارے سپنے اور خواب تج کر وہ زندگی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہیں۔ تم نہیں سمجھ سکتے ملائم شاہ کیسی ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو رات کے اندھیرے میں بغیر کسی ڈر خوف کے مردوں سے ڈرے بغیر ان سے لفٹ لے کر گھر پہنچتی ہیں' کیوں کہ اُن کا گھر پہنچنا ضروری ہوتا ہے کہ کسی کی ماں' کسی کا بھائی یا کسی کا باپ بیماری کی آخری اسٹیج پر دوائی کے اُن چند قطروں کا منتظر ہوتا ہے جو وہ دن بھر کی محنت کے بعد اُن کے لیے لے کر جاتی ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ کسی کو زندگی بخش دینا آسان تھوڑا ہی ہے۔"

آنسو سارے اختلافات بھلا کر ملائم شاہ کا دل نرم کر گئے۔ اس نے باقاعدہ طور پر ہاتھ جوڑ

کر وفا مہر علی سے معافی مانگی اور موقعہ پا کر فوراً ہی نذرانہ دل پیش کر دیا۔ وفا مہر علی مسکرائی۔ حالانکہ انداز قبولیت کا نہ تھا۔ مگر ملائم شاہ کے ناداننستگی میں دیکھے گئے سارے خواب پورے ہو گئے۔

اس شام ہوٹل کے لاؤنج میں ڈاکٹر آصف والی میز خالی تھی۔ وفا نے سیڑھیاں چڑھتے ہی اوپر دیکھا۔ خالی میز اجنبی لگی۔ وہاں مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا چہرہ نہ تھا۔ میز پر خالی ایش ٹرے پڑی ہوئی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر کرسی پر بیٹھ گئی۔ شاید بہت سے لمحات بیت گئے تھے۔

چاند بالکونی کے بالکل اوپر آن کر رُک گیا تھا۔

"آج ڈیٹ پر ہیں کیا؟" منیجر نے ازراہِ تمسخر کہا تو وہ چونک سی گئی۔

"سر! آج طبیعت ٹھیک نہیں۔" وفا نے اس کے کلمات کی ساری چوٹ فراخدلی سے سہہ لی۔

"تو آپ چھٹی کر لیں۔"

"تھینک یو سر!"

وہ دھواں دھواں چہرہ لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں صبح سے جل برسا کر اب تھک گئی تھیں۔ سکون سے سو جانا چاہتی تھیں' آرام کرنا چاہتی تھیں۔ وہ سوئمنگ پول کی طرف آ گئی۔ ذرا دیر کے لیے وہ سوئمنگ پول کے نیچے پانی کے اس چھوٹے سے سمندر میں اپنے آدرش کا عکس دیکھنا چاہتی تھی کہ جلتی نگاہیں کچھ تو سکون پا سکیں۔ سوئمنگ پول پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ چند منٹ رُک کر واپسی کے لیے مڑی کہ اچانک ٹھٹک گئی۔ سوئمنگ پول کے آخری کونے پر کوئی پشت کیے بیٹھا تھا۔ اس وقت دھوپ نہ تھی۔ صرف چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ مگر وہ شخص سر پر ہیٹ پہنے بیٹھا تھا۔ "پاگل" وہ دل میں مسکرائی۔

اچانک ہوٹل کے لان کی طرف سے ایک لمبا سا آدمی اندر کی طرف آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے جیکٹ کے اندر سے ایک لمبا سا لفافہ نکالا جو کہ انتہائی احتیاط سے بند کیا گیا تھا اور غالباً پانی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر کوئی خاص کاغذ چڑھایا گیا تھا جو ہلکی روشنی میں چمک رہا تھا۔ آنے والے نے یہ لفافہ سوئمنگ پول کی طرف پشت کر کے بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور خود تیزی سے واپس چلا گیا۔ دوسرے شخص نے جلتا سگار منہ سے نکالا۔ جھک کر لفافہ کسی بھاری بندھن کے ساتھ باندھا اور پھر ہیٹ اُٹھا کر کرسی پر رکھنے کے بعد سوئمنگ پول میں کود گیا۔

جلتے شعلوں کی سی چنگاریاں وفا مہر علی کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ تیرنے والا گہرائی میں

اُتر گیا۔ اُس کے لمبے سفید بازو چند منٹ بعد سطح آب پر اُبھرے۔ وہ روشنی کی طرف پشت کیے اوپر آیا اور گاؤن پہن کر اندر کی جانب چلا گیا۔

وہ حیران کھڑی رہ گئی۔ یہ شک تھا یا پھر محض وہم، مگر یہ خیال ذہن پر جم گیا کہ وہ شخص دیکھا بھالا لگتا تھا۔ وفا نے ذہن پر بہت زور ڈالا' مگر کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ سر جھٹک کر اس نے اس وہم کو اپنے ذہن سے الگ کر دینا چاہا۔ مگر وہ واہمہ ایک عجب قسم کی حقیقت بن کر ذہن سے چپک گیا تھا۔

وفا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اوپر لاؤنج میں آگئی۔ لاؤنج روشن تھا مگر ڈاکٹر آصف کی میز خالی تھی۔ اس نے پرس میں رکھی بیلے کی خشک کلیاں نکال کر میز پر پھیلا دیں۔ آج بڑی عجب شام تھی۔ جانے کیا ہو گیا تھا۔ سیدھی راہ پر چلتے چلتے وہ ڈگمگا گئی تھی۔ صراطِ مستقیم پر چلنے والا دل اب بھٹک چلا تھا۔

"ہیلو!" گمبھیر لہجے والی مضبوط آواز آئی اور ڈاکٹر آصف بالکل سامنے کھڑے تھے۔

"ہیلو!" اور مسکراہٹ کے کئی زاویے خود بخود ہونٹوں پر پھیل گئے۔

"آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟" انہوں نے پوچھا اور نیلے مخمل کا پردہ داہنی جانب سرکا کر بیٹھ گیا۔

"پردہ مت لگائیے۔" وہ بولی۔ "چاند نظر آرہا ہے۔"

"اوہ!" وہ بے ساختہ مسکرانے لگا۔ "مگر ہمیں دیکھ کر شرما جائے گا۔"

وفا خاموش رہی۔

"آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔" نگاہوں کے روشن زاویے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔

"میں تو فارغ تھی سو یہاں بیٹھ گئی۔" وفا نے بات بنائی۔ "آپ کہاں تھے؟"

"میں ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔" انہوں نے حسب عادت سگار سلگا لیا۔ بیلے کی خشک پتیاں ہلکی ہوا میں لرزتی رہیں اور ڈاکٹر آصف اپنے سامنے بیٹھی خاموش وفا کو دیکھتے رہے۔

خاموشی کے چند لمحے بیتے اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہو گیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔" اس نے اپنی پرانی گھڑی پر نگاہ ڈال کر جواب دیا۔ "اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

وہ جانے کے لیے مڑی۔

"وفا!" ڈاکٹر آصف نے اس کا نام پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ٹھہر گئی۔ یہ پکار بڑی اثر انگیز تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر آصف کو دیکھنے لگی۔

"آپ الیکشن میں کس گروپ کو سپورٹ کریں گی؟"

"میں نے ابھی سوچا نہیں۔" اس نے کہا۔ "ویسے ناصر شاہ کا گروپ برسوں سے حاوی ہے۔ کم از کم لڑکیاں اس کے ساتھ ہیں۔"

"اوہ!" ڈاکٹر آصف مسکرائے۔ "وہ مداری۔" انہوں نے جلتے سگار کو اپنے خاص انداز میں جھٹکا۔ "لڑکیوں کو بنانا جانتا ہے۔"

مگر وفا کو نہ جانے کیوں اس انداز میں ملائم شاہ کا ذکر کرنا اچھا نہ لگا۔

"سیاست میں سب چلتا ہے سر۔" اس نے بات ختم کرنا چاہی۔

"اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ کو چھوڑ دوں۔" انہوں نے پیشکش کی۔

"شکریہ جناب!" اس نے معذرت کی۔ "اس طرح میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

اپنی فطرت کے خلاف ڈاکٹر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا کہ اِردگرد بیٹھے ہوئے لوگ بھی چونک گئے اور وفا بڑی حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"وفا مہر علی!" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔ "ہوٹلوں میں کام کرنے والی لڑکیاں پہلے کون سا نیک نام ہوتی ہیں۔"

اس وقت یکلخت ایک لمحے میں دھرتی و آکاش معصوم وفا کی ذات کے اردگرد گھوم گئے۔ اس کی مجبوری کا احساس کیے بغیر ڈاکٹر آصف نے کیسی کاری ضرب لگائی تھی۔ کتنا گہرا وار کیا تھا۔ انہیں شاید ان الفاظ کی نزاکت کا قطعی احساس نہیں تھا جو وفا مہر علی کا سارا وجود چھلنی کر گئے تھے۔

دُکھ کے گہرے سیاہ بادل اس کے چہرے پر چھا گئے اور آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر خشک بیلے کی ساری کلیاں سمیٹ لیں۔ کچھ اُڑ کر ڈاکٹر آصف کے قدموں سے لپٹ گئیں۔ وفا نے احتیاط سے انہیں چنا اور اپنے دامن میں بھر کر بولی۔

"شکریہ سر!" اور اس کا سراپا گول زینے کی آخری گولائی میں چھپ گیا۔

ایک دم ڈاکٹر آصف کو اپنے ادا کیے ہوئے کلمات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہ تیزی سے نیچے آئے۔ وہ ہوٹل کی گاڑی کا انتظار کیے بغیر فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر آصف نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ رزق عطا کرنے والے خدا کی وہ نازک مخلوق تھی جو اپنے اندر طوفانوں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ لے کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہی تھی۔ مجبوریاں جسے اس بلند عمارت کے اندر کی دنیا تک لے آئی تھیں۔ اس نے کاٹن کا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ دوپٹہ اوڑھنے کا وہی انداز تھا۔ کندھے سے نیلا بیگ حسرتوں کی داستان بن کر لپٹا ہوا تھا۔ یقیناً اس کا دل گھائل تھا اور منزل کا نشان ایک اُلجھے ہوئے راستے کے ساتھ بار بار ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا تھا۔

"وفا!" وہ اک دم پکار اُٹھے۔ اُس آواز کی سمت اس کا حیرت زدہ چہرہ مڑا تو مدھم روشنی میں انگاروں کی مانند جلتی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"رُک جاؤ وفا!" ان کی آواز میں ایک نئے جذبے کی شدت نمایاں تھی۔

"پلیز وفا!" وہ عجز و انکساری کی تصویر بن کر اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ "معاف کر دو میرا مطلب یہ نہیں تھا دراصل۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ نرم آواز میں بولی۔ "گھر سے باہر عورت جب زمانے کا مقابلہ کرنے نکلتی ہے تو اس میں سب کچھ سہنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور......"

"پلیز!" وہ معافی مانگ لینے والے انداز میں بولے۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" ڈاکٹر آصف اپنی صفائی میں بہت کچھ کہتے رہے تھے۔

"آپ نے معاف کر دیا نا؟" وفا نے دیکھا ایک مکمل زندگی رکھنے والا خودمختار ڈاکٹر آصف ایک لڑکی سے معذرت کرتے ہوئے کیسا عجیب لگ رہا تھا۔

"چلیے چھوڑیں۔" بھیگی ہوئی آواز پتوں کی سرسراہٹ کے ساتھ بکھر گئی۔

اسے رکنے کا کہہ کر وہ اپنی گاڑی لے آئے اور وہ سحر زدہ اُن کے ساتھ بیٹھ گئی۔

طویل خاموشی ہر سو بکھر گئی۔

چاند اس شب زندگی کے بے حد قریب چلا آیا اور وفا مہر علی زندگی کی چاندنی کا یہ رنگ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ برسوں بعد یہ کیسا مقام آیا تھا؟ ڈاکٹر آصف نے اس طویل خاموشی سے اُکتا کر

کیسٹ آن کر دی تھی اور مغنیہ کی خوبصورت آواز میں جوں ہی یہ شعر ہوا کے دوش پر بکھرا ۔

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اُڑا کے لے گئے جادو تیری نظر کے مجھے

دونوں کی نگاہیں ایک دم مل گئیں۔ ڈاکٹر آصف کی بولتی نظروں نے کہا۔

"مجھے دیکھو وفا مہر علی۔ یہ میں ہوں جو تمہیں سب کچھ دے سکتا ہوں۔ ایک مکمل اور جاندار زندگی، معاشرے میں اعلیٰ ترین رتبہ، بیگم کا درجہ اور آنکھوں کے تنہا راستوں میں دیکھے گئے سارے خوابوں کی تعبیر۔ تسلیم کر لو وفا مہر علی کہ میرا وجود بے معنی نہیں۔"

وفا مہر علی ان جادو بھری نظروں کے سحر سے پگھل گئی۔ منزل سامنے آ گئی۔ وہ اترنے لگی تو طویل پلو کا ایک سرا دروازے میں اٹک گیا۔

"ذرا احتیاط سے۔" وہ ہنس کر بولے۔ "یہ آنچل بہت مقدس ہے۔ اس میں تم اس شام چابی نہیں بلکہ میرا دل باندھ کر لے گئی تھیں۔"

مگر وفا نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ تو وہاں تھی ہی کب؟ اپنے آورش کے اڑن کھٹولے میں بیٹھی آکاش کی وسعتوں میں پرواز کر رہی تھی۔ ڈاکٹر آصف نے خدا حافظ کہا۔ جلتی نظروں کے بے شمار تیر ایک ایک کر کے دل کی تہہ تک اُتر گئے اور وہ حیرت زدہ کھڑی ان کی گاڑی کی بیک لائٹس دیکھتی رہی جو گہرا سرخ رنگ لیے کسی سہاگن کے وجود کی طرح دہک رہی تھیں۔

لیکن یہ سپنا بھی جلد ہی بکھر گیا۔ کالونی کی چھوٹی سڑک پر برگد کے چوڑے تنے والے درخت کے پیچھے سے ملائم شاہ کا سراپا ابھرا۔ وہ اس وقت ٹیوشن پڑھا کر لوٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں افسردہ اور تھکی ہوئی لگ رہی تھیں اور ان میں مدھم دیے کی ٹمٹماتی لو جیسی روشنی کی تھرتھراہٹ تھی۔

"وفا مہر علی!" اس نے اُونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

وہ دم اپنے آپ میں آ گئی۔ "ہوٹل کی شفٹ ختم ہوئے تو غالباً گھنٹہ بھر بیت گیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ سے مطلب۔" وہ ملائم شاہ کو دیکھ کر پھر پہلے والی وفا بن گئی۔

"مطلب کوئی نہیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "میں تو صرف پوچھ رہا ہوں۔"

"نہ پوچھا کریں۔" وہ جانے لگی۔

"ہم ایک طبقے کے فرد ہیں۔" وہ زبردستی اُسے سمجھانے پر آمادہ تھا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ آپ نے زندگی کا جو راستہ اب چنا ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ آگے بہت گہری کھائی ہے اور......"

"ناصر شاہ!" وفا اُونچی آواز میں بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ تقریر کر کے تم میرا دل جیت لو گے۔" یہ دکھتی رگ تھی۔ ان جذبوں پر ناصر شاہ کا اختیار نہ تھا۔ اپنے ان جذبوں پر دوسروں کی گرفت دیکھ کر وہ بولا۔

"وفا! یقین کرو ڈاکٹر آصف وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"اپنی بات کرو ناصر شاہ۔" وہ غصے سے بولی۔ "اس طرح شارٹ کٹ لگا کر تم وہ نہیں پا سکتے جو چاہتے ہو۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔ ملائم شاہ کے مسکین چہرے پر بے بسی کا عجب سا تاثر اُبھر آیا۔ آنکھوں میں جلتی لو پھڑ پھڑائی اور پھر بجھ گئی۔ گھور اندھیرا ہر سمت چھا گیا۔

* * *

صبح جوان اور رنگین تھی کہ یونیورسٹی میں الیکشن کے باقاعدہ آغاز کا پہلا دن تھا۔ ڈاکٹر آصف نے اپنے طور پر ایک نئے گروپ کو آگے لانے کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ جس میں بقول اُن لوگوں کے ان کے پسندیدہ امیدواروں کو آگے لانے کے لیے چال چلی گئی تھی۔ اب سب لوگ احتجاج کرنے اور نہ تسلیم کرنے کی صورت میں وی۔سی کے آفس پر دھاوا بولنے کی سوچ رہے تھے۔ وفا اس سارے ہنگامے سے بے خبر تھکے ذہن کے ساتھ یونیورسٹی پہنچی۔ جلتی آنکھوں میں کئی ایک ٹوٹے سپنوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ زندگی اس دور میں ایک منجمد سائے کی طرح ایک دوراہے پر آن کر رُک گئی تھی۔

وہ گیٹ سے برآمدے تک کا فاصلہ طے کر رہی تھی کہ ملائم شاہ کے گروپ کی لڑکیوں نے گھیر لیا۔ وہ قبل از وقت کنویسنگ اور ووٹ کا وعدہ لینے کے درپے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنا احتجاج ناکام ہونے کی صورت میں اسے ڈاکٹر آصف کے خلاف دھواں دھار تقریر کرنے پر اُکسا رہی تھیں۔ معصوم اور سادہ دل وفا یہ سن کر لرز گئی۔

"ڈاکٹر آصف کے خلاف نہیں، یہ ممکن نہیں۔" وہی تو ایک تھا۔ زندگی کے بے کراں خشک صحرا میں سراب کی مانند ہی سہی۔ مگر چند لمحوں کی جنت عطا کرنے والا۔ پھر اس کے خلاف وہ کس طرح بول سکتی تھی۔

"نہیں......" وہ ایک دم بول اُٹھی۔ "یہ مقدس درس گاہ ہے یہاں اتحاد و اتفاق کا مرکز ہونا چاہئے۔ کوئی ہنگامہ ہرگز نہیں۔ ہنگامے تو ایسی درس گاہوں کا تقدس پامال کر دیتے ہیں۔"

اس کی ذات میں وہ مقررہ اُبھر آئی۔ جس نے ابتدائی کلاسز سے آج تک جبر و استدلال کی قوتوں کے خلاف سینکڑوں لفظ فی گھنٹہ بول کر کئی انعامات جیتے تھے۔

"بس تم یہی باتیں ذرا مناسب ترتیب کے ساتھ وی سی صاحب کے سامنے کہہ دینا۔" ناہید نے اسے سمجھایا۔

"مگر کسی مناسب ثبوت کے بغیر؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔

"لو تم ثبوت کی بات کرتی ہو۔" ناہید اونچی آواز میں بولی۔

"اس طرح طالب علموں کو علاقائی سطح یا برادری ازم کی ترغیب دے کر سوچنے پر مجبور کرنا اور ایک تیسرا گروپ سامنے لا کر انتشار پیدا کرنا اور کیا ثبوت چاہئے۔ حیرت ہے وفا! تم کس دنیا میں رہنے لگی ہو؟"

وفا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اُسے ڈاکٹر آصف کا پہلا سوال یاد آ گیا۔ "آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟"

"اس عمر میں اتنی قابلیت کے ساتھ اس ذہنی سطح پر سوچ کا ایسا انداز کیوں تھا؟"

"کیا سوچ رہی ہو؟" ناہید نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس زہریلی سوچ کے متعلق کچھ کہہ سکتی۔ چپڑاسی ایک چٹ لیے چلا آیا۔ ناہید نے چٹ لے لی۔

"مس وفا مہر علی ذرا دیر کے لیے میرے کمرے میں تشریف لائیے۔ ڈاکٹر آصف۔"

"تمہیں ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔" ناہید نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ کہا اور چٹ وفا کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ تحریر نظروں کے سامنے پھیل گئی۔ لڑکیوں کے چہروں پر پھیلی طنزیہ اور تلخ ہنسی کو اس نے شدت سے محسوس کیا اور پھر جانے کو مڑی۔

"وفا!" نسرین نے کہا۔ "کوئی ایسی بات نہ کرنا جو ہم سب کے مفاد میں نہ ہو۔"

"میں تم لوگوں سے الگ تو نہیں۔" وہ بولی اور پھر ڈاکٹر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

باہر کا موسم گرما تھا۔ مگر یونیورسٹی میں اعلیٰ ترین اختیارات رکھنے والے ڈاکٹر آصف کا کمرہ ہلکی خنکی لیے ہوئے تھا۔ ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ فرش پر سنہرا قالین پھیلا ہوا تھا۔ سیاہ سطح کی چمک دار آبنوسی میز تھی' جس کے دوسری طرف اونچی شاندار کرسی پر بیٹھے ڈاکٹر آصف کسی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وفا دروازے میں کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

"اوہ کم آن۔" انہوں نے فائل بند کر کے اسے دراز میں رکھا اور پھر تالا لگا دیا۔

وہ نگاہیں نیچی کیے سامنے بیٹھ گئی۔

"آپ ابھی تک ناراض ہیں؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"فرض کیجئے اگر ایسا ہے بھی تو کسی کو کیا پروا؟" وفا کا لہجہ دکھی تھا۔

"یہی بات تو آپ سمجھ نہیں سکتیں وفا۔ بالکل پروا ہے۔"

وفا کا لہجہ دکھی تھا۔ "کس کو؟" مگر اس لہجے سے بیتابی بھی عیاں تھی۔

"مجھے......" ڈاکٹر آصف کی زبان سے صرف ایک لفظ ادا ہوا اور ہر طرف بہاروں کا سماں بکھر گیا۔

"مجھے...... مجھے...... مجھے......" موسم' وقت' فضا سب نے پکار کر کہا۔

"اب رشک کرو۔ وفا مہر علی کہ نصیب بدل گیا۔ رشک کرو کہ بس اب سارے خوابوں کی تعبیر سامنے ہے۔ یہ سامنے بیٹھا مضبوط اعصاب والا مرد اور زندگی کو فلسفے کی نظر سے دیکھنے والا ڈاکٹر آصف اب تمہاری زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔ سنو' انا اور خودداری بے شک اپنی جگہ' مگر اسے مایوس نہ کرنا۔ یہ وقت زندگی کے بے تحاشہ لمبے راستے میں کبھی کبھی صرف چند لمحوں کے لئے آتا ہے۔ یہ گھڑیاں گنوا نہ دینا کہ نصیب کبھی کبھی یاوری کرتا ہے۔"

"شکریہ!" وہ بڑی مشکل سے صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ یہ انداز شرفِ قبولیت کا تھا کہ وفا مہر علی نے اپنے دل کی مان لی تھی۔

"تم نے کیا سوچا؟" انہوں نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟" وہ چونک کر بولی۔

اس طرح اس کے چونک جانے پر وہ بے ساختہ مسکرائے اور کچھ سمجھ لینے والے انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ "تم کس گروپ کو سپورٹ کرو گی؟"

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ناصر شاہ کا گروپ برسوں سے حاوی ہے اور......"

مگر ڈاکٹر آصف نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اب ضروری تو نہیں کہ جو گروپ برسوں سے حاوی ہو وہ ساری خوبیوں کا مرقع بھی ثابت ہو۔"

"یہ گروپ اتحاد کا حامی ہے سر۔" اس نے ایک واضح خوبی کی طرف اشارہ کیا۔

مگر ڈاکٹر آصف نے بات بدل دی۔

"اب تم مجھے سر نہیں کہو گی۔"

"ڈاکٹر آصف تو کہہ سکتی ہوں نا؟" وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں ایسا کہنا واقعی بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ بھی مسکرائے۔

"ایک بات کا مجھے بار بار خیال آتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کونسی بات؟"

"اس شام میرے الفاظ یقیناً سخت تھے کہ ہونٹوں میں کام۔"

وفا نے بات کاٹ دی۔ "کوئی بات نہیں۔ زمانہ تو بہت کچھ کہتا ہے۔"

"مگر میں تو صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔"

"آپ زمانے سے الگ تو نہیں۔"

"ذرا تنہائی میں اپنے دل سے پوچھ لینا۔"

یہ بڑا گہرا وار تھا۔ مگر نہایت خوشگوار کہ دل زخمی ہونے کے بجائے ایک نئے احساس سے سرشار ہو گیا۔

"سنو۔" وہ میز پر آگے کی سمت جھک کر بولے۔ "تم اس مداری طائم شاہ کو سپورٹ نہیں کرو گی۔ دیکھو میں یہ بات اپنے بی ہاف پر کہہ رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ناصر شاہ انسان کی حیثیت سے مجھے نہیں بھاتا۔ مگر اس کی پارٹی مجھے پسند

ہے۔ وہ اتحاد کا حامی ہے۔"

"اوہ......تو......" ڈاکٹر آصف اُلجھ کر بولے۔ "اتحاد ثانوی چیز ہے۔ مقصد دیکھنا چاہیے۔"

"اتحاد کے بغیر مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "متحد ہونا ہی اصل قوت ہے۔"

خفگی کے تاثرات ڈاکٹر آصف کے چہرے پر چھا گئے۔ آس و یاس کے لمحات میں چند منٹ پہلے کے دیکھے گئے سارے خواب تحلیل ہو گئے۔ یہاں بھی مسئلہ اپنی ذات اور انا کا تھا۔ ڈاکٹر آصف نے پہلو بدلا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "میری خاطر وفا!"

یہ جادوگر بول ادا ہوئے اور ایک دم کمرے میں خنکی کا احساس بڑھ گیا۔ "میں سوچوں گی ڈاکٹر صاحب!"

وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"شام کو ملاقات ہو گی۔"

"آپ مجھے ناراض کر کے جا رہی ہیں۔" ڈاکٹر آصف نے کہا۔

وفا ٹھہر گئی۔ بھلا وہ اسے کس طرح ناراض کر سکتی تھی۔ جو زندگی کے خشک اور ویران صحرا میں بادل بن کر آیا تھا۔ وہ تو سائبان تھا۔ ہر طوفان اور موسم کی ہر سختی سے محفوظ کر لینے والا۔ وہ تو پناہ کا نشان تھا۔ جس کی ذات ایک امن گاہ تھی۔ اس کی ذات اور دم سے تو زندگی بدل سکتی ہے اور وہ تو وہ تھا جس نے ان ویران جلتی آنکھوں کو رنگین خواب بخشے تھے۔"

اور وہ ناصر عرف ملائم شاہ کیا تھا بھلا؟ مسکین چہرے اور عاجز' لہجے والا نچلے طبقے کا مرد۔ بات کرتا تو انداز سائل والا ہوتا' جسے اپنی سفید رنگت پر بڑا مان تھا اور وہ اس مان پر ساری دنیا کو اپنا کر جیت لینے کے خواب دیکھ رہا تھا' لیکن حیثیت یہ تھی کہ اُسے صرف اپنے گھر کی گاڑی چلانے کے لیے چار جگہ ٹیوشن پڑھانی پڑتی تھی۔ اگرچہ اس کے دل میں وفا کے لیے محبت و احترام ہی سہی۔ مگر وہ ایک مکمل زندگی بخش دینے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا کہ اس کے حالات اس امر کی اجازت ہی نہ دیتے تھے۔ ٹھیک ہے کہ وہ دوسروں کے لیے سوچتا تھا۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ آخر اس کی اپنی ذاتی زندگی کیا تھی؟

ساری سوچیں ایک لمحے میں ذہن کے پل صراط سے گزر گئیں۔

"ٹھیک ہے۔" وفا کی آواز آئی اور فیصلہ اس طرف ہو گیا جس طرف زندگی کی اُڑان بلند تھی۔

"تھینک یو وفا!" ڈاکٹر آصف قریب چلے آئے اور وہ اس قرب کی تاب نہ لا کر باہر نکل گئی۔

* * *

باہر بڑا ہنگامہ تھا۔ ملائم شاہ کا گروپ بُری طرح چراغ پا تھا۔ پہلے تو صرف دو گروپ ہی آپس میں نبرد آزما تھے کہ ایک تیسرے گروپ کے سامنے آنے کی صورت میں وہ اپنے اپنے مفادات بھلا کر ایک ہو گئے تھے۔ وی۔ سی صاحب کے دفتر کے باہر ہنگامہ جاری تھا۔ اندر شاید کوئی ہنگامی میٹنگ جاری تھی۔ وفا کو اس وقت ڈاکٹر صاحب کا اندر بیٹھ جانا عجیب سا محسوس ہوا۔

"تو کیا وہ صرف معصوم ذہنوں کو لڑوا کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ یہ سارا ہنگامہ دیکھ کر اس نے گھر چلے جانا بہتر خیال کیا۔ مگر زمانے کی نظریں بڑی تیز تھیں۔ تاریک کوریڈور کے آخری سرے تک پہنچ کر اس نے دیکھا کوئی تیزی سے دوڑتا چلا آیا۔

"مس وفا!" ملائم شاہ نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر بمشکل تمام قابو پایا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"گھر۔" وہ جواب دے کر جانے کو بڑھی۔

"کیوں......؟" وہ جرح پر آمادہ تھا۔

"یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"اچھا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "یہاں باہر دم گھٹ رہا ہے۔ یہ دم تو ڈاکٹر آصف کے بند کمرے میں گھٹنا چاہیے تھا۔"

"شٹ اپ۔" وہ چلائی اور ہاتھ کا ایک ہی وار ملائم شاہ کے مسکین چہرے کو عجب رنگ بخش گیا۔ کوریڈور کے سناٹے میں یہ آواز ایک گونج کی شکل میں اُبھری۔ ملائم شاہ جنونی انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے بازو سے پکڑ کر وفا کو جھٹکا دیا اور پھر وہ اس کے ساتھ کھنچتی ہوئی وہاں تک چلی آئی جہاں ہنگامہ ابھی تک جاری تھا۔

اس نے وفا کو سب کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"اس سے پوچھو۔" وہ چلایا۔ "ڈاکٹر آصف اس درجہ بے نیازی سے اس وقت اپنے کمرے

میں کیا کر رہا ہے؟"

"وہ تم سب کے بارے میں سوچ رہا ہے۔" وہ چلائی۔

"ارے واہ۔" ملائم شاہ نے وحشت زدہ قہقہہ لگایا۔

"اس سے کہو کہ اگر ہم سب کے لیے اور اس قوم کے لیے سوچتا ہے تو اس بند کمرے سے باہر آئے۔ جس پر موسم کی شدت کا اثر ہی نہیں وہ باہر آ کر دیکھے تو سہی کہ کیسی دھند پھیلی ہوئی ہے۔"

"آئی ایم ہیر۔" دفعتاً ڈاکٹر آصف کی آواز آئی۔ سب کے سر گھوم گئے۔ وہ مجمع چیر کر آگے بڑھ آئے۔ وہ ہاتھ پیچھے باندھے غضب کے عالم میں چلتے ہوئے ملائم شاہ کے عین سامنے آ کر رُک گئے۔ یار لوگوں کی سٹی گم ہوگئی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایک ذاتی خلش کے لیے سیاست کو درمیان میں لا کر ایک معصوم لڑکی کی بے عزتی کرنا کہاں کا اصول ہے؟" ان کی آواز بلند تھی۔

"اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے طالب علموں کو شورش اور ہنگامے عطا کرنا یہ کہاں کا اصول ہے ڈاکٹر صاحب!"

ملائم شاہ کی پُر احتجاج آواز آئی۔

"شٹ اپ۔" وہ چلائے۔ پھر خدا رسول اور انسانیت کے نام کی کوئی بھی اپیل انہیں ایک دوسرے کا گریبان چاک کرنے سے نہ روک سکی۔ بڑی مشکل سے لڑکیوں کو اس ہنگامے سے بچا کر نکالا گیا۔ انتہا پسندوں نے آتشیں اسلحے کا استعمال کیا تھا اور وہ گولی جو ملائم شاہ کی جان کا نذرانہ لینے نکلی تھی صرف اس کا بازو چھید کر گزر گئی۔ تاہم باقی ماندہ ضربات نے اس کا وجود پارہ پارہ کر کے تقسیم کر دیا تھا۔ پھر اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین گرفتاریوں کی صورت میں ہوا۔ پابندیاں لگا دی گئیں اور اس طرح ایک طویل ہنگامے کا خاتمہ ہوا۔

لیکن جب کبھی کسی محفل میں اس ہنگامے کا ذکر ہوا وفا مہر علی کا نام مرکزی کردار کی حیثیت سے سامنے آیا۔ داستان زاویے بدل بدل کر طویل سے طویل تر ہوگئی اور وہ معاشرہ جہاں کی وہ فرد تھی اب نگاہیں بدل بدل کر اُسے دیکھنے لگا۔ گھر میں زخموں سے چور ماں تھی اور زمانے کے ان فتنوں کو نہ سمجھ سکنے والا معصوم بھائی۔ ان کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے اِردگرد کے لوگوں نے داستان

کو نئے سے نیا رنگ دیا۔ لوگ سنتے گئے اور اضافے کرتے رہے۔ وفا نے ہوٹل سے چھٹی لے لی تھی۔ وہ شاید اپنے آپ سے ڈرنے لگی تھی یا پھر زمانے سے خوفزدہ تھی۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وفا اماں کی پرانی چادر دھو کر رسی پر ڈال رہی تھی کہ دروازے کے نیچے سے دو سیاہ چمک دار بوٹ جھانکنے لگے۔ چند منٹ تک اس کی نظریں ان قدموں سے لپٹی رہیں' پھر دستک کی آواز آئی اور دل کے کواڑ کھل گئے۔ پسینے کی بوندیں پیشانی پر چمکنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک دوبارہ اُبھری اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

تھوڑے فاصلے پر بالکل سامنے ڈاکٹر آصف کھڑے تھے۔ شاندار باوقار اور وجیہہ۔ انہوں نے عادت کے مطابق جلتا سگار تھام رکھا تھا۔

"ہیلو!" وہ مسکرائے۔ "آپ اچھی تو ہیں نا......؟"

"آیئے ناں۔" وہ ایک دم بول اُٹھی۔ انہوں نے مسکرا کر سگار کی راکھ جھاڑی اور اندر آگئے۔ وفا برآمدے میں پڑی کرسی اُٹھا لائی۔

"تشریف رکھیں۔" اس نے مؤدب انداز میں کہا۔ ڈاکٹر آصف بیٹھ گئے۔

"اماں اچھی تو ہیں نا۔" وہ پوچھ رہے تھے اور وفا حیرت سے سوچ رہی تھی۔ اتنا بے تکلف انداز یہ شخص تو قطعی اجنبی نہیں لگ رہا۔

"نہیں اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ آزردہ ہوگئی۔

"آپ ہوٹل نہیں آرہیں۔ چھٹی پر ہیں۔"

ان کی طرف سے محبت کا ذرا سا احساس پا کر اس کا دل بھر آیا۔

"جی ہاں۔" آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"زمانے سے ڈر گئیں وفا؟"

"نہیں۔" وہ سر جھکائے بولی۔ "اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

اماں نے اُسے پکارا۔ وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر آصف نے گھر کا جائزہ لیا۔ بہت چھوٹا تھا' مگر کسی درویش کے ظرف جتنا وسیع۔ سلیقہ' تناسب اور ترتیب ہر چیز سے عیاں تھی۔ برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ سبز بیل لپٹی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف سفیدے کا درخت آسمان کو چھو لینے کا آدرش لیے کھڑا تھا۔

کچے صحن میں مٹی پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا اور سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھے گملوں میں موتیے کی منہ بند کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ اچانک وہ سامنے آن رُکی۔ ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا جس میں سفید رنگ کا مشروب تھا۔

"لیجیے۔" اس نے گلاس آگے بڑھایا۔ "شاید پسند آ جائے بادام کا شربت ہے۔ میں نے خود بنایا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے اس طرح گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ گویا اس ذائقے کے سامنے دنیا کی ہر نعمت بے اثر تھی۔

"باقی سب لوگ ٹھیک ہیں نا؟" وفا کو اپنی بے عزتی کا احساس تو تھا۔ مگر ساتھیوں کی یاد نے مزید اداس کر دیا۔

"ہاں۔" وہ اطمینان سے خالی گلاس لوٹاتے ہوئے بولے۔

"کچھ لوگ تو سرکار کے مہمان۔ باقی ہسپتال میں پڑے ہڈیاں سینک رہے ہیں۔"

وفا نے دُکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔ اپنے ساتھیوں کا اس انداز میں ذکر کرنا اُسے اچھا نہ لگا۔

"آپ کل سے ہوٹل تو آئیں گی نا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی کل میری چھٹی ختم ہے۔"

"میں انتظار کروں گا۔" وہ جلتے لہجے میں بولے۔ وہ اُن کے ساتھ ہی باہر تک چلی آئی۔

"ایک بات کہوں ڈاکٹر صاحب؟"

وفا گلی کے آخری موڑ پر رُک کر بولی اور وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"آپ آئندہ یہاں مت آئیے گا۔" وہ رُک رُک کر بولی۔ "یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

"یہ جگہ......" وہ جواباً اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ "بہت مقدس اور بلند ہے وفا! یہاں میری ذات' میری زندگی اور میرے دل کی ایک قیمتی امانت رہتی ہے۔" انہوں نے ایک سیکنڈ کے لیے اس کے چہرے کا ردعمل دیکھا اور بولے۔ "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" وفا مہر علی کے لب تھرتھرائے۔

اور تاریک گلی کے اس آخری اندھیرے موڑ پر محبت کی شمع جل اُٹھی۔

"مجھے صرف تمہاری تلاش تھی۔" جاتے جاتے وہ مدھم لہجے میں بولے اور طویل گاڑی اُن کا وجود لیے اوجھل ہو گئی۔

* * *

وہ اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے ہوٹل پہنچی تو اس فائیو اسٹار ہوٹل کا رنگ وہی تھا۔ سارے ہنگامے جوان تھے۔ البتہ بالکونی میں وہ میز خالی تھی۔ جہاں پر آنچل کی ایک ذرا سی شرارت نے زندگی کا راستہ ہی بدل دیا تھا۔ وفا اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ یہاں محتاط رہنا چاہتی تھی۔ یونیورسٹی کی طرح کا کوئی بھی ہنگامہ یہاں لگے لگائے رزق کو ختم کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ وفا نے کام شروع کرنے کے لیے نئے اندراج کا رجسٹر اٹھایا ہی تھا کہ دفعتاً فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ساتھ کھڑی اس کی بری ساتھی سوہا کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا۔ مگر وفا نے اس سے پہلے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے بے تابی سے پکارا گیا۔ "یہاں ڈاکٹر کے ایم آصف قیام رکھتے ہیں۔ اُن کے کمرے سے کوئی جواب نہیں آ رہا کیا وہ کہیں باہر گئے ہیں؟"

"جسٹ اے منٹ۔" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سوہا سے پوچھا۔ "ڈاکٹر آصف کے بارے میں کوئی پوچھ رہا ہے۔"

"وہ تو باہر گئے ہیں۔ ابھی چند منٹ پہلے۔ کیا کوئی پیام ہے؟"

"وہ تو موجود نہیں۔" وفا نے فون پر کہا۔

"کوئی پیام؟"

"آپ کون ہیں؟" اُلٹا سوال کیا گیا۔

"میں یہاں کام کرتی ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔

"انہیں بتا دیجیے گا کہ آج صبح جو گجرا پرویا گیا تھا۔ اس میں چوبیس کلیاں تھیں۔" اور فون بند ہو گیا۔

یہ بڑا عجیب قسم کا پیام تھا۔ اس نے اپنی بری ساتھی کو پکارا۔

"یہاں ڈاکٹر آصف کے نام سے صرف ایک ہی شخص قیام پذیر ہے نا؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کے۔ایم۔آصف یعنی خان محمد آصف۔" سوہا نے تفصیل سے بتایا۔

"وہ واپسی کے لیے کچھ بتا کر گئے ہیں؟"

"نہیں۔" سوہا بدستور لاپروا انداز میں اپنا کام کرتی رہی۔ وفا کا ذہن اُلجھ گیا۔ بڑا عجیب قسم کا پیام تھا۔ شاید کوئی مذاق تھا یا پھر کوئی تلخ حقیقت۔ اُسے کل شام کی ملاقات کا منظر یاد آ گیا۔ انہوں نے تو انتظار کرنے کا کہا تھا۔ پھر کہاں چلے گئے؟ سارا وقت اسی اُلجھن میں بیت گیا۔

وفا اپنی شفٹ کی رپورٹ دینے منیجر کے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا ڈاکٹر آصف سوئمنگ پول کی طرف سے آ رہے تھے۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو وہ سراپا انتظار بنے سامنے ہی کھڑے تھے۔

"آپ کہاں تھے؟" انہیں دیکھتے ہی یہ سوال وفا کے لبوں پر آ گیا۔

"دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی ہمارے انتظار میں رک سکتا ہے یا نہیں؟" اس جذباتی جواب پر وفا کی نظریں جھک گئیں۔ ساری کوفت دور ہو گئی۔

"آپ چند منٹ کے لیے میرے کمرے میں چلیں گی۔" ڈاکٹر آصف نے بڑی انوکھی فرمائش کی تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔

"دیکھیے۔" انہوں نے خاص احسان جتانے والے انداز میں کہا۔ "ایک ہم ہیں کہ کل پوچھتے ہوئے آپ کے در تک چلے آئے اور آپ یہاں سے وہاں تک نہیں جا سکتیں۔ بھلا ایسے کیسے چلے گا۔" ان کے شرارتی لہجے سے مستقبل کے ارادے واضح تھے۔

"چلیے ایک نظر ہماری کائنات بھی دیکھ لیجیے۔" اور وفا سحر زدہ سی اُن کے مسکن تک چلی آئی۔

"ڈاکٹر صاحب!" کمرے میں پہنچ کر اُسے اچانک یاد آ گیا۔ "آپ کے لیے ایک پیام ہے۔"

"زہے نصیب!" وہ مسکرائے۔ "کیا آپ کی طرف سے؟" معنی خیز نظریں اگرچہ احساسات اُجاگر کر گئیں تاہم وہ ان نظروں کا مفہوم جان کر بھی انجان بنی رہی۔

"نہیں۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔ "آج کسی نے فون پر کہا تھا کہ جب آپ آئیں تو آپ کو بتا دیا جائے کہ آج صبح جو گجرا پر دیا گیا تھا اس میں چوبیس کلیاں تھیں۔"

"ہیں؟" وہ صرف ایک سیکنڈ کے لیے چونکے اور پھر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دیے۔ اُن کا

اُونچا اور بھرپور قہقہہ کمرے میں اِدھر اُدھر بکھر گیا۔ "کیوں مذاق کر رہی ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے یقین دلانا چاہا۔

"کسی نے مذاق کیا ہے۔" وہ بولے۔ "یقین جانو اب میری زندگی میں صرف ایک ہی کلی وفا کے نام سے مہک رہی ہے۔" اُن کی آنکھوں میں سچ کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔

"وفا! آج میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا تھا۔ جبھی تم سے یہاں تک آنے کی درخواست کی۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کے چہرے کا ردعمل دیکھنے لگے۔

وفا نے ایک نظر اس ایک کمرے کی کائنات کو دیکھا۔ پورے کمرے میں ایک گھر بسا ہوا تھا۔ سب ہی کچھ تو موجود تھا۔ مگر دل کے اندر جیسے کہیں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

"کہیں اس طرح بھی کسی کو تنہائی میں بغیر کسی اعتماد کے پروپوز کیا جاتا ہے۔ یہ جذبے تو ہنگامے چاہتے ہیں۔ ایک گھر ہوتا ہے' جہاں سے ایسی خواہش اُبھرتی ہے۔ کوئی وسیلہ ہوتا ہے' کسی پر مان کیا جاتا ہے' کسی کا مان رکھا جاتا ہے۔ ماں اپنے لال اور بہنیں اپنے بھائی کے سہرے کی آرزو دل میں لیے پروپوزل لے کر آتی ہیں۔ خواہش کی جاتی ہے۔ بڑی منت سے کچھ طلب کیا جاتا ہے۔ بہت کچھ پرکھا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر یہ بندھن بندھتا ہے۔ مگر تم کیا ہو؟ ڈاکٹر آصف؟ بہت امیر مگر بے گھر۔ زندگی کی چاہت کو سمجھنے والا مگر رشتوں کی نازک ڈوریوں سے الگ تھلگ۔ تمہاری یہ زندگی کیسی ہے؟ اس طرح ایک بند کمرے کی تنہائی میں تم ایک مجبور لڑکی کو کتنی آسانی سے کہہ رہے ہو۔

"میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کیسا انداز ہے ڈاکٹر صاحب۔"

وفا کا ذہن ایک الاؤ کی مانند سلگ اٹھا۔ "پھر کبھی بات کریں گے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"نہیں۔" وہ بضد تھے۔ "آج اور اسی وقت۔"

"ڈاکٹر صاحب!" وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ "آپ نے شاید میری ماں کی حالت نہیں دیکھی ورنہ۔"

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر آصف نے اسے اطمینان دلایا۔ "اُن کا علاج' تمہارے بھائی کی تعلیم اور خود تمہاری اپنی زندگی سب کچھ سنور جائے گا۔ صرف تم شرف قبولیت بخش

دو۔ میرا اعتبار کرو وفا۔" بڑی مضبوط گرفت تھی' مضبوط اور پُراعتماد لہجہ تھا اور بڑے حوصلے والا ارادہ۔

اس نے سوچا تقدیر کتنی مہربان ہے۔ برسوں بعد جب زندگی صحرا کی تپش میں جھلس چکی تو ڈاکٹر آصف کی ذات کو ٹھنڈے چشمے کی مانند بنا کر بھیج دیا۔ اب صرف ایک "ہاں" چند بولوں سے سب کچھ سنور جائے گا۔ پھر زندگی کو اس طرح سسک سسک کر گزارنے سے فائدہ؟ اور نگاہیں صاف طور پر اقرار میں جھک گئیں۔

* * *

ان برستی خوشیوں کی اچانک بارش اتنی تیز تھی کہ عقل وخرد کے خزانے بھی بہا کر لے گئی۔ وفا مہر علی سارے زمانے سے بے نیاز ہلکی پھلکی ہواؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے کے بعد واپس گھر پہنچی تو اپنے آشیاں کا ذرہ ذرہ مسکراتا ہوا محسوس ہوا۔ آنگن سے باہر تک سب بیل' موتیے کی کلیاں اور سفیدے کا درخت ایک سرشاری کی سی کیفیت میں جھوم رہے تھے۔ آنگن میں نادان عمر والا وقاص مہر علی جھوم جھوم کر کتب کا سبق یاد کر رہا تھا۔ اماں تکیے کے سہارے مطمئن بیٹھی تھیں۔ آج کوئی غم نہ تھا' نہ ہی پریشانی کہ آج اس گھرانے کی ڈولتی ناؤ کو مدت کے بعد ناخدا مل گیا تھا۔

وفا نے اپنی بے تابی کی کیفیت پر بڑی مشکل سے قابو پایا مگر اس کے قدم اظہار کر رہے تھے کہ آج ان پیروں تلے بھربھری مٹی کے تودے کے بجائے مضبوط زمین اپنے آپ ہی آ گئی ہے۔ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ آج یقین و ایمان کا ایک روپ ڈاکٹر آصف کی صورت میں نظر آیا ہے۔ دایاں ہاتھ سرشار تھا کہ مضبوط گرفت کا احساس ابھی تک حاوی تھا۔ لہراتا ڈولتا وجود پُراعتماد تھا کہ شاید زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ اس وجود کے اندر مقید دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اماں کو اعتماد میں لینے کا مرحلہ مشکل تھا۔ وہ اُن کے سوالات سے گھبراتی تھی۔ انہیں ڈاکٹر آصف کی آمد کا علم تو تھا۔ مگر مقصد نہ سمجھ سکی تھیں۔ وہ زمانہ شناس نہیں تھیں۔ شوہر کی موت کا دُکھ اُنہیں بھی آخری منزل تک لے آیا تھا۔ اس گھر میں اُنہوں نے اپنے شوہر کی زبان سے بیتی امارت کے قصے سن کر زندگی گزاری تھی۔ وہ زمانے کو صرف اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھیں' زبان سے بہت کم بولتی تھیں۔

وفا نے بہتیرا سوچا کہ بات کس طرح شروع کرے۔ مگر اس اُلجھی ڈور کا کوئی بھی سرا ہاتھ نہ آیا۔

دوسرے دن جب ڈاکٹر آصف چاہت کا سمندر دل میں لیے مدعا بیان کرنے آئے تو وہ وقاص کی فرمائش پر اس کے لیے میٹھی روٹی بنا رہی تھی۔ چولہے کے پاس سارا سامان بکھرا پڑا تھا اور وہ روٹی بیلتے ہوئے خالص گرہستن لگ رہی تھی۔ اس کے نازک ہاتھ روٹی کو بڑی مہارت سے ایک خاص انداز میں ڈھال رہے تھے۔ ڈاکٹر آصف اندر آتے آتے رُک گئے۔

بالکل سامنے سر جھکائے بیٹھی وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ سر حسب عادت پلو سے ڈھانپا ہوا تھا۔ نظریں جلتے شعلوں پر تھیں اور ہاتھ کام میں معروف۔

وہ بے حد آزردہ ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی ایک زندگی کا خواب انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ کوئی ان کے لیے سوچے' کوئی ان کا انتظار کرے۔ ایسا ہی ایک مکمل گھر ہو وہ دیر سے آئیں تو کوئی باوفا اور باحیا ہستی بے چینی سے پوچھے۔

"آپ کہاں رہ گئے تھے؟ اتنی دیر لگا دی؟" مگر جانے وہ کہاں سے کہاں نکل گئے تھے۔

"آپا! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔" وقاص نے آواز لگائی تو وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیوں آئے ہیں؟

کئی گل رنگ سویرے چہرے پر آن کر رک گئے تھے۔ وہ اُٹھ کر آگے بڑھ آئی۔ ڈاکٹر آصف برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اماں کی طبیعت کیسی ہے؟" انہوں نے بات شروع کی۔

"ٹھیک ہیں۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ اس وقت وہ یونیورسٹی کے احاطے میں غرور اور اعتماد سے چلنے والی وفا نہ تھی۔ ایک چھوٹی سی معصوم لڑکی نظر آ رہی تھی جو اپنی تقدیر کے سامنے کھڑی فیصلے کی منتظر تھی۔

ڈاکٹر آصف کا جی چاہا اس انداز پر وہ ساری کائنات قربان کر دیں۔

وفا اماں کو سہارا دے کر باہر لائی۔ ڈاکٹر آصف احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ "آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ "آپ تشریف رکھیں۔"

بالکل خاموشی تھی۔ زرد دوپہر کا سورج جھک کر منڈیر تک چلا آیا۔ ڈاکٹر آصف نے باقاعدہ سلسلہ کلام شروع کرنے سے پہلے حسب عادت سگار جلایا۔ اپنی مجبوریوں اور تنہا زندگی کی داستان

بیان کی اور آخر میں وفا کا ہاتھ تھام لینے کی درخواست پیش کر دی۔

اور اماں؟ وہ تو اس طرح حیران پریشان تھیں گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی طویل سپنا دیکھ رہی ہوں۔ جس مسئلے نے انہیں اندر ہی اندر بے طرح پریشان کر رکھا تھا' جس کے لیے وہ اپنا دل جلا تو سکتی تھیں' مگر حال دل کسی کے سامنے بیان نہ کر سکتی تھیں کہ کوئی بھی تو نہ تھا۔ اب وہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ ''وفا کی شادی'' انہوں نے ایک نظر ڈاکٹر آصف پر ڈالی۔ پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑی وفا کو دیکھا اور پھر مدت کے بعد اماں کے ہونٹ مسکرائے۔ یہ شرف قبولیت تھا کہ انہوں نے گھر آئی اس نعمت کو قبول کر لیا تھا۔ وہ تو ہر حال میں شاکر تھیں۔ مگر آج تو رب نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا تھا۔ برسوں سے سنبھال کر رکھی ہوئی فیروزے کی انگوٹھی اماں نے ڈاکٹر آصف کو پہنا کر وفا مہر علی کا نصیب اُن کے پلے باندھ دیا اور وہ دُور بیٹھی سوچتی رہی۔

''دیکھو کون کہتا ہے کہ وہ بے نیاز ہے۔ ارے عظیم ہے وہ۔ عرش پر بیٹھ کر تماشا ضرور دیکھتا ہے۔ مگر خوشیاں دے کر غموں کو تو وہ اپنی مصلحت قرار دیتا ہے۔ صحرا میں پھول اُگانے والے میرے عظیم پروردگار تیرا شکریہ کہ تو نے محبت جیسے اعلیٰ و ارفع جذبے کا مان بڑھا دیا۔'' پھر وقت رخصت وہ کتنے مان سے کہہ رہے تھے۔

''آج سے آپ کی نوکری ختم۔ اب آپ وہاں نہیں جائیں گی۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب وہ حساب کتاب۔''

''وفا!'' وہ مضبوط ارادے کے ساتھ بولے۔ ''آج سے ساری دنیا کے ساتھ حساب کتاب ختم کر دو۔ اب وہ زندگی تمہاری ہے جو میں تمہیں دوں گا۔''

''شکریہ!'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ کھنکتے قہقہوں کی آوازیں بند دروازے کے دوسری طرف سے اُبھریں اور پھر بالکل غیر متوقع طور پر ناہید اور نسرین اندر چلی آئیں۔

''ہیلو!'' ڈاکٹر آصف ہمیشہ کی طرح بڑے سکون سے بولے۔ جبکہ وفا گھبرا گئی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں؟'' ناہید حیران تھی۔

''بالکل۔'' وہ اُسی انداز میں بولے۔ ''آپ یہاں اجنبی ہو سکتی ہیں مگر میں نہیں۔ یہ میری سسرال ہے۔'' دونوں نے قدرے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نسرین بولی۔

''کیوں مذاق کر رہے ہیں؟''

''ولیمے میں آنا نہ بھولیے گا۔ خدا حافظ۔'' وہ جھک کر احتراماً بولے اور پھر دہلیز عبور کر گئے۔

''وفا!'' ناہید کو یقین نہ آیا۔ ''کیا یہ......؟''

''یہ سچ ہے۔'' وہ زمین کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''تو پھر اُوپر دیکھو نا۔'' ناہید نے ہنس کر کہا۔ ''اسے کہتے ہیں نصیبوں کا لکھا۔''

اماں کی زبانی اس بات کی تصدیق نے اس مسئلے کو خوشگوار رنگ دے دیا۔ وہ تینوں برآمدے میں بیٹھ گئیں۔

''چائے پیو گی؟'' اُس نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب کو کیا پلایا ہے؟'' ناہید نے پوچھا۔

''شربت دیدار۔'' نسرین نے گرہ لگائی اور وہ دونوں مسکرانے لگیں۔

وفا چائے بنانے کے لیے چلی گئی۔

جب وہ چائے لے کر واپس رہی تھی تو اُس نے سنا نسرین کہہ رہی تھی۔ ''وفا کو بتا دو۔''

''اب کوئی فائدہ نہیں۔'' ناہید نے بے دلی سے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے ٹرے رکھ کر پوچھا۔

''وفا! ملائم شاہ بہت بیمار ہے۔'' نسرین نے بتایا۔ خوشی کی ان رنگ برنگی گھڑیوں میں بے وقت اور بلا وجہ یہ ذکر وفا کو ناگوار گزرا۔ وہ اپنے تاثرات چھپا کر بولی۔

''اُسے کیا تکلیف ہے؟''

''اس کے زخم بہت گہرے تھے۔'' ناہید نے بتایا۔ ''سیپٹک ہو گیا تھا۔''

''اچھا اللہ پاک رحم فرمائے۔'' اُس نے بات ختم کرنا چاہی۔

''تم اُسے دیکھنے چلو گی؟'' ناہید نے اچانک پوچھ لیا۔

''رہنے دو۔'' نسرین جلدی سے بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔''

''میں نے خود کو فروخت نہیں کیا نسرین۔'' اُس کی انا لوٹ آئی۔ ''میری مرضی ابھی تک میرے اختیار میں ہے۔''

''تو پھر چل رہی ہو ہمارے ساتھ؟'' ناہید نے پوچھا۔

وفا کی نظروں کے سامنے ملائم شاہ کا مسکین چہرا گھوم گیا۔ کیا ہوا جو ایک ذرا سی غلط فہمی سے

راستہ بدل گیا۔ برسوں تک یونیورسٹی میں رفاقت رہی تھی۔ وہی تو ایک تھا۔ اُن کے سارے ڈیپارٹمنٹ میں لڑکیوں کو سپورٹ کرنے والا۔ کسی بھی لڑکی کے خلاف کوئی غلط الزام یا بات سن کر مرنے پر تل جاتا۔ آہ وہ زخمی اور معصوم ملائم شاہ۔

"ہاں!" وہ جلدی سے بول اُٹھی۔ "تم لوگ چائے پیو میں اماں سے پوچھ کر آتی ہوں۔"

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ ہسپتال پہنچ گئیں۔ ملاقات کا وقت تھا۔ ہسپتال کے باہر لال سرخ آنکھوں والا راج بابا گلدستے بیچ رہا تھا۔ وفا نے بھی ایک گلدستہ خرید لیا۔ میڈیکل وارڈ کے چودہ نمبر بیڈ پر ملائم شاہ اپنا زخمی وجود لیے بیٹھا تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر اس کی نظریں حیرت سے پھیل گئیں۔

"زہے نصیب۔" وہ تلخ ہنسی بکھیر کر بولا۔ "آج یہ قدم کس طرح بھول پڑے۔"

وفا کچھ نہ بولی۔ آگے بڑھ کر گلدستہ اُسے تھما دیا۔

"میرے زخموں کو نذرانہ پیش کرنے کا شکریہ۔" اس نے گلدستہ ساتھ رکھی میز پر رکھا اور پھر اعصاب کو پرسکون رکھنے والی گولی اُٹھا کر وفا سے کہنے لگا۔

"ذرا پانی دینا۔"

"پاگل ہو گیا ہے۔" وفا نے سوچا اور پانی کا گلاس اُسے پکڑا کر بولی۔

"سنا ہے تمہارے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔"

"جی نہیں۔" وہ گولی نگل کر بولا۔ "آپ نے غلط سنا۔ دشمن تو بالکل ٹھیک ٹھاک دندناتے پھر رہے ہیں۔ میں ہی بیمار ہوں۔"

"اب کیا حال ہے؟" اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

ملائم شاہ خاموش رہا۔ البتہ اتنی اپنائیت سے اس طرح حال دل پوچھ لینے پر اُس کی گہری نظریں وفا کے چہرے پر پیوست ہو گئیں۔

"شاید مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔"

وفا ان نظروں سے گھبرا گئی۔ کس طرح دیکھ رہا تھا۔

"ناصر!" ناہید نے سکوت توڑا۔ "ایک زبردست نیوز ہے۔"

"کیا......؟" وہ جلدی سے بولا۔ "کچھ ہمیں بھی بتاؤ آج کل تو ویسے بھی اپنا رابطہ بیرونی دنیا

سے کٹا ہوا ہے۔"

"باہر فضا بڑی پرسکون ہے ناصر۔" نسرین نے کہا۔

"ہاں یار لوگ جو اندر ہیں۔" وہ دُکھ سے مسکرایا۔

"وفا کی شادی ہو رہی ہے۔" ناہید نے اطلاع دی۔

"نہیں۔" وہ باوجود نقاہت کے ایک دم سیدھا بیٹھ گیا۔ اُس کے سارے تشنہ جذبات سرخی کا رنگ لیے چہرے پر آ کر رُک گئے۔

"یہ وفا کس کا نصیب بن رہی ہے؟" ملائم شاہ کی آواز دُکھی تھی۔

"ڈاکٹر آصف۔" نسرین نے جوں ہی نام لیا تو ملائم شاہ کی نظریں وفا کے چہرے پر جم گئیں۔ وہاں سچ کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ "ہاں یقین کر لو ناصر شاہ کہ اب زندگی خود بخود میرے قدموں میں چل کر آ گئی ہے۔ اسے ٹھکرانا میرے بس کی بات نہیں کہ اب تو میرا نصیب بھی میرا اپنا نہیں رہا۔ کسی اور کا مقدر بن گیا ہے۔ تم جو چاہو کہہ ڈالو۔ ملائم شاہ مگر میں مجبور ہوں کہ یہ تو دل کے معاملے ہیں۔"

"وفا!" اُس نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "تم لفظ آصف کے معنی جانتی ہو؟" تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ملائم شاہ بولتا چلا گیا۔

"اس لفظ کا مطلب ہے "آندھی۔" نام کا شخصیت پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ تمہیں زندگی کا یہ نیا راستہ مبارک ہو۔ میں دعا کروں گا کہ تم زندگی کی آئندہ راہوں میں اس آندھی کی شدت سے محفوظ رہ سکو کیونکہ آندھی اگرچہ گرمی کی شدت میں قدرت کی ایک نعمت ہی سہی۔ مگر یہ نعمت بڑی خطرناک ہے۔ آندھی جب پوری شدت سے کائنات پر چھا جاتی ہے تو اپنے پرائے کی تمیز کیے بغیر سب کچھ مٹا دیتی ہے اور میں کچھ بھی سہی کیسا بھی سہی کسی کو مٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو۔"

"اوہ ناصر شاہ شاپ اٹ۔" وہ چہرہ دوسری طرف گھما کر بولی۔ "میں یہاں کوئی نصیحت سننے نہیں آئی۔"

"میں جانتا ہوں وفا مہر علی!" وہ گلدستے کی پتیاں بالکل غیر ارادی طور پر نوچنے لگا۔ "تم نے آنا ہوتا تو بہت پہلے آ جاتیں آج تو تمہیں یہاں لایا گیا ہے۔"

"تب تو اچھا صلہ دیا تم نے۔" وہ سرخ چہرہ لیے بولی۔

"دینے والے ہاتھ بڑے بامراد ہوتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔ اس تلخ ہنسی میں نامراد دُکھ کا درد بھی شامل تھا۔

"میں تو خود زندگی کے سامنے دست سوال دراز کیے ہوئے ہوں۔ کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔" آن واحد میں ماحول بدل گیا۔ وہ جانے کے ارادے سے پلٹی تو اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔ "میں تمہارے لئے دُعا کروں گا۔"

"شکریہ۔" وہ ناہید اور نسرین کا انتظار کیے بغیر طویل راہداری عبور کر کے باہر آ گئی۔

باہر کی دنیا میں بے نیازی کا وہی انداز تھا۔ راج بابا سارے غموں سے لاپروا گلدستے بیچ کر اب مطمئن بیٹھا تھا۔ وہ اگلے سٹاپ تک چلنے کے ارادے سے سڑک عبور کرنے لگی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس وقت وفا کا دل بے حد اُداس تھا۔ ڈوبتے سورج نے فضا میں ایک عجیب قسم کی سرخی اور سکوت بکھیر دیا تھا۔

اچانک وہ چونک گئی۔ بالکل سامنے والی عمارت سے ایک لمبے قد والا آدمی باہر آیا۔ وفا سڑک عبور کر کے سامنے آئی تو اُس نے دیکھا وہ راج بابا سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ راج بابا اپنا تھیلا اٹھائے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے آ رہے تھے۔

"آج کتنے گلدستے بکے؟" وہ آدمی پوچھ رہا تھا۔

"صرف دس۔" راج بابا نے بتایا۔

"باقی کے کل بِک جائیں گے۔" اُس آدمی نے جواب دیا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا سامنے والی سرخ پتھر کی عمارت کے دوسری طرف گم ہو گیا۔

وفا جب گھر پہنچی تو اندھیرا چھا چکا تھا۔

* * *

پھر نیا رنگ لیے نیا سویرا طلوع ہوا۔ سب کچھ بغیر کسی تردد کے بہتر اور خوبصورت انداز میں ہوا تھا کہ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ کوئی اجنبیت باقی نہ رہی تھی۔ سب انداز باتیں اور زندگی کا یہ حسین رُخ اپنا سا لگتا تھا۔ ایک سحر زدہ کی کیفیت میں خواب کی طرح وقت گزرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اور مدھم مدھم سناٹے زندگی پر بکھرنے لگے۔ اُس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ ڈاکٹر

آصف جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر ساری کشتی کو پار لگانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب وہ وفا کے علاوہ اُن دو نفوس کو بھول چکے تھے جو اُسی شکستہ ناؤ پر سوار زمانے کے رحم و کرم پر تھے۔

وہ سب سے پہلے اپنی زندگی اک تناسب پر لانے کی سوچ رہے تھے۔ وہ ہوٹل چھوڑ کر ایک وسیع کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔ زندگی اُن دنوں حسین رُت کی طرح مہربان تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کے ذہن سے اماں اور وقاص دونوں کا خیال نکل گیا تھا۔ شادی کے تیسرے ماہ اُنہوں نے بڑے اطمینان سے اطلاع دی۔

"وفا! میں یونیورسٹی کی نوکری چھوڑ رہا ہوں۔"

"پھر......؟" وہ پریشان ہو گئی۔ "کیا کریں گے آپ؟"

"میں بزنس کرنے کی سوچ رہا ہوں۔" اُنہوں نے کہا۔ "ویسے تو بابا کی جائیداد۔"

اس ذکر کے ساتھ ہی وفا کو اماں یاد آ گئیں۔ اُس نے فوراً اُن کی بات کاٹ دی۔

"ڈاکٹر صاحب! آج اماں کی طرف چلتے ہیں۔ کتنے ہی دن گزر گئے ہیں۔"

"ہاں۔" اُنہیں بھی اچانک جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی۔

"ایسا کرتے ہیں اُنہیں یہاں ہی لے آتے ہیں۔"

"وہ نہیں مانیں گی۔" وفا نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اماں پرانی روایت کی پابند ایک خاندانی عورت ہیں۔ وہ کسی بھی صورت میں داماد کے گھر رہنے پر راضی نہ ہوں گی۔

"مگر انہیں یہاں آنا ہی پڑے گا۔" وفا کچھ حیران سی ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر آصف کا لہجہ خلاف توقع سخت تھا۔ "اس طرح ہمارا بار بار وہاں جانا میرے سٹیٹس کے خلاف ہے۔"

یہ پہلا وار تھا۔ بہت سخت اور گہرا۔

"یہ؟ آپ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ بات تو آپ کو پہلے سوچ لینی چاہئے تھی۔"

"اُدفوہ بھئی میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ اُلجھ کر بولے۔ "ایک تو عورتوں کی ساری قوم کو رونے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔" وہ اُس کی طرف مڑے۔ "اب چلئے بھی یا یہاں ہی کھڑی نیر بہاتی رہیں گی۔" وہ خاموشی سے ان کے ہمراہ چلی آئی۔

دونوں نے اماں کی ہزار منتیں کر ڈالی تھیں۔ مگر اماں کسی بھی طرح اپنا مسکن چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھیں اور تو اور اُس بالشت بھر کے چھوکرے وقاص نے بھی کھڑے کھڑے اس موضوع کی مخالفت میں اچھی خاصی تقریر کر ڈالی تھی۔ وقت رخصت اُس نے بڑے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں آپا ہم لوگ واقعی یہاں بہت خوش ہیں۔"

واپسی پر ایک دُکھ کے احساس کے ساتھ وہ روتی آئی تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف نے دو چار مرتبہ اُس کی طرف دیکھا اور پھر بولے۔ "حقیقت کا سامنا کرنے کی عادت ڈالو۔ اب تم جان چکی ہو گی کہ میں عورتوں کے آنسوؤں سے متاثر نہیں ہوا کرتا۔"

اور سارے آنسو ایک ایک کر کے دل کے صحن میں گرنے لگے۔

ڈاکٹر آصف نے وقاص کے لیے ہر ماہ رقم بھجوانی شروع کر دی۔ جسے اماں نے بڑی مشکل سے قبول کیا کہ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا کیوں کہ اس کشتی کے ناخدا کو خود ہی اپنی منزل مل گئی تھی۔ وہی منزل کہ جہاں ڈاکٹر آصف کی ذات ہی اول تھی اور آخر بھی۔ یہ پہلا وار تھا مگر وہ بڑے صبر سے سہہ گئی۔ گھر بنا اور سج بھی گیا تھا۔ شب و روز کے انداز بھی بدل گئے تھے۔ وسیع "آصف لاج" کے دوسرے سرے پر آفس بنا دیا گیا تھا۔ وفا نے اس پر صرف ایک مرتبہ احتجاج کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! گھر کے اندر آفس کچھ بجتا نہیں۔"

"وفا!" وہ جذباتی لہجے میں بولے۔ "میں بھلا تم سے دُور دن کا بیشتر حصہ کس طرح گزار سکتا ہوں۔"

باحیا اور باوفا بیوی نے اپنا سر جھکا لیا کہ اب تو مجازی خدا کا ہر فیصلہ ہی حرف آخر تھا۔ اگرچہ یہ بڑا مہنگا سودا تھا کہ اس کے بعد پھر زندگی اپنی نہ رہی۔

* * *

وقت نے شناسائی کے کئی در کھولے تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر آصف بے طرح' بے موقع اور بے محل حکم چلانے کے عادی تھے۔ نوکروں کی ایک فوج ظفر موج انہوں نے خاص اس مقصد کے لیے جمع کر رکھی تھی۔ راج بابا کا رزق بھی اُسے وفا کے در پر لے آیا تھا۔ وہ آصف لاج کے طویل و عریض لان کا مالی تھا۔ البتہ شام کو وہ حسب سابق ہسپتال کے دروازے پر گلدستے بیچا کرتا تھا۔ ان سب پر

ڈاکٹر آصف کا انداز حکم دینے والا تھا۔ اس کے اثرات وفا کی زندگی پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔

صبح ہوتی تو شب بھر...... حسین انداز کے ساتھ جذبے لٹانے والا مہربان اجنبی بن جاتا۔ معمول سے ہٹ کر کوئی بھی بات ہو جاتی تو ساری مروت اور محبت آن واحد میں آکاش کی طرف پرواز کر جاتی۔ زمین پر صرف روتا ہوا نصیب رہ جاتا۔ آنسو پونچھتی وفا بھاگ بھاگ کر ہر حکم بجا لاتی۔ کبھی کبھار پل بھر میں اُن کا موڈ خوشگوار ہو جاتا۔ وہ آفس چلے جاتے تو حیران و پریشان وفا ان کی نوازشوں اور مہربانیوں کے پھندے میں اُلجھ کر سوچتی رہ جاتی۔

"تو کیا شادی اس لیے بھی کی جاتی ہے کسی کو زیر کرنے کے لیے۔ اپنی حاکمیت جتانے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ دیکھو میں تو صرف میں ہوں۔ نکاح کے چند بولوں سے خدا سے ذرا کم مگر مجازی خدا جیسا اعلیٰ و ارفع رتبہ حاصل کر لینے والا۔ اب تم سنبھل کر رہنا کہ تم مخلوق ہو اور میں خالق۔ اب میں جو چاہوں تمہیں دوں' جس طرح چاہوں تمہیں رکھوں تم نہیں بول سکتیں کہ خالق اور مخلوق کے درمیان تو شہہ رگ کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت فاصلہ ہے۔ مخلوق نادان ہوتی ہے آسمان کی طرف دیکھنے کی سکت تو رکھتی ہے۔ مگر زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ پاٹ لینے کی سکت نہیں رکھتی۔"

پر کچھ بھی سہی...... سارے دُکھ درد کی تان صرف ڈاکٹر آصف کی ایک مسکراہٹ پر ٹوٹ جاتی۔ وہی مسکراہٹ جو روزِ اول سے پیام زندگی بن کر وفا کے وجود سے لپٹ گئی تھی۔ آفس ٹائم کے بعد وہ آتے ہی اُسے پکارنا شروع کر دیتے اور وہ اس پکار کو ایمان جان کر سب کچھ قربان کر دیتی۔

اُمنگوں بھری رُت کا زمانہ بیت گیا تو سانولی سلونی شاموں میں ڈاکٹر آصف کچھ زیادہ ہی مصروف رہنے لگے۔ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ انہوں نے اپنا وقت صرف اپنے لیے بچا لیا۔ آفس ورک شام کو گیم' سوئمنگ کے لیے جانا بھی معمول تھا۔ رات گئے تک دوستوں کی محفلیں۔

اور لمبے لمبے محیط سناٹے وفا کا مقدر بن گئے۔ وقاص کبھی کبھار چلا آتا تو سناٹے ٹوٹ جاتے' بکھر جاتے۔ اس کے معصوم قہقہے زندگی کا ایک نیا پیام بن کر گونجنے لگے۔ امی کی طرف سے بھیجی گئی دعائیں زندگی کا نیا آسرا محسوس ہوتیں اس طرح جینے کی آس بڑھ جاتی۔

* * *

بارہ مارچ کی شام بہت اداس تھی۔ شادی کی سالگرہ کا دن تھا مگر ڈاکٹر آصف کسی اہم میٹنگ میں معروف تھے۔ وقاص ابھی ابھی واپس گیا تھا۔ وہ اُسے گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تو ڈاکٹر آصف بھی آفس کی سمت سے چلے آئے۔

"کہاں گئی تھیں؟" اُنہوں نے اُسی مسکراہٹ سے کہا جس نے زندگی کے سارے اپنے انداز چرا کر اُسے نیا رنگ بخش دیا تھا۔

"وقاص آیا تھا۔" وفا نے بتایا۔

"کیا رقم کی ضرورت تھی؟" اُنہوں نے فوراً ہی پوچھ لیا۔ وفا کی دُکھی نظریں اُٹھیں۔ "کیا اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں۔" اس کا دل درد سے بھر آیا۔ "جب یہ رقم نہیں ملتی تھی۔ تب بھی ہم زندہ تھے ڈاکٹر صاحب۔"

"بہت تلخ ہو رہی ہو۔" وہ کچھ ناراض سے ہو گئے اور بریف کیس تھامے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔ دُکھی اور اداس وفا ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ باہر سورج کی آخری کرن بھی کھو گئی۔

ڈرائنگ روم میں رکھا ٹیلی فون بج اُٹھا۔ وفا نے ریسیور اٹھایا مگر بیڈ روم میں رکھے سیٹ کا ریسیور ڈاکٹر آصف اُٹھا چکے تھے۔

"ہیلو۔" اُن کا مخصوص لہجہ تھا۔

"سر۔" دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "کل صبح جو گجرا بھیجا گیا تھا۔ اس میں چالیس کلیاں تھیں مگر دس کھو گئیں۔"

"کہاں؟ کس طرح؟" وہ دھاڑے۔

"میں تفصیل نہیں بتا سکتا۔" آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"سنو۔" خلاف توقع وہ نرم لہجے میں بولے۔ "اس نمبر پر بات کرنا درست نہیں۔ تم مجھے آفس کے نمبر پر رنگ کیا کرو اور ہاں میں سوئمنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے وہیں ملو۔" فون بند ہو گیا۔

بے حد حیرت کے عالم میں وہ ریسیور تھامے کھڑی رہی۔ حتیٰ کہ قدموں کی چاپ نے سکوت توڑا۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا اور بغلی دروازے سے نکل کر ڈرائنگ ہال کی طرف آ گئی۔

ڈاکٹر آصف تیز قدموں سے چلتے ہوئے آفس کی طرف بڑھ گئے۔ وفا بیڈ روم میں آئی تو سامنے بیڈ پر کچھ مانوس چیزیں پڑی تھیں۔ سوئمنگ کاسٹیوم، نیلے رنگ کا گاؤن اور ایک ہیٹ۔ ایک دم اُس کے ذہن میں فائیو سٹار ہوٹل کی وہ شام اتر آئی۔

وہ اجنبی؟ جس نے اُس وقت یقیناً بغیر کسی مقصد کے سوئمنگ پول میں چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ اُس نے بھی ایسا ہی گاؤن اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کون تھا؟

ڈاکٹر آصف اندر آ گئے۔

"اوہ۔" وہ اُسے یہاں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ "آج میں کچھ لیٹ ہو گیا۔" وہ ساری چیزیں اُٹھا کر باہر نکل گئے اور چند لمحوں کے بعد سیاہ گاڑی اُن کا وجود لیے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

تیز آندھی کے چلتے ہوئے بگولے چاروں طرف پھیل گئے۔ اُس کی اپنی ذات کے وسیع صحرا میں درد کی ہوائیں اپنے اندر پُراسرار اور گہرے اسرار و رموز لیے چلنے لگیں۔ خدا جانے یہ سب کچھ کیا تھا؟ کس لیے تھا؟ کیوں تھا؟ اور کس طرح تھا؟

وہ وحشت زدہ دل سنبھالے باہر آ گئی۔ اپنا ہی گھر آج اجنبی لگ رہا تھا۔ سبزہ لان کے آخری سرے پر راج بابا خلاف توقع موجود تھا۔ اُس کا تھیلا ایک طرف پڑا تھا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

وہ بالکل غیر ارادی طور پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈاکٹر آصف کے دفتر کی طرف آ گئی۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور نمبروں والا تالا جھول رہا تھا۔ دوسری طرف سے گھوم کر وہ پچھلے برآمدے میں جا رکی۔

باہر والی دیوار کے سفید سرے پر ایک چوڑا سا ہاتھ نمودار ہوا۔ وفا گھبرا کر ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ چوڑے ڈیل ڈول والا ایک آدمی دیوار پھلانگ کر اندر آیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ سیدھا راج بابا کی طرف بڑھا۔

"آج کتنے گلدستے بکے؟" اس نے سوال کیا۔

"کوئی نہیں۔" راج بابا نے افسردگی سے کہا۔ "الٹا دس کلیاں کھو گئیں۔"

"اچھا پھر......؟" آنے والے نے حیرت سے پوچھا۔

''صاحب بہت پریشان ہیں۔'' راج بابا نے بتایا۔

''اس وقت کہاں ملیں گے؟'' وفا نے اس کی آواز سن کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ تو وہی آدمی تھا' جسے وہ ہسپتال سے نکلتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ وفا کا سارا وجود لرزنے لگا۔

''صاحب اس وقت زیرو پوائنٹ پر ملیں گے۔'' راج بابا نے بتایا۔

آنے والا اُسی راستے سے واپس چلا گیا۔ راج بابا بھی اپنا تھیلا اُٹھائے باہر نکل گئے۔ وفا اوٹ سے باہر آئی۔ پہلے برآمدے میں آفس کا دوسرا دروازہ کھلتا تھا۔ اُس نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا اور خلاف توقع ہلکی سی جنبش سے دروازہ کھل گیا۔ لگتا تھا کہ بند کرتے وقت احتیاط نہیں کی گئی۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔

ایک وسیع ہال تھا جسے ڈاکٹر آصف نے کانفرنس روم کا نام دے رکھا تھا۔ درمیان میں لمبی سیاہ میز موجود تھی اور اطراف میں کئی ایک کرسیاں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر جگہ جگہ ایش ٹرے پڑی تھیں جن میں ایک ان کہی داستان کی طرح راکھ اور ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ مضبوط لوہے کی بلند و بالا الماریاں تھیں جن میں کئی ایک گہرے راز چھپے ہوئے تھے۔

بالکل سامنے ہی دیوار میں ایک دروازہ نصب تھا۔ گہرے سرخ مخملی پردے نے دروازے کا وجود چھپا رکھا تھا۔ وفا نے پردہ ہٹایا۔ دروازہ کھولا اور چند لمحوں کے بعد وہ ڈاکٹر آصف کے ذاتی آفس میں کھڑی تھی۔ وفا نے ایک طرف لگے سوئچ بورڈ کو دیکھ کر لائٹ آن کی۔ فوراً نظروں کے سامنے لہو رنگ بکھرتا چلا گیا۔ لال سرخ قالین نے یہاں سے وہاں تک سارے فرش کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وسیع میز پر کئی ایک فائلیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں اور ٹیلی فون سیٹ اپنے اندر بے شمار راز سمیٹے خاموش پڑا تھا۔ وفا کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر پڑی فائلوں میں سے اُس نے سیاہ جلد والی بڑی سی فائل اُٹھائی اور پہلا صفحہ کھولا۔ یہ ایک تحریر شدہ حلف نامہ تھا۔

''ہم کوئی بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ ہمارا کوئی وطن' کوئی مذہب نہیں۔ ہمیں اس چمن کو جلانا ہے۔ سرخ آندھی بن کر چھا جانا ہے۔ یاد رکھو تمہیں یہاں تک پہنچانے والے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تم نے اس نسل کو کھوکھلا کرنا ہے۔ اِسے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اس کے لیے تم جو بھی راستہ اختیار کرنا چاہو کرو۔ ان کی سیاست میں ہر طرف چھا جاؤ۔ ان کے اپنے ذہن منجمد کر دو۔ ان کی نئی نسل کو ادب کے خارزار میں ایسا لٹریچر دو کہ یہ کسی قابل نہ رہیں۔ انہیں علاقائی سطح پر سوچ دے کر ان

کی سیاست کا رُخ انتشار کی طرف پھیر دو اور سنو اس راستے پر واپسی کی کوئی منزل نہیں۔ تم ایک پُر آسائش زندگی کے لیے یہ کام کرو گے اور یہ پُر آسائش زندگی اُس وقت تک تمہارا مقدر رہے گی جب تک کہ تمہارا دم باقی ہے۔

بولو...... منظور ہے۔''

اِس حلف نامے کے نیچے لکھا تھا۔

''میں خان محمد آصف بقائمی ہوش و حواس اِس حلف نامے پر دستخط کرتا ہوں۔''

وفا کا سر گھوم گیا۔ خدا جانے یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کون لوگ تھے؟ اُس نے دوسری فائل کھولی تو شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔

اس کی محبت؟ اُس کا مان اور مجازی خدا ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ وہ غیروں کے اشارے پر چل کر تقسیم کے غیر قانونی ملزموں کی پشت پناہی کرنے والا ملزم تھا۔ وہ اُس ملک کا دشمن تھا۔ جس کے لیے وفا کے خاندان کی داستان قربانی کا سمبل تھی۔

برسوں بعد اباجی کی آواز اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

''تقدیر کا گلہ نہ کرنا میری بچی بلکہ مقدر پر شاکر رہ کر جیو۔ کیا ہوا جو ہم لوگ صاحب حیثیت نہ رہے۔ آزاد وطن تو مل گیا اور ایسی انمول نعمت کے لیے یہ کوئی بڑی قربانی تو نہیں......''

اور اکثر گرما کی اداس شاموں میں وہ وقاص کو سمجھایا کرتے۔ ''یہ وطن بنانے میں دو نسلوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک نے سوچا' دوسری نے بنایا اور اب تم ہو نمبر تین جس نے اِس کی حفاظت کرنی ہے۔''

نادان اور کم سن وقاص اقرار میں سر ہلایا کرتا۔

اباجی حب الوطنی کا درس دیتے ہوئے رخصت ہو گئے اور تقدیر نے ایک بھیانک مذاق کرتے ہوئے اُسے کیا بنا ڈالا۔ ایک مجرم کی بیوی اور مجرم بھی ایسا کہ جس کا جرم قابل معافی ہی نہیں۔

وہ راستہ جو پھولوں سے سج گیا تھا۔ خاردار کانٹوں سے بھر گیا۔ قدم قدم آبلہ پا تھا۔ وہ ایک تلخ اور بھیانک حقیقت کا سامنا کرنے کے بعد کمرے میں آ گئی۔ وفا نے کھڑکی سے باہر کی سمت دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ سیاہ چشمہ لگائے گاڑی سے اُترے' چشمہ اُتار کر ڈیش بورڈ میں

رکھا۔ ملازم نے آگے بڑھ کر کاسٹیوم سنبھالا اور صاحب کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

ڈاکٹر آصف اندر آ گئے۔ وفا بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

"ہیلو......" وہ خوش دلی سے بولے۔ لگتا تھا کسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بعد آئے ہیں۔

"چاند کو دیکھ رہی ہو؟" وہ قریب آ کر بولے۔

"ہاں گہنا گیا ہے نا۔" اُس نے جواب دیا۔

"وفا!" انہوں نے حیرت سے کہا۔ "اداس ہو۔"

"نہیں......دُکھی ہوں......" آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے نرم آواز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" وفا اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"آپ کون ہیں؟"

ایک بلند قہقہہ اُبھرا' جو کبھی کبھی اُن کی اس پُراسرار شخصیت کا حصہ بن جایا کرتا تھا اور جس کی آڑ میں وہ اکثر اپنے چہرے کے تاثرات چھپایا کرتے تھے۔ سناٹا ٹوٹ گیا۔

"آج پوچھ رہی ہو۔ شادی کے ایک سال بعد' جانے دو۔" وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "کیوں مذاق کرتی ہو۔" وہ اُس کے چہرے پر پھیلی مدوجزر کی کیفیت نوٹ کرنے لگے۔ وہاں یکساں سناٹا تھا۔

"مجھے یاد ہے کہ آج بارہ مارچ ہے۔" انہوں نے اس سکوت سے اُکتا کر بات بنائی۔ "مگر آج کام کچھ زیادہ تھا۔"

"آپ کس کے لیے کرتے ہیں اتنا زیادہ کام۔" وفا نے پوچھا۔ "ہم دو ہی تو ہیں۔"

"ارے کیا بات کرتی ہو۔" وہ مسکرانے لگے۔ "تو کیا ہمیشہ دو ہی رہیں گے۔ اولاد تو ایک نعمت ہوتی ہے۔ اُسے بہتر زندگی دینا کیا ہمارا فرض نہ ہوگا۔"

"آپ بہت دُور کی سوچنے لگے۔"

اور اُس کا دُکھی دل چلایا۔

"شکر ہے ڈاکٹر آصف کہ اللہ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا ورنہ ایک غدار کے بچے کی ماں کہلانا میرے لئے کوئی اعزاز نہ ہوتا۔"

رات دھیرے دھیرے کمرے میں پھیل گئی۔ آج در و دیوار بے حد اجنبی لگ رہے تھے اور وفا کو اپنے قریب بیٹھے اپنے مجازی خدا سے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ ایسے خوبصورت وجود کا طرزِ عمل اتنا مکروہ ہوگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سچ ہے دیکھنے اور پرکھنے میں بڑا فرق ہے۔

"وفا!" وہ حسبِ عادت سگار جلا کر بولے۔ "پتہ نہیں کبھی کبھی مجھے یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ تم مجھ سے شادی کر کے خوش نہیں ہو۔"

"آپ نے مجھے فرش سے عرش تک پہنچا دیا۔ میں تو آپ کی احسان مند ہوں۔"

ڈاکٹر آصف نے بڑے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ روکھا' پھیکا لہجہ اور طنزیہ الفاظ بیگانگی کا رنگ لیے ہوئے تھے۔

"ہاں شکر گزار تو تمہیں ہونا ہی چاہیے۔" وہ برا مان کر بولے۔ "وہاں تمہارے پاؤں کے نیچے صرف مٹی تھی۔ یہاں بیس ہزار کا قالین بچھا ہے۔"

وفا نے دُکھ سے اس دوہری شخصیت والے انسان کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکائے بولی۔

"مجھے اُس مٹی پر فخر ہے۔ وہ میری اپنی دھرتی کی مٹی تھی۔ یہاں غیروں کا بخشا ہوا قالین ہے جس نے میری دھرتی ماں کا چہرہ مجھ سے چھپا لیا ہے۔"

"بڑی وطن پرست ہوگئی ہو۔" وہ راکھ جھاڑ کر بولے۔

"یہ دھرتی ماں والے ڈائیلاگ صرف فلموں میں اچھے لگتے ہیں۔"

شادی کی سالگرہ کا پہلا دن اور رات آہستہ آہستہ فاصلے بڑھانے لگے۔

ڈاکٹر آصف تکیہ اٹھا کر اظہارِ ناراضگی کے طور پر گیسٹ روم میں چلے گئے اور وہ تنہا سلگتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ "کس کو بتائے اور کس طرح بتائے کہ...... دیکھو وفا نے محبت کے نام پر کیسا دھوکہ کھایا ہے۔ وہ تو وہ نہیں تھا' جس کو اُس نے اپنا مقدر' اپنا نصیب جانا اور جس کی چاہت اُس کا نصیب بنی۔ وہ تو اپنی وفائیں بیچ چکا تھا۔ تقدیر کے پلڑے کا جھکاؤ کسی اور ہی رُخ تھا کہ ایک طرف وہ خود تھی' اُس کا گھر' محبت اور زندگی۔ دوسری طرف وہ زمین تھی جو لہو کے نذرانے لے کر وجود میں آئی تھی۔ جس کے لیے ماؤں نے اپنے راشد' سرور اور عزیز بھٹی قربان کر دیے تھے۔ پھر یہ گھر اور محبت کیا چیز تھی؟

بے اختیار اُسے نثار ماموں یاد آ گئے۔ وہ اماں کے میکے کی آخری نشانی تھے جو کہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ایک سرحدی چوکی پر شہید ہو گئے تھے۔ اماں نے اُن کا دُکھ مسکرا کر جھیلا تھا کہ جان کا نذرانہ انہوں نے ایک مقدس خرمن پر قربان کیا تھا۔

ایک دم اس کا وجود سلگ اُٹھا۔ اُن سب کی یادوں نے اُسے بے چین کر دیا۔ کہاں تھے وہ سب لوگ؟ غریب' خوددار اور محبِ وطن۔

نثار ماموں کی شہادت کے باعث ان کی بیٹی کی شادی ملتوی ہو گئی تو ممانی نے جہیز میں دینے کے لیے بنوایا گیا سونے کا سیٹ قومی دفاعی فنڈ میں دے دیا تھا۔

وقاص کے پاس جوتا نہیں تھا' مگر اباجی نے اس کے ننگے پاؤں کی پروا کیے بغیر اپنی ساری تنخواہ چندے میں دے دی۔ اماں نے اپنے دوپٹے سے مہاجر بہنوں کے سر ڈھانپ دیئے تھے اور خود اس نے گھر گھر جا کر چندہ جمع کیا تھا اور پھر کئی ایک چیزوں اور دعاؤں کے ساتھ محاذ پر لڑنے والوں کے لیے نذر کر دیا تھا۔

مگر یہ ڈاکٹر آصف کس محاذ پر' کس لیے لڑ رہا تھا؟ یہ کون لوگ تھے؟ بہترین تراش خراش کے اعلیٰ قسم کے ملبوسات نے جن کا ظاہر و باطن چھپا دیا تھا۔ فائیو سٹار ہوٹلوں میں رہتے تھے' بدیسی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور لمبی گاڑیوں میں گھومتے تھے اور بظاہر اس ملک کے بہی خواہ تھے مگر......؟؟

اچانک وہ چونک گئی۔ ڈاکٹر آصف دروازے میں کھڑے تھے۔ وہ اندر آئے اور سگار اُٹھا کر واپس جانے لگے۔

"سنیئے۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اماں بہت بیمار ہیں۔ میں جانا چاہتی ہوں۔"

"صبح تک لوٹ آنا۔" انہوں نے کمال مہربانی اجازت دے دی۔

"شاید اب وہ صبح کبھی طلوع نہ ہو۔" اس نے سوچا۔ "جو مجھے تمہاری زندگی سے قریب کر دے۔ اب الوداع کہہ ڈالو میرے حبیب کہ اب صدیوں جتنا فاصلہ اور دُوری حائل ہو گئی ہے۔ میں یہ کس طرح بھول جاؤں کہ میں کون ہوں؟ وہ وفا جو کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ مذہب' ایمان' وطن' رشتے سب کے لیے اہم چیز ہے۔"

وہ اماں کے گھر پہنچی تو برآمدے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ برآمدے میں

رُک گئی۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ وقاص کاپی پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا اور اماں کی پائنتی کی طرف کرسی پر بیٹھا ملائم شاہ اُن کا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ یہ ایک مکمل اور پُرسکون کائنات تھی۔ یہاں کوئی شرپسند ہلچل مچانے کی نہیں سوچ رہا تھا۔ کیوں کہ انہیں صرف اپنی زندگی چاہیے تھی۔ غیروں کی بخشی ہوئی کائنات نہیں۔ وہ اپنے لیے' اپنے وطن کے لیے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ غریب ضرور تھے مگر وفادار تھے۔ انہیں صرف زندگی چاہیے تھی۔ پُرآسائش دوزخ نہیں۔

اس کا دل چاہا وہ بے اختیار چلائے۔ "میں ہار گئی ملائم شاہ۔ اب بات میرے نصیب کی نہیں عزت کی ہے۔" مگر وہ خاموشی سے صرف آنسو پونچھ کر رہ گئی۔

اچانک وقاص کی نظر اس پر پڑی۔

"آپا......" وہ چھلانگ لگا کر دروازے تک چلا آیا۔

"وفا!" اماں نے اس طرح بے وقت چلے آنے پر تعجب کا اظہار کیا۔

"آداب!" دُھواں دُھواں چہرہ لیے ملائم شاہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اُس نے پوچھا۔ وفا کوئی جواب نہ دے سکی۔

"تو اس وقت؟" اماں پریشان تھیں۔

"بس اماں آج دل بہت پریشان تھا۔" اُس نے جواب دیا اور اماں کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"آپ ٹھیک ہیں نا......؟" اُس نے اماں سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ اُس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"اور آپ؟" اُس نے ملائم شاہ سے پوچھا۔

"ارے ہمیں کیا ہونا ہے۔" وہ اپنی فطری شوخی سے بولا۔ "آپ اپنا سنائیں۔"

وہ خاموش...... اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ حالانکہ دل کہہ دینا چاہتا تھا۔ "کچھ مت پوچھو میرے ہمدرد' ان رفاقتوں نے کون سا روپ دکھایا ہے اور آج کیسی بھیانک حقیقت سامنے آئی ہے۔ میرے اس پُرسکون وجود کو مت دیکھ ناصر شاہ! ذرا اس دل میں جھانک۔ یہاں گرم چشموں کا شور اُٹھتے عذاب کی لہریں ہیں مگر میں خاموش ہوں۔"

"باقی لوگ کیسے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"چھوٹ گئے سب۔" وہ مسکرایا۔ "اتحاد ہی اصل قوت ہے۔ جذبہ ایمانی سے ٹکر لینا آسان

نہیں۔ آج کل کی نسل کا بہاؤ مذہب اور اتحاد کی طرف ہے۔ اس بہاؤ کے آگے بند باندھنے کے لیے فولادی قوت چاہیے اور ہمارا دشمن ہر طرح سے لیس سہی' مگر افسوس کہ اس قوت سے محروم ہے۔"

وہ اپنے خاص انداز سے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا رہا اور وہ سوچتی رہی۔ "تم تو ذرا بھی نہیں بدلے ملائم شاہ۔ بالکل ویسے ہی ہو۔ بیباک' نڈر اور جوشیلے اور مجھے دیکھو وفا بن کر عرش جتنی بلند تھی' مگر مسز آصف بن کر واقعی سرخ آندھی کی لپیٹ میں آ کر تنکوں کی طرح بکھر گئی ہوں۔ بھلا خشک پتوں اور بکھرے تنکوں کو کون چنتا ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب نہیں آئے؟" ناصر شاہ نے پوچھا۔

"وہ بہت مصروف ہیں۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں واقعی۔" ملائم شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "وہ تو بہت مصروف ہیں۔"

وفا نے دیکھا طنز کا ایک طوفان اُس کی آنکھوں میں تیر رہا تھا۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟" وفا نے بات بدل کر ڈالی۔

"خدمت خلق۔" وہ مسکرانے لگا۔

"بہت نیک ہے۔" اماں نے وضاحت کی۔ "ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔"

"ہاں...... اور کیا۔" وقاص بول اٹھا۔ "اماں کو جب بخار ہو گیا تھا تو جب بھی ناصر بھائی ڈاکٹر کو لائے تھے۔" اس بے خبری پر مارے شرمندگی کے وفا کی نظریں جھک گئیں۔

اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اماں جی! مجھے اجازت ہے۔" وہ جھک کر بولا اور خدا حافظ کہہ کر باہر کی جانب چلا گیا۔

وفا کو اُس کا جھکا ہوا وجود گردش دوراں کا شکار نظر آیا۔ چار جگہ ٹیوشن پڑھا کر زندگی کی گاڑی چلانے والا جس کی آنکھیں گہرے سیاہ حلقوں میں بھی جگمگا رہی تھیں' مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں مسلسل لکھتے رہنے کی وجہ سے دب گئی تھیں۔ اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے اور اتحاد کا سبق دینے کے لیے جس نے تحریر کے ذریعے تبلیغ کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس غربت کے احترام میں اس جذبے کے لیے اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔

بہت سا وقت بیت گیا۔ چاند ڈھل کر صحن کے کچے آنگن کے عین اوپر جگمگا رہا تھا۔ اماں اور

وقاص سو چکے تھے۔ اُس نے وقاص کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اُس نے کروٹ بدلی' تکیہ ذرا سا کھسکا اور ایک سبز جلد والی کتاب قابل اعتراض تصویری ٹائٹل لئے جھانکنے لگی۔

وفا کتاب اُٹھا کر باہر برآمدے میں چلی آئی۔ وقت اب اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ معصوم ذہنوں کو بگاڑنے کے لئے زہر کے ویپ چلا کر انہیں یہ راستہ دکھایا جا رہا تھا۔ انہیں گمراہ کرنے کے لیے وہ کچھ بتایا جا رہا تھا جو بتانے کے لیے ایک طویل مسافت درکار ہوتی ہے کہ نفس کا یہ سبق تو بعد کی بات ہے۔ پہلا سبق تو ایمان اور کردار کا ہے۔ مگر یہ بیوپار کرنے والوں نے اپنا ایمان تک بیچ دیا تھا۔ اُس کا کوئی ایمان' کوئی کردار نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کن لوگوں کے ہاتھ تھے؟ جو اس مقصد کے لیے مصروف عمل اور اس سارے منصوبے کے پیچھے ڈاکٹر آصف جیسے ضمیر فروش لوگوں کے اعلیٰ وارفع دماغ کام کر رہے تھے۔

اس نے سوئے ہوئے معصوم وقاص کے چہرے پر نظر ڈالی جسے حالات کسی اور ہی سمت لیے جا رہے تھے۔ کمزور اور بے بس آنسو مسلسل بہنے لگے۔ دشمن نے کس طرح ان معصوم کلیوں کو کچلنے کے لیے پہلا ثقافتی حملہ کیا تھا۔ گھر گھر اخلاق سوز فلموں کا چرچا تھا۔ وقت کا ضیاع کرنے اور اخلاق بگاڑنے کے لیے اُس نے مختلف کہانیاں سجا بنا کر بھیج دی تھیں۔ وہ مسلمان نسل کو کھوکھلا اور تباہ کرنے کے لیے سمگلنگ اور چور بازاری کا درس دے رہا تھا۔

پھر اُس کے ایجنٹ ادب کے نام پر فحش لٹریچر لیے میدان میں آ گئے تھے۔ بغیر کسی مصنف اور پبلشر کے پتے کے یہ زہر۔ "آنہ لائبریری" کے نام سے مختلف ہاتھوں میں جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ جنہیں دشمن کے خلاف تلوار اٹھانی تھی سر بازار پرس چھین کر بھاگ رہے تھے اور ڈاکٹر آصف جیسے لوگ کسی کی زندگی میں داخل ہو کر وفا کے نام پر کسی کا اعتماد لوٹ رہے تھے۔ وہ اپنے وطن' اپنے مذہب انسانوں کو سیاست کے داؤ میں اُلجھا کر انہیں ٹکڑوں میں بانٹ دینا چاہتے تھے۔

وفا نے آسمان کی طرف دیکھا چاند روشن تھا اور کائنات ایک ایسا سناٹا آغوش میں لیے بیٹھی تھی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

"تو کہاں ہے؟ میرے اِس دور کے محمد بن قاسم؟" اس کا دل بھر آیا۔

"آپا...... تم جاگ رہی ہو؟" وقاص باہر چلا آیا۔ مدھم روشنی میں اُس کی نظر وفا کے ہاتھوں پر پڑی۔ وہ بے تابی سے لپکا۔ وفا کی آنکھیں لال سرخ تھیں۔ آنسوؤں کا طوفان چڑھا ہوا تھا۔ اُس

نے وقاص کے سراپے پر نظر ڈالی۔ ایک دم ہی کتنا بڑا بڑا لگنے لگا تھا۔ چہرے کی معصومیت پر حالات کی کرختگی تہہ اُمڈ آئی تھی۔

"وکی!" وہ پیار سے بولی۔ "نثار ماموں سے کیا ہوا وعدہ بھول گئے؟"

"نہیں۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "مجھے یاد ہے آپا۔"

"کیا یاد ہے؟" وہ اُس کے برابر آن کھڑی ہوئی۔

"مجھے بہت آگے جانا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو پھر یہ کیا ہے؟" وفا نے کتاب آگے کر دی۔

"مجھے بتاؤ یہ آگے جانے کا کون سا راستہ ہے؟"

وقاص نے نظریں جھکا لیں۔ وفا نے کتاب کے ٹکڑے کر کے گرم راکھ میں ڈال دیئے۔

"وکی!" وہ بھائی کے کندھے تھام کر بولی۔ "یاد رکھو جنھوں نے اپنی ذات سے ہٹ کر اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا ہوتا ہے وہ اپنے وسیع سینے میں فراخ دل لیے حوصلے کی دولت سمیٹ کر منزل کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ یہ فرض کی ادائیگی کا وقت ہے۔ ہمیں اپنے وطن کا قرض چکانا ہے۔ اُن جذبوں کی شان سلامت رکھنی ہے جو ہر کسی کا نصیب نہیں بنتی۔ یاد رکھو وقاص! تمھیں اپنے ساتھیوں سمیت بہت آگے جانا ہے۔ جہاں اس وطن کے لیے سوچنے اور کچھ کرنے کا طرزِ عمل تمھیں بلندیوں پر سرفراز کرے گا اور ہمارا مان بڑھائے گا۔"

ایک دم بہت سارے آنسو وقاص کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ یہ آنسو بے بس تھے اور زبانِ حال سے اعتراف کر رہے تھے۔

"ہم بھٹکنے والے نہیں۔ ہمیں تو بھٹکایا جا رہا ہے۔ ہمارے سامنے منزل تو ضرور ہے مگر راستے دھندلا گئے ہیں۔ ہم پر الزام ہے کہ منزل تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمیں بتاؤ اِن دھندلے راستوں پر بغیر کسی روشنی کے ہم کس طرح چلیں؟ ارے...... کوئی خضر تو ہو......"

غموں کی رات مہر علی کے گھر میں تڑپنے لگی اور وفا کے آنسو پکار کر کہہ رہے تھے۔

"اس دور کے خضر تو خود راستہ بھٹک گئے ہیں۔ ہوس انھیں اڑا کر بدیسی فضاؤں میں لے گئی ہے۔ جہاں وہ ٹھاٹ سے رہ کر اس ملک کے پیسے پر عیش کرتے ہوئے اس کی تقدیر سے کھیلنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔"

وفا اماں کے سرہانے رکھی نثار ماموں کی تصویر اُٹھا لائی۔ اُس نے تصویر پر ہاتھ رکھ کر وقاص سے سنبھل جانے کا عہد لیا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

"نئی نسل کیسی بھی سہی، کچھ بھی سہی۔ مگر وہ شہیدوں کی روح سے مذاق کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔"

وقاص نے مادرِ وطن کے دفاع کا عزم دہرایا اور وفا مطمئن ہو گئی۔

صبح سویرے ہی ڈرائیور صاحب کے حکم کے مطابق گاڑی لیے آن موجود ہوا۔ وہ وقاص کے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔ جلدی جلدی کام ختم کر کے اس نے انہیں خدا حافظ کہا اور واپس آ گئی۔

"آصف لاج" صبح کے اُجالے میں پُرغرور انداز میں سر اُٹھائے کھڑی تھی۔ وہ بیڈ روم میں آئی تو ڈاکٹر آصف شیو بنا رہے تھے۔

"ہیلو!" وفا نے ہی پہل کی اور پرس الماری میں رکھنے لگی۔

"اماں کیسی ہیں؟" انہوں نے کل شام کی تلخ گفتگو سے بالا تر خوش مزاجی سے پوچھا۔

"اچھی ہیں۔" وفا بے خیالی میں کہہ گئی۔

"ویسے وہ بیمار تو نہیں تھیں نا۔" انہوں نے کہا۔ "وقاص کل سہ پہر ہی تو واپس گیا تھا۔ پھر تمھیں رات کو اچانک چلے جانے کی کیا سوجھی؟" اب یہ جرح تو بعد از وقت تھی۔ وہ خاموش تھی۔

ڈاکٹر آصف کی سوالیہ نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میرا دل گھبرا رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"اپنے گھر میں دل لگانا سیکھیے۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور وفا کی نظریں چاروں طرف گھوم گئیں۔

"گھر...... یہ گھر ہے ڈاکٹر آصف یا پھر غداروں کا اڈہ۔ جہاں سازش جنم لیتی ہے۔ وطن دشمن عناصر دیوار پھاند کر اندر آتے ہیں اور کوڈ ورڈ استعمال کرتے ہوئے ذومعنی گفتگو کرتے ہیں، جہاں وفا کی آنکھوں میں دُھول جھونکی جاتی ہے۔ کیسا گھر ہے ڈاکٹر آصف؟"

لیکن لب کچھ نہ کہہ سکے۔

"پھر کیا گپ شپ ہوئی۔" وہ پوچھنے لگے۔ وفا جانتی تھی کہ جواب نہ دینے کی صورت میں ان کا موڈ بگڑ جائے گا۔

"وقاص کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔" وہ بتانے لگی۔

"اس کا ارادہ کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ فوج میں جانا چاہتا ہے۔" وہ اِن کے پیچھے کھڑی تھی۔ اتنا کہہ کر اس نے آئینہ میں اُن کے چہرے کا ردِعمل دیکھنا چاہا۔ مگر اُن کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ چٹانوں جیسی سختی چھائی ہوئی تھی۔

"اس نے نثار ماموں سے وعدہ کیا تھا۔" وہ جان بوجھ کر بتاتی رہی۔ "اُسے یونیفارم بہت پسند ہے۔ ان شاء اللہ یہ وردی اس پر سجے گی ہے نا؟" یہ ایک بہن کا دل بول رہا تھا۔ اس کی تمنائیں پکار رہی تھیں کہ وہ اپنے بھائی کو آج کا محمد بن قاسم دیکھنا چاہتی ہے۔

"ہوں۔" ڈاکٹر آصف نے تولیہ اٹھایا اور سٹول کھینچ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اس وردی کا اتنا زیادہ مان نہ کرو۔" وہ مسکرائے۔ "کسی دن ہتھیار ڈال کر آ جائے گا۔"

وہ چاروں طرف الاؤ روشن کر کے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ لفظوں کے شعلے روشن تھے اور سچائی بہ زبانِ حال کہہ رہی تھی۔

"یہ وہ تو نہیں کہ قوم جن کے لیے یادگاریں تعمیر کرتی ہے۔ تم نے کیا سمجھ کر اپنی وفائیں اسے سونپ دیں؟؟"

رات بھر کی جاگتی اداس آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ منہ پھیر کر دراز ہو گئی۔

ڈاکٹر آصف تیار ہو کر آفس چلے گئے۔

وہ دن یوں تمام ہوا کہ ذہن اب منتشر نہ تھا۔ لمحے کا ایک گراں قدر فیصلہ اسے اطمینان کی دولت عطا کر گیا تھا۔

ڈاکٹر آصف شام کو آفس سے آئے تو وہ تیار بیٹھی تھی۔ اُنہوں نے اس طرح معمول کے خلاف اُسے تیار دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"کہاں جا رہی ہو......؟"

"آج لانگ ڈرائیو کا موڈ ہے۔"

"مگر پٹرول تو اس سال زیادہ مہنگا ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر آصف نے اُسے ایک برس پہلے کی بات یاد دلائی۔

"وہ وقت اور تھا ڈاکٹر صاحب۔" وہ مسکرانے لگی۔

"تب تو میں غریب وفا مہر علی تھی اور اب......" بات ادھوری چھوڑ کر اُس نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر آصف مسکرا رہے تھے۔

"مگر مجھے سوئمنگ کے لیے بھی جانا ہے۔"

"واپسی پر مجھے ڈراپ کرتے ہوئے چلے جایئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مان گئے۔ عرصے بعد تو اُس نے ایسی فرمائش کی تھی۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا راج بابا اپنا تھیلا اُٹھائے واپس جا رہے تھے۔ کچھ دور تک جا کر وہ دوسری طرف مڑ گئے اور عین اُسی وقت سامنے والے عیسائیوں کے قبرستان سے ملائم شاہ نمودار ہوا۔ آج وہ سائیکل پر سوار تھا۔ ڈاکٹر آصف نے "جسٹ اے منٹ" کہہ کر گاڑی بیک کر دی۔

"کیا ہوا......؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"سگار کمرے میں ہی رہ گئے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "میں لے آؤں۔"

وہ گاڑی سے اُتر کر گیٹ کے اندر چلے گئے۔ حالانکہ کسی بھی ملازم کو آواز دی جا سکتی تھی۔ وفا کی نظریں ملائم شاہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ برگد کے تلے آ کر رُک گیا۔ بوڑھا برگد سایہ تان کر اُس پر کھڑا تھا۔ قبرستان کی اندرونی دیوار سے راج بابا آگے بڑھے۔ ایک تھیلا انہوں نے ملائم شاہ کو پکڑا دیا اور وہ دونوں تیزی سے پلٹ کر اپنے اپنے راستے پر چل دیئے۔

وفا حیران رہ گئی۔ گویا راج بابا ڈبل کراس کر رہا تھا اور ملائم شاہ بھی نادان نہ تھا۔ سب کچھ جانتا تھا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر ملائم شاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ ملائم شاہ نے پلٹ کر آصف لاج کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھی وفا کو دیکھا اور پھر تیز تیز سائیکل چلاتا ہوا وہ قبرستان کے درمیانی تنگ راستے پر غائب ہو گیا۔

ہارن کی آواز پر ملازم بھاگتا ہوا آیا۔

"صاحب کیا کر رہے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"وہ جی......اندر فون کر رہے ہیں۔" ملازم نے بتایا۔

"اوہ!" اُس نے اپنا گھومتا ہوا سر تھام لیا۔

"کیا بات ہے؟" ڈاکٹر آصف گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"سگار نہیں مل رہے تھے۔" انہوں نے دیر سے آنے کا جواز پیش کیا۔

"سامنے ہی تو پڑے تھے سائیڈ ٹیبل پر۔" اس نے بتایا۔

"میں الماری میں ڈھونڈ رہا تھا۔"

"اچھا چلیں۔" اُس نے کہا۔

"کس طرف کو چلوں؟" ڈاکٹر آصف نے پوچھا اور وفا کو وہ شب یاد آ گئی۔ ملاقات کی پہلی شب کہ اس راستے پر چلنے سے پہلے انہوں نے یہی تو پوچھا تھا۔ "کس طرف کو چلوں؟"

اور اس راستے کا انتخاب بھی تو اُس نے خود ہی کیا تھا۔ گاڑی شاہراہ کے اس حصے کی طرف بڑھ گئی جس کی مسافت طویل تھی۔

سڑک کے دونوں طرف درختوں کی طویل قطار تھی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ گاڑی میں لگی کیسٹ میں گلوکار بہ زبان مصطفےٰ زیدی کہہ رہا تھا۔

کسی آنکھ کو پکارو، کسی زلف کو صدا دو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

وہ اطمینان سے گاڑی چلا رہے تھے۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ وہ جو اس وقت اُس کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کے سارے رازوں کو جانتی تھی اور اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔ جس نے دلوں کے راز آشکارا نہ ہو سکنے کی صلاحیت عطا کر کے اپنے انسانوں کا پردہ رکھ لیا تھا۔

نہر کے کنارے ڈاکٹر آصف نے گاڑی روک لی۔ شاید اُس کا موڈ چہل قدمی کا تھا۔ دونوں باہر نکل آئے۔

"آج یہیں پر سوئمنگ کر لیجئے۔" وفا نے ہنس کر کہا۔

"مجھے اس پانی سے الرجی ہے۔ خدا جانے کیا گند بلا ہوتا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "سینکڑوں طرح کے کیڑے مکوڑے۔" وہ سگار جلانے لگے۔

"اور سوئمنگ پول کا پانی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"بہت شفاف ہوتا ہے۔" وہ بولے۔ "دیکھا تو ہوگا۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔

"کاش اتنا شفاف ہوتا کہ جو کچھ تم نے اُس میں چھپا رکھا ہے صاف نظر آ سکتا۔"

وہ سوچنے لگی۔ اُس کی تہہ میں کیا طوفان اور کیسے خطرناک زہریلے کیڑے ہیں تم کیا جانو اس زہر کی شدت۔

"کہاں گم ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

وہ چونک گئی۔ "کبھی کبھی اچانک تم کیا سوچنے لگتی ہو؟"

"اپنے نصیبوں پر رشک کرتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"سوچتی ہوں، آپ کے بغیر یہ زندگی کیسی ویران ہوتی۔" ڈاکٹر آصف کچھ نہ بولے۔ بے ساختہ مسکرانے لگے۔

"واپس چلیں۔" انہوں نے گھڑی دیکھی اور گاڑی کی طرف بڑھے۔ واپسی پر وہ بات بے بات مسکراتے رہے۔ شاید ایک عرصے بعد وفا کے منہ سے اپنی تعریف سن کر کوئی بوجھ اُتر گیا تھا۔

"کیوں نہ واپسی تک میں تمہیں اماں کے ہاں ڈراپ کر دوں۔" انہوں نے سوچ کر کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وفا نے خوش ہو کر کہا۔ کالونی کی باہر والی سڑک پر اُتار کر وہ بولے۔

"میں دس بجے تمہیں لینے آؤں گا۔"

"آپ فکر نہ کریں میں خود ہی آ جاؤں گی۔"

"اچھا۔" وہ بولے۔ "وقاص سے فون کروا کر دوسری گاڑی منگوا لینا۔"

"خدا حافظ۔" وہ چلے گئے۔

وفا نے ایک گہری سانس لی۔ بہار کی ہوا کے تازہ جھونکے روح کے اندر تک چلے گئے۔ اُس کا رُخ ملائم شاہ کے گھر کی طرف تھا۔ وہ دروازے پر آ کر رُک گئی۔ اندر زندگی آوازوں کے روپ میں جوان تھی۔ وفا گھوم کر پچھلی گلی کی طرف آ گئی۔ ملائم شاہ کی بیٹھک میں بالکل ہلکی روشنی تھی۔ سلاخوں والی کھڑکی پر کاٹن کا نیلا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وفا کے قدم رُک گئے۔

"اتنی جلدی یہ کس طرح ممکن ہے؟" ملائم شاہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "پہلے ہی راج بابا نے مشکل سے دس کلیاں لا کر دی ہیں۔"

اتنی بڑی حقیقت ملائم شاہ کے سینے میں پوشیدہ تھی۔ وہ لرزنے لگی اور اس نے عالم وحشت میں دروازہ زور زور سے بجایا۔

"کون ہے؟" ملائم شاہ کی بھاری آواز آئی۔

اُس نے دروازہ کھول دیا اور سامنے کھڑی وفا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "آپ......؟ یہاں......اندر آیئے نا۔"

وہ کمرے میں آئی تو دیکھا کہ یونیورسٹی کے زمانے کا ساتھی اور یونین کا سابق صدر ابراہیم خان بھی کمرے میں موجود تھا۔

"وفا!" وہ حیرت سے بولا۔ "کیسی ہیں آپ؟"

"ناصر شاہ!" وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

ملائم شاہ نے اُس کے سراپے پر بڑی گہری نظر ڈالی اور پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بولا۔

"کیوں؟ آپ کچھ نہیں جانتیں۔ سب کچھ آپ ہی کے ہاں تو ہو رہا ہے۔"

اُس کے جلتے نین بولنے لگے۔ "ہم ہار گئے ملائم شاہ۔ وفا کے نام پر دھوکہ کھا گئے۔ دل نے بہکایا اور تقدیر نے وہاں پہنچا دیا۔ جو ہم جیسے وفا شناس لوگوں کی منزل نہیں تھی۔"

"آؤ آج تمہیں ایک ڈرامہ دکھاؤں۔" معصوم شاہ نے کہا۔ تینوں باہر آ گئے۔ ملائم شاہ نے بیٹھک کو تالا لگایا ٹیکسی لے کر وہ اُسی فائیو سٹار ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں سے اس کہانی کا آغاز ہوا تھا۔

وہ لوگ اوپر پہنچ گئے۔ پانچویں منزل کے ایک کمرے پر پہنچ کر ملائم شاہ نے دستک دی۔

"کون ہے؟" آواز آئی۔

"حق باہو۔" یہ کوڈ ورڈ تھے کہ ابراہیم خان کے منہ سے جوں ہی یہ لفظ نکلے' دروازہ کھل گیا۔ اندر مقیم نفوس نے سلام کیا۔ وہ شہر کی ادبی تنظیم کا صدر نصراللہ تھا جو 'مفتی' کے نام سے ایک پرچہ نکالتا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"یہاں آؤ" ملائم شاہ نے وفا کو پکارا اور وہ دوڑتی ہوئی پردے کے قریب آ گئی۔ ملائم شاہ نے پردہ ہٹا دیا۔ نیچے سوئمنگ پول کا پانی شیشے کی اس دیوار کے پار چمک رہا تھا۔

"یہ لو......" اس نے دُوربین وفا کے ہاتھ میں تھما دی۔ وفا نے دُوربین آنکھوں سے لگا لی۔

برسوں پہلے والی شام کا منظر سامنے تھا۔ وہ نامہربان اجنبی لمبا گاؤن پہنے' ہیٹ لگائے پول کے کنارے بیٹھا تھا۔ لگتا تھا کہ وہی وقت ہے اور ویسا ہی سماں۔ دھندلی شام میں سوئمنگ پول کے

کنارے روشن اور اداس تھے۔ دراز قد اجنبی نے گھڑی دیکھی۔ اس کی بے قرار نظریں یہاں سے وہاں تک گردش کرنے لگیں۔ دُوربین کے شیشوں میں اس کا چہرہ نظر آیا اور وفا نے گھبرا کر دُوربین آنکھوں سے ہٹا دی۔ وہ اس کا مجازی خدا...... ڈاکٹر آصف تھا۔

اس نے دوبارہ دیکھا۔ ایک سیاہ رُو بندے نے قریب آ کر انہیں کچھ تھما دیا۔ ڈاکٹر آصف نے مسکرا کر شاباشی کے انداز میں اس کا کندھا ہلایا اور پھر وہ کوئی اہم راز دفن کرنے کے لیے پول میں کود گیا۔

وفا دُوربین آنکھوں سے لگائے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر آصف تیرتے ہوئے گہرائی کی طرف چلے گئے۔ چند منٹ بعد ان کے لمبے سفید بازو سطح آب پر اُبھرے۔ وہ ریلنگ پکڑ کر باہر آ گئے۔ کرسی پر پڑا ہیٹ اٹھایا اور گاؤن پہن کر اندر کی طرف چلے پڑے۔ وفا نے آنکھوں سے دُوربین ہٹا کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ معصوم شاہ' ابراہیم خان اور نصراللہ اداس اور خاموش کھڑے تھے۔ اپنی ذات کے قیدی' زندگی کی پریشانیوں اور مسائل میں گھرے ہوئے' غربت اور افلاس کے مارے ہوئے محبِ وطن لوگ۔

ان میں سے ہر ایک متوسط طبقے کا فرد تھا۔ کسی کے پاس پُر آسائش زندگی نہ تھی۔ صرف ایسی زندگی کی تمنا کر سکنے والا شکستہ دل تھا۔ وہ غریب تھے مگر جذبہ حب الوطنی نے ان کے چہروں پر ایک عجیب سا نور بکھیر دیا تھا۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ مگر وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔

وہ سب اداس اور خاموش بیٹھے تھے۔

یہ عجیب شام غریباں تھی۔

وہ جن کے دل میں وطن کی محبت تھی۔ وہ تہی دامن اور تہی دست تھے اور جن کے ہاتھوں میں سب کچھ تھا ان کے دل میں وطن سے محبت تو کیا اُنس تک کا جذبہ نہ تھا۔

یہ کیسا تضاد اور کیسا فاصلہ تھا خدایا؟

"پہچان لیا؟" ملائم شاہ کی آواز نے سکوت توڑا۔

"ہاں!" وہ آہستہ سے بولی۔ "آج پہچان لیا۔"

"کاش! تم پہلے سے جان جاتیں تو......" وہ رُک گیا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کہہ نہ سکتا تھا۔

"تم صرف ایک سال کی بات کرتے ہو ملائم شاہ!" وفا نے دُکھی آواز میں کہا۔ "اتنی مختصر مدت میں تو انسان اپنے آپ کو بھی پہچان نہیں سکتا۔ اس کے لیے بھی شعور تک کی مدت چاہیے۔ دوسرا انسان تو پھر ایک الگ وجود ہوتا ہے۔"

کمرے میں گہری رات جیسی تاریک خاموشی چھا گئی۔

"یہ سب کچھ کیا ہے؟" وفا کی آنکھیں بھر آئیں۔

"غداری اور سازش۔" ملائم شاہ کا لہجہ گرم تھا۔ پھر اس نے تفصیل سے وفا کو ہر ایک بات بتائی۔ ڈاکٹر آصف کے سیاہ کارناموں سے آگاہ کیا۔ ان کی تنظیم کے سارے خفیہ راز اس پول کی تہہ میں دفن تھے جسے موقع ملتے پر دشمن کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اسلحہ کی ترسیل چوری چھپے ہوتی تھی اور اس کے لین دین میں 'مالا' 'کلیاں' اور دوسرے کوڈ ورڈ استعمال ہوتے تھے۔

"وہ کن لوگوں کے ہاتھ ہیں جو انہیں سہارا دیتے ہیں؟" وفا نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ سوال کیا۔

"ہمیں وہ چہرے نظر نہیں آ سکتے۔ وہ ہاتھ بہت لمبے ہیں وفا۔ ہماری پہنچ سے باہر۔" معصوم شاہ نے کہا۔

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ کیا کچھ نہیں کر سکتے؟" وفا اونچی آواز میں بولی۔

"ہم اپنے محاذ پر کوشش کر رہے ہیں۔" نصراللہ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"یہ راج بابا کون ہے؟" وفا کو اچانک خیال آ گیا۔

"بظاہر ان کا ساتھی۔" ابراہیم خان نے بتایا۔ "مگر باطن میں ہمارا ہمدرد۔ وہ ہمارے لیے کام کر رہا ہے۔"

"ناصر شاہ!" وفا سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "اس سوئمنگ پول کی تہہ میں کیا ہے؟"

"جاننا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔ "پھر انتظار کرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "مگر ایسا کیوں ہے؟"

"فرق صرف سوچ کے انداز کا ہے وفا۔" نصراللہ نے کہا۔ "ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم آج بھی اس آزاد ملک میں رہ کر بھی لکھنوی دہلوی اور جالندھری ہیں۔ ہم نے آج تک اس ملک کو اپنا

سمجھا ہی کب؟ جواب کسی بات کا شکوہ کریں۔"

وہ سب اداس تھے اور نصیبوں سے بھی شاکی۔ کوئی وفا کے نام پر لٹ گیا تھا اور کسی نے دل پر زخم کھا کر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ ملائم شاہ نے گھڑی دیکھی اور ابراہیم خان سے بولا۔ "وقت ہو گیا ہے تم جاؤ، مگر پہلے چیک کر لینا ڈاکٹر آصف چلے گئے یا نہیں۔" ابراہیم خان کمرے سے باہر چلا گیا۔

وفا جانتی تھی کہ ملائم شاہ کے معصوم دل میں ڈاکٹر آصف کے لیے نفرت کے کتنے شدید جذبے پوشیدہ ہیں۔ مگر اس کے سامنے ڈاکٹر آصف کا نام احترام سے لے رہا تھا۔

ادب واحترام کے اس باوفا انداز پر وفا کی نظریں جھک گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ملائم شاہ نے اچانک پوچھ لیا۔

"جی!" وہ چونک گئی۔ "ڈاکٹر صاحب کچھ دنوں سے پریشان تھے اور وہ......" اس نے کچھ بتانا چاہا۔

ملائم شاہ نے بلند قہقہہ لگایا۔ "وہ اس لیے پریشان تھے کہ جب سے ہمیں ان کے اس زیرو پوائنٹ کا پتہ چلا ہے ان کے بیشتر راز اب ہمارے پاس ہیں۔"

"اچھا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"جی ہاں!" اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ "مگر افسوس......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس اُداس اور ویران شام میں معصوم شاہ کی دُکھی آواز نے اس کے دلی جذبات واضح کر دیے تھے۔

"زندگی میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو چرائی نہیں جا سکتیں کہ وہ تو شاید ہمارے نصیبوں کی پہنچ سے بھی بہت دور ہوتی ہیں۔"

نصراللہ بات کا رُخ سمجھ کر مسکرایا۔ دُکھی وفا نے اپنا سر جھکا لیا۔ باہر چاند گھنے درختوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ وفا نے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔ ابراہیم خان نے پول میں چھلانگ لگا دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس آ گیا۔ چمڑے کی جیکٹ کے نیچے دشمنوں کے راز بند تھے۔

"خیریت رہی نا۔" نصراللہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں مگر وہ لوگ ذرا گہرائی کی طرف چلے گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"بچ نہیں سکتے۔" ملائم شاہ مسکرا کر کرسی سے اٹھا۔ ابراہیم خان نے جیکٹ کی زپ کھول کر وہ لفافہ ملائم شاہ کو دے دیا۔

پھر تو جیسے زمین و آسمان کی گردش ہی رُک گئی۔ وہ تخریب کاری کے پلان تھے۔ اس چمن کو اُجاڑنے کے گھناؤنے منصوبے تھے اور اس لگے لگائے باغ کو دوسروں کے ہاتھوں سونپ دینے کی سازش تھی اور اس پر کب؟ کہاں؟ اور کس طرح عمل کرنا ہے واضح ہدایات ڈاکٹر آصف کے دستخطوں کے ساتھ درج تھیں۔ وفا کے حواس جواب دینے لگے۔ مذہب کا احترام ملت کے اتحاد کا سبق ان لوگوں کو سب کچھ بھول گیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایمان یقین اتحاد مذہب ملت سب ہی کچھ فراموش کر دیا تھا۔ ڈاکٹر آصف جیسے لوگوں نے اس وطن کا تقدس پامال کر دیا تھا۔

آنسوؤں کی برسات اس پلان کا ہر صفحہ بھگو گئی۔ وہ ان انمول موتیوں سے اس تلخ حقیقت کو مٹا دینا چاہتی تھی۔

"ہم اپنے محاذ پر ابھی زندہ ہیں۔" ملائم شاہ نے وفا کے سر پر احتراماً ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم حوصلہ رکھو اور اُمید بھی کہ ہم اللہ کی راہ میں نکلے ہیں اور یقیناً وہ ہمارے ساتھ ہے۔"

"اب مجھے کیا کرنا ہے؟" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"کسی بھی سازش میں عورت جیسی مقدس ہستی کو درمیان میں لانا ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم ابھی زندہ ہیں وفا۔ ہاں جب بھی ضرورت پڑی ہم تمہیں پکار لیں گے۔"

"میں تمہاری منتظر رہوں گی۔" وفا نے کہا۔

"ہاں۔" ملائم شاہ کا دُکھی دل چلایا۔ "کچھ بھی سہی وفا مگر یقین کرو مجھے تمہاری بربادی کا دُکھ رہے گا۔"

"ڈاکٹر آصف کا انجام......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"کچھ فرق نہیں پڑے گا۔" وہ آنسو پونچھ کر مسکرائی۔

"ایک وفا برباد ہو گئی تو کیا تمہیں اس وطن کے ساتھ وفا نبھانی ہے۔"

"ان شاء اللہ۔" اس کا لہجہ پُراعتماد اور مضبوط تھا۔

رات گہری ہونے والی تھی۔ وہ تینوں وقفے سے کمرے سے باہر آئے۔ نصر اللہ نے انہیں

الوداع کہا۔ وہ تینوں اپنے اپنے راستے پر چل دیئے جبکہ نصر اللہ اپنے مشن کی تکمیل کے پروگرام مکمل ہونے تک کمرے ہی میں رک گیا۔

* * *

وفا جب آصف لاج پہنچی تو گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ پھر بھی باہر سے اُسے اپنا یہ آستانہ ویران اور بھٹکتی ہوئی روحوں کا مسکن لگا۔ بیڈ روم میں روشنی تھی اور ایزی چیئر پر دراز ڈاکٹر آصف کسی سوچ میں گم تھے۔

"ہیلو۔" وہ مسکرائی۔ اپنا آپ اور جذبات چھپانے کے لیے اُسے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔

"آ گئیں۔" وہ چونک گئے۔ "بہت دیر لگا دی۔"

"ہم کلیاں چننے باغ میں چلے گئے تھے۔" اس نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آج کل موتیا کا موسم ہے نا۔" مگر ان کا وہ بولتی آنکھوں والا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر مدھم آواز میں بولی۔ "چند دن پہلے جو مالا بھیجی گئی تھی کیا اس کی کھوئی ہوئی دس کلیاں مل گئیں؟"

الفاظ میں زلزلے کی وہ کیفیت پوشیدہ تھی کہ دہشت زدہ ڈاکٹر آصف گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آج وہ حسب عادت ایسے موقع پر اپنے تاثرات چھپانے کے لیے قہقہہ لگانا بھول گئے تھے۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" ایک اتنا اہم راز اس کے منہ سے سن کر وہ چلا اٹھے۔

"بتایئے نا؟" وہ آنکھیں جھپک کر بولی۔

"تم کہاں گئی تھیں؟" وہ چلائے۔ انہوں نے وفا کا بازو تھام کر بغیر کسی احساس کے جلتا سگار بازو کے ساتھ لگا دیا۔ سگار کی کالی آنکھ کی تپش وفا کے بازو میں اُتر گئی۔

"پہلے تم بتاؤ۔" وہ سارے آداب بالائے طاق رکھ کر بولی۔ "تم کون ہو ڈاکٹر آصف؟"

ڈاکٹر آصف نے اُسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔ آگے بڑھ کر انہوں نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا اور بند دروازے کے ساتھ لگ کر بولے۔

"میں جو کچھ بھی ہوں یہ مت بھولنا کہ تمہارا مجازی خدا ہوں اور وفا شعار عورتیں شوہر کے لیے جان قربان کر دیا کرتی ہیں۔" انہوں نے پینترا بدلا۔

"ہاں جان تو جبھی قربان کی جاتی ہے جب شوہر بھی باوفا ہو۔ وفا کا حق ادا کرنا جانتا ہو۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔ "یہ مت بھولو ڈاکٹر آصف کہ غداروں کی جان لی جاتی ہے' اُن کے لیے جان نہیں دی جاتی۔"

جلتے سگار کی سیاہ آنکھ دوسری مرتبہ شہہ رگ کے قریب اُتر گئی۔

"اور تم یہ بھی مت بھولو کہ میں تمہیں کہاں سے کہاں تک لے آیا ہوں۔ تم کیا تھیں؟ ہوٹل میں کام کرنے والی تھرڈ ریٹ لڑکی۔"

"مجھے اپنی محنت پر فخر ہے۔ وہ حلال کا رزق تھا۔" وہ بولی۔ "غیروں کے بخشے ہوئے ٹکڑے نہیں۔"

ڈاکٹر آصف کی مضبوط انگلیاں بے شمار نشان اس کے چہرے پر ثبت کر گئیں۔

"تم بچ نہیں سکتے۔" وہ چلائی۔ "بس اب بہت ہو چکا۔"

ڈاکٹر آصف بے قراری سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔

"سنو۔" وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر تم میری اصلیت جان ہی گئی ہو تو وعدہ کرو اس محبت کے نام پر جو میں نے تمہیں بخشی ہے تم اپنی زبان بند رکھو گی اور صرف میرے لیے کام کرو گی۔ ورنہ تم......"

انہوں نے غیروں کے عطا کردہ آتشیں کھلونے سے اُسے ڈرانا چاہا اور وہ روتے ہوئے اپنے رب سے فریاد کر رہی تھی۔

"تو کیا شادی اِس لیے کی جاتی ہے؟ کسی کو آلہ کار بنانے کے لیے؟ شادی تو ایک گھر کی بنیاد رکھنے کے لئے کی جاتی ہے۔ بسنے اور بسانے کے لیے۔ اُجاڑنے کے لئے نہیں۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے میرے رب۔"

اور وہ رب عظیم بے نیازی سے مسکراتا رہا کہ بے شک وہ فرمانبرداروں کے ساتھ نافرمان لوگوں کو بھی رزق عطا کرتا ہے۔ کمرے میں گہری اندھیری قبر جیسی خاموشی چھا گئی۔

گھپ سناٹا ایک ہلکی دستک سے ٹوٹا۔ ڈاکٹر آصف باہر نکل گئے۔ وفا نے کی ہول سے جھانکا۔ گیلری میں سوہا کھڑی تھی۔ وفا حیرت سے اُسے دیکھتی رہی۔

"آپ کون ہیں؟" ڈاکٹر آصف نے پوچھا۔ یہ کوڈ ورڈ تھا۔

"میں یہاں کام کرتی ہوں۔" سوہا نے بھی کوڈ ورڈ میں جواب دیا۔

وفا سمجھ گئی کہ ڈیڑھ برس پہلے نادانستگی میں کہا گیا یہ کوڈ ورڈ اسے ڈاکٹر آصف کی اصلیت دکھا چکا تھا۔ مگر اس وقت وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔

"کیا خبر ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"سر! آج شام قبرستان کے درمیانی تنگ راستے سے گزرنے والا سائیکل سوار سٹوڈنٹ لیڈر ناصر شاہ عرف ملائم شاہ اور وہ بالکل خالی ہاتھ تھا سر۔"

"اور راج بابا۔" انہوں نے پوچھا۔

"وہ بہت پہلے جا چکے تھے۔" سوہا نے کہا۔

وفا جان گئی کہ راج بابا شک کی زد میں تھا۔

"اوکے۔" ڈاکٹر آصف نے اُسے جانے کا اشاہ کیا۔ وفا دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ ڈاکٹر آصف اندر داخل ہوئے۔

"وفا!" انہوں نے پکارا۔ "سامنے آؤ۔"

وہ اوٹ سے نکل آئی۔ ڈاکٹر آصف کا چہرہ سرخ تھا۔

"وہ عیار...... ملائم شاہ۔" وہ ہاتھ کا اشارہ کر کے بولے۔

"کیا اسی سے ملنے وقت بے وقت اماں کے گھر جایا کرتی تھیں۔"

"زبان سنبھالو ڈاکٹر صاحب۔" وہ چلائی۔

"شٹ اپ۔" انہوں نے لپک کر وفا کی کلائی پکڑ لی۔

"یاد رکھو تم سب کچھ جان کر بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔ میں تمہیں جاسوسی کے الزام میں اندر کروا دوں گا۔"

"میں جانتی ہوں کہ تمہارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" اُس نے اپنی کلائی چھڑانا چاہی۔ "مگر اب سنبھل جاؤ کہ ان ہاتھوں کو کاٹنے والے اب جوان ہو چکے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ کون ہیں؟ مگر وہ ہاتھ کاٹنے کے لیے زندہ رہیں گے تب کی بات ہے۔" وحشت زدہ مکروہ مسکراہٹ ڈاکٹر آصف کے چہرے پر بکھر گئی۔

"میں خود گواہی دوں گی' تم کیا ہو؟ کون ہو؟" وفا نے چلا کر کہا۔

ڈاکٹر آصف اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔ "گواہی دینے کے لئے انسان کا زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ اپنی موت کو مت آواز دو وفا۔ مجھے تم سے بہت...... محبت ہے۔"

"ارے کیوں مذاق کرتے ہو ڈاکٹر آصف۔" وہ وحشت زدہ انداز میں مسکرائی۔ "محبت اور تم...... پہلے اس زمین سے تو محبت کرنا سیکھو۔ جس نے تمہیں چلنا سکھایا' محبت پر پہلا حق اس دھرتی کا ہے جس پر تم رہتے ہو۔ تم اسی کا حق ادا نہ کر سکے...... کسی ذی روح کو کس طرح چاہا جاتا ہے یہ تم بھلا کیا جانو۔"

"اپنا فلسفہ اپنے پاس ہی رہنے دو۔" وہ غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک کر بولے۔ "یہ زمین کیا ہے؟ بے جان مٹی کا ٹکڑا۔ دنیا میں جہاں اور جدھر بھی نکل جاؤ تمہارے قدموں تلے بچھتی جائے گی۔ آسمان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ آخر کیا فرق ہے؟"

"تمہارے لیے فرق نہیں۔" وفا نے جواب دیا۔ "بک جانے والے غداروں کے لیے نہیں۔ مگر اہل ایمان کے لیے بہت بڑا فرق ہے۔ جنہوں نے اپنی جان کا نذرانہ دیا۔ تمہیں اس کی کیا قدر ڈاکٹر آصف۔ تمہیں تو بنا بنایا چمن مل گیا تھا۔ کبھی آبیاری کر کے تو دیکھو کہ اس راہ میں کتنے خار ہیں۔"

"اوہ شاپ۔" وہ چلائے۔ "بیوقوف عورت تو اس طرح چلا کر دنیا کو خبردار نہیں کر سکتی۔ تیری آواز گھٹ جائے گی۔"

رات بہت ہی گہری ہو گئی تھی۔ وہ حسب عادت ناراضگی کے اظہار کے طور پر اپنا تکیہ اُٹھائے گیسٹ روم کی طرف جا رہے تھے۔ کمرے میں اپنے بیڈ پر پڑی وفا کا منہ ٹیپ سے بند تھا اور دونوں ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے اور زخمی روح سسک کر حال دل کہہ رہی تھی۔

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیماں جاناں

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کر یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں
زندگی تیری عطا تھی سو تیرے نام کی ہے

ہم نے جیسے بھی بسر کی تیرا احساں جاناں

باہر وطن کی ہوائیں افسردہ تھیں اور جھنجھلاتا ہوا زخمی ڈاکٹر آصف سوچ رہا تھا یہ کس طرح ہوا؟ کس نے بتایا؟ اتنا اہم راز جو اس کی نظروں میں آ گیا۔ وہ جو اس کی نصف بہتر تھی۔ اس کی محبت اور وفا تھی پھر اب تو دو چار ہاتھ ہی لب بام رہ گیا تھا۔ انہوں نے کچھ سوچا پھر سامنے آتشدان کی طرف بڑھ گئے۔ لوہے کی جالی ہٹا کر انہوں نے تہہ میں دبا ہوا کوئی آلہ نکالا اور پھر ہوا کے دوش پر بہت دور کوئی پیام پہنچانے لگے۔

رات دھیرے دھیرے بیت گئی۔

صبح انہوں نے دروازے کا لاک کھولا۔ ابھی روشنی پوری طرح پھیلی نہ تھی۔

"کیسے مزاج ہیں؟" انہوں نے جاگتی وفا سے پوچھا۔ مزاج ٹھکانے آئے یا نہیں؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ بے خبر پڑی رہی۔ گویا اپنے حواس میں نہ تھی۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اُسے اس وقتی قید سے آزاد کر دیا۔

"چلو جاؤ منہ ہاتھ دھو کر آؤ پھر بات کریں گے۔" وہ مصالحت پر آمادہ تھے۔

وفا ہاتھ روم سے باہر آئی تو وہ چائے لیے اس کے منتظر تھے۔ وفا بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"جل گیا نا۔" وہ اس کا بازو تھام کر تاسف سے بولے۔ "اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میری پرائیویٹ زندگی میں مداخلت کر کے مجھے غصہ نہ دلایا کرو۔"

وفا نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ برسوں پہلے والا ڈاکٹر آصف بن کر اب محبت کی تیز دھار سے اُس کا ایمان متزلزل کر رہا تھا۔

"میاں بیوی کی زندگی ایک ہوتی ہے۔ پھر یہ الگ سے پرائیویٹ زندگی کیسی؟"

"اوہ!" وہ جواب دیئے بغیر گلے کا نشان دیکھ کر بولے۔ "شہہ رگ پر داغ ہے۔"

"یہاں تو روح بھی جل گئی۔ آپ وجود کی بات کرتے ہیں۔" وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "شہہ رگ کے داغ وہ مٹا دے گا' جو اس کے قریب ہے۔ آپ اپنی بات کریں۔"

ڈاکٹر آصف اپنے نرم طرز عمل سے اُسے رام ہوتے دیکھنا چاہتا تھے مگر وہ اور زیادہ بھڑک رہی تھی۔

"کاش مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ ہر انسان وہ نہیں ہوتا' جو وہ نظر آتا ہے۔ مگر میں سمجھ نہ

سکی۔“

”بیوقوف عورت ہونا پہلے جان جاتیں تو کیا کر لیتیں؟ اب بھی تم میں کوئی فرق نہیں پڑا۔“

”بہت فرق ہے ڈاکٹر صاحب! اُس وقت میں نادان لڑکی تھی۔ پُرفریب راہوں پر دھوکا کھا جانے والی لڑکی۔ اب عقل مند عورت ہوں۔ زمانے سے ٹکر لینے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔“

”زمانے سے نہیں اپنے شوہر سے کہو۔“ وہ بولے۔ ”زمانہ بڑی خراب چیز ہے۔ اس سے ٹکر لوگی تو تمہیں پاش پاش کر دے گا۔“

”مگر میں چپ نہیں رہوں گی۔“

”اچھا! تو شہید ہونے کا بڑا شوق ہے تمہیں؟“

ایک گہری اور جامد چپ ہر سمت بکھر گئی۔

”تم کیا چاہتی ہو؟ اس راز کے بدلے میں، میری محبت؟ ایک پُرآسائش زندگی؟ بہت سی دولت یا پھر......؟؟“

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ وفا نے کہا۔

”تمہیں اپنے گھر کا سکون عزیز نہیں۔“ وہ دھاڑے۔ ”تم کیسی عورت ہو وفا؟“

”یہ گھر ہے ڈاکٹر آصف۔“ اس نے اطراف میں اپنے بازو پھیلائے۔

”تم اسے گھر کہتے ہو؟ سازشوں کا مرکز، اپنوں سے غداری کا اڈہ اسے گھر کہہ کر گھر کی توہین مت کرو۔ گھر کی بنیاد تو محبت اور وفا پر رکھی جاتی ہے غداری پر نہیں۔“

”اچھا!“ وہ اسے مصالحت پر آمادہ نہ پا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”جیسی تمہاری مرضی۔ مگر اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“

ڈاکٹر آصف اٹھ کر تیار ہونے لگے اور وفا خاموشی سے اپنے اطراف میں دیکھتی رہی۔ کیسی آگ جل رہی تھی؟ جس کی تپش روح کی گہرائی تک اُتر گئی تھی۔ اپنی بے بسی کا احساس جاگزین تھا مگر یہ پکار بہت دور اُن ناخداؤں تک پہنچ جانا چاہتی تھی جو بلند ایوانوں میں محفوظ سائے تلے ہر قسم کے موسم سے بے نیاز بند کمروں میں بیٹھے اس قوم کے غم میں آنسو بہا رہے تھے۔ لمبے لمبے شیشوں کی میزوں پر اپنے بازو پھیلائے وہ اس قوم کی تقدیر بدلنے کی سوچ رہے تھے۔

یہ پکار اپنے رب تک پہنچ جانا چاہتی تھی کہ رب عظیم کہیں سے کوئی خضر تو بھیج، کوئی قاسم، کوئی

طارق، کوئی خالد کہ آج تیرا مسلمان جہاں بھی ہے کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ یہ کیسی بے نیازی ہے پروردگار مسلمانوں کی تقدیر ان غداروں کے ہاتھوں میں دے کر تو خاموش کیوں ہے؟ یہ کیسا انداز ہے مولا کریم؟ یہ لوگ باوفا کہلاتے ہیں، حالانکہ جس مٹی پر کھڑے ہوتے ہیں اُسی کا سودا کرتے ہیں۔ یہ کیسی وفا ہے خدایا؟

یہ پکار اُن سیاست کے کھلاڑیوں تک پہنچ جانا چاہتی تھی جو اپنے اپنے ذہنوں کے اندر الگ الگ دنیا بسائے قوم کو اپنے اپنے داؤ پر اُلجھانے کے لیے چالیں سوچ رہے تھے۔ یہ پکار ایک سوال تھا کہ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ ہم نفسو! وہ دن کتنی دور ہے؟ جب تم صرف اس وطن کے لیے سوچو گے؟ ذرا اس شیش محل سے باہر آ کر تو دیکھو۔ قوم وفا کے نام پر کن دُکھوں سے دوچار ہے۔

یہ پکار ایک آہ، ایک فریاد تھی کہ تم اپنی وفائیں اس وطن کو سونپنے کے لیے کس صدی کا انتظار کر رہے ہو؟ اس قوم کی کشتی کو پار لگانے کے لیے کس کی راہ دیکھ رہے ہو؟ سنو! کوئی نہیں آئے گا، کوئی نہیں۔ تمہیں خود آگے بڑھنا ہوگا۔ متحد ہو کر سوچنا ہوگا۔ دیر نہ کرو۔ اپنے مفادات کے لیے مت سوچو۔ خدا کے واسطے اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جاؤ۔ ابھی...... کچھ نہیں بگڑا۔ وقت اب بھی تمہارا ہے۔ ورنہ خان محمد آصف جیسے لوگ یہ چمن جلانے کے لیے دیا سلائیاں بنا رہے ہیں۔ اٹھو اور ان کے ہاتھ پکڑ لو ورنہ یاد رکھو بہت پچھتاؤ گے۔“ مگر ہر سمت گہری خاموشی چھائی رہی۔

وفا کی ذات پر پہرے سخت کر دیئے گئے تھے۔ اُس کا زخمی وجود ”آصف لاج“ کے بیڈروم میں قید کر دیا۔ جہاں قدم قدم پر کئی ایک عہد و پیمان بکھرے تھے۔ زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ، محبت اور وفا کے پیمان۔

مگر جلتی آندھی سارے وعدے اُڑا کر لے گئی۔

پورا دن گزر گیا۔ شام بڑے پُراسرار انداز میں ”آصف لاج“ کے سرسبز لان پر چھا گئی۔ اندر باہر ایک وحشت زدہ خاموشی کا بسیرا تھا۔ وفا نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ باہر محافظ ٹہل رہا تھا۔ کھڑکی کی مضبوط گرل کے پار اس کا وجود ایک ڈراؤنا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔

آسمان پر ڈوبتے سورج کی لالی پھیلی ہوئی تھی اور شفق کا رنگ بہت گہرا ہو چکا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر والا دروازہ کھلا اور راج بابا تازہ پھولوں کا گلدستہ لیے اندر آ گیا۔

"آداب!" اس نے کرخت آواز میں کہا اور گلدستہ گلدان میں لگانے لگا۔ وفا خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانے کے لیے مڑا۔ مگر صوفے کی پشت کے پاس لڑکھڑا گیا۔ وفا نے ازراہ ہمدردی اس ناتواں جاں کو سہارا دینا چاہا۔ وہ جھکی اور کاغذ کا ایک ننھا سا پرزہ راج بابا کے ہاتھ سے اُس کی مٹھی میں منتقل ہو گیا۔ راج بابا اُٹھے اور باہر چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ پرچہ مٹھی میں دبائے وہ کمرے کے آخری کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وفا نے پرزہ کھولا ملائم شاہ کی تحریر تھی۔

"آج ہم تمہیں پکار رہے ہیں وفا۔ ہمیں اس مرحلے پر تمہاری ضرورت ہے۔ ڈاکٹر آصف کا پاسپورٹ فوراً اپنے قبضے میں لے لو۔" اس نے پرزہ ہاتھوں سے مسل کر فلش میں بہا دیا۔ واپس آ کر الماری کھولنا چاہی مگر وہ لاک تھی۔ چابیاں ڈاکٹر آصف اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

وفا مایوس ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کئی ایک جلتے لمحات بیت گئے۔ رات گئے ڈاکٹر آصف اُلجھے اور پریشان اندر آئے۔ نفرت کی گہری نظریں وفا کے وجود میں اُتر گئیں۔

"ڈاکٹر صاحب!" اس نے کہا۔ "مجھے الماری کی چابیاں دیجئے۔"

"کیوں......؟" وہ تقریباً کھا جانے والے انداز میں بولے۔

"مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔" اس نے ڈرے بغیر کہا۔

"تم قیدی ہو اور شاید بھول رہی ہو کہ قیدیوں کو ایسی مراعات نہیں ملا کرتیں۔" ڈاکٹر آصف کا کرخت لہجہ وہ برداشت کر گئی۔

ڈاکٹر آصف بے شمار فائلوں کے مطالعہ میں غرق ہو گئے حتیٰ کہ صبح کا اُجالا پھیل گیا۔

انہوں نے ایک نظر اِس کمرے کی کائنات پر ڈالی۔ اس کائنات میں ان کی وفا' ان کی محبت قید ہو کر بظاہر سو رہی تھی۔ مگر اُن کی ایک ایک حرکت پر اس کی نظر تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر آصف پریشان اور مضطرب تھے۔ آنکھوں میں کچھ کھو دینے کا غم نظر آ رہا تھا اور وہ زخمی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح خطرناک نظر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر آصف نے سوئی ہوئی وفا پر ایک نظر ڈالی اور پھر شیو بنانے لگے۔ الماری سے کپڑے نکال کر انہوں نے کرسی کی پشت پر رکھے اور خود باتھ روم میں چلے گئے۔ وفا نے آنکھیں کھولیں۔ یہاں مقدر نے یاوری کی تھی۔ وفا کی نیند سے وہ پرسکون ہو کر کھلی الماری اسی طرح چھوڑ گئے تھے۔

وفا جلدی سے اُٹھی۔ سارا وجود لرز رہا تھا۔ مگر وقت کی ذمہ داری بھی بہت ہی اہم تھی۔ نچلی دراز میں ڈاکٹر آصف کا سبز جلد والا پاسپورٹ پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے الماری کی ترتیب درست کی اور پاسپورٹ تکیے کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔

باتھ روم سے مسلسل پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے غسل کر رہے تھے۔

مشکل ترین لمحات' نزاع کی تلخی لیے پل پل کٹنے لگے۔ ڈاکٹر آصف بیڈ روم میں آئے اور تیاری مکمل کرنے لگے۔ وفا نے کروٹ لی۔ اب وہ آئینے کے سامنے کھڑے اپنا جائزہ لے رہے تھے۔

وہ آنکھیں موند کر بے سدھ پڑی رہی۔

ڈاکٹر آصف دروازے کی طرف بڑھے مگر جاتے جاتے پلٹ آئے۔ وفا کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ چند منٹ تک وہ بیڈ کے قریب کھڑے کچھ سوچتے رہے۔ پھر وہ جھکے۔ ان کا ایک ہاتھ وفا کی پیشانی پر ٹک گیا اور پھر اس ویران صبح کے چمکیلے اُجالے میں پتھر کے اِس چشمے سے کئی ایک آنسو وفا کے چہرے پر گر پڑے۔ وہ پلٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

ٹوٹتی بکھرتی وفا کی ذات کے اندر ایک شور مچ گیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اِس مقام پر تو اپنے قدم مضبوط رکھنے تھے۔ وہ سارے جذبے سارے ہنگامے سلا چکی تھی۔ مگر یہ سب کیا تھا؟ تو کیا واقعی ڈاکٹر آصف کو اس کی ذات سے سچی محبت تھی؟ وہ ڈگمگانے لگی۔ اس کا ایمان متزلزل ہو رہا تھا۔ یہ آنسو تو جلتے انگارے بن کر پیار کی وہ شمع روشن کر گئے تھے' جو اس نے بڑی مشکل سے گل کی تھی اور جس کے اُٹھتے دھوئیں میں اس کی محبت' اس کی ذات اور اس کی زندگی سلگ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ باہر روشنی نئے دن کا پیام لیے پھر نمودار ہو گئی تھی۔ تکیے کے نیچے ڈاکٹر آصف کا پاسپورٹ بھیانک حقیقت بن کر چھپا ہوا تھا اور تکیے کے اوپر اس کا معصوم چہرہ آنسوؤں سے تر سوال کر رہا تھا۔

"اگر یہ محبت ہے تو پھر یہ کیسی محبت ہے؟ جو وطن کو اُس کا حق نہیں لوٹا سکتی' جو اس دھرتی کے نصیب میں نہیں۔" اس کا دہشت زدہ دل چلایا۔

"وفا! اِس محبت کے بہکاوے میں ہرگز نہ آنا۔ یہ تو فریب ہے' سراسر فریب۔ قربان کر دو یہ

سارے لمحے یہ ساری باتیں اور یہ کوئی مہنگا سودا تو نہیں۔"

برستی آنکھوں کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔ آفس کی جانب خاموشی تھی۔

دروازہ کھلا اور بیرا ناشتہ لیے اندر آ گیا۔

"گڈ مارننگ میڈم۔" وہ جھکا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ وفا نے پاسپورٹ کونے میں رکھی شیلف کے نیچے رکھ دیا اور خود باتھ روم میں چلی گئی۔ ہاتھ منہ دھو کر بال سمیٹ رہی تھی کہ بیرے نے دروازہ کھولا۔

"برتن لے جاؤں؟" اس نے پوچھا۔ خلاف توقع اس سوال پر وہ حیران تھی۔ یہ روز کا معمول تو نہ تھا۔ بیرے نے ناشتہ دینے کے بعد کبھی گھنٹہ بھر سے پہلے آنے کی قسم توڑی ہی نہ تھی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ معصوم نوعمر لڑکا مسکرایا اور بولا۔

"میں یہاں ہی موجود ہوں میڈم پکار لیجئے گا۔"

وفا کچھ نہ بولی۔ صرف اشارے میں سر ہلا دیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

وفا نے چائے بنا کر پیالی اٹھائی تو حیران رہ گئی۔ ایک چھوٹا سا پرزہ پرچ میں پیالی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ پرزہ اٹھائے باتھ روم میں چلی گئی۔ ملائم شاہ کا پیام تھا۔

"بیرا اپنا آدمی ہے پاسپورٹ مل گیا ہو تو بھیج دو۔ کوڈ ورڈ ہے۔ سوال: چینی بہت کم ہے۔ جواب: چینی بہت مہنگی ہے میڈم۔"

پرزہ ٹھکانے لگا کر وہ باہر آئی۔ "بیرا!" اس نے زور سے پکارا۔

فوراً دروازہ کھلا اور وہ نوعمر لڑکا سفید کپڑوں پر سبز پٹی لگائے سامنے سے چلا آیا۔

"چینی بہت کم ہے؟" اس کے لب تھرتھرائے۔

"چینی بہت مہنگی ہے میڈم۔" وہ احتراماً جھک گیا۔

وفا کا دل چاہا غربت کے مارے اس دو سو روپے کے ملازم کی عظمت کو سلام کرے۔ اس کے احترام میں جھک جائے جو دشمنوں کے اندر کی صفوں میں ڈٹ کر مقابلہ کر رہا تھا۔ احتیاط سے پاسپورٹ نکال کر اُس نے اُسے تھما دیا' جسے فوراً اس نے اپنے سفید لباس پر لگی سبز چوڑی پٹی تلے چھپا لیا۔ وفا نے پیالی اٹھا کر میز پر رکھ دی اور وہ ٹرے اٹھا کر چلا گیا۔

سہ پہر ڈاکٹر آصف آئے تو خلاف توقع ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ وفا کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ کپڑے بدلنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب!" اس نے بڑی ہمت سے کہا۔ "میں اماں کے ہاں جانا چاہتی ہوں۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

ڈاکٹر آصف نے بڑے غور سے وفا کی طرف دیکھا۔

"کیا تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتی ہو کہ میں تمہیں جانے دوں گا۔ شکر کرو کہ اماں کے گھر کے کچے آنگن کے بجائے آج تم یہاں کھڑی ہو۔ جہاں تمہارے قدموں تلے کچی مٹی کے بجائے قیمتی قالین بچھا ہوا ہے۔"

"ان چیزوں سے زندگی کا سکھ کون خرید سکا ہے؟" اُس نے کہا۔ "سکھ بڑی انمول دولت ہے جو......"

"میں تمہیں دے سکتا ہوں۔" انہوں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی اور وہ وفا کے قریب بیٹھ گئے۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا ردعمل اتنا شدید ہو گا۔ اب تک تم پر کی گئی زیادتی کا مجھے احساس ہے۔ بس صرف چند دن اور پھر ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے جہاں زندگی صرف ہماری ہو گی۔"

"میں ہرگز کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

"اور یہ خوش فہمی آپ بھی دل سے نکال دیں کہ وہ دن آپ کی زندگی میں آئے گا۔"

"اپنا یہ انداز بدلو وفا ورنہ۔" وہ دھمکی پر اُتر آئے۔

"ورنہ کیا کر لیں گے آپ؟"

"میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" وہ بولے۔ "مگر جانے کیا سوچ کر رُک جاتا ہوں۔"

"آپ...... ایسی باتوں سے مجھے رام نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر تم اِس قید کو اُس وقت تک اپنا نصیب جانو جب تک کہ......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی...... ایک بے کراں سناٹا ہر سمت چھا گیا۔

"سنو!" وہ بہت دیر تک سوچنے کے بعد بولے۔

"تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ چلائی۔

ڈاکٹر آصف مسکرائے۔ "چلاؤ مت' تمیز سے بات کرو۔" وہ اس کی ڈرتی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔

"وقاص کی زندگی کے بدلے میں بھی نہیں۔"

یہ بڑی دکھتی رگ تھی۔ وہ تو اس بوڑھی ماں کا سہارا تھا۔ جس کی روح آج تک اپنے بھائیوں کے بچھڑ جانے پر ماتم کناں تھی۔ وقاص کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ پاک اور معصوم زندگی اور خواہش سے بھرپور۔

وفا نے کچھ سوچ کر اقرار میں اپنا سر جھکا لیا۔

"پرسوں شام ٹھیک چھ بج کر بیس منٹ پر اس نمبر پر ایک فون آئے گا۔" انہوں نے فون کی طرف اشارہ کیا' جس کی تاریں وہ خود کاٹ چکے تھے۔

"مگر یہ تو......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"پرسوں تک ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے وضاحت کی۔ "تم ریسیور اٹھا کر کوڈ ورڈ "کلی" استعمال کرو گی۔ تم سے پوچھا جائے گا۔ پانی کا بہاؤ کس طرف ہے؟ اور تمہارا جواب ہو گا شمال کی طرف۔ سمجھ گئی ہو نا؟"

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ایسا ہو گا نا؟" انہوں نے اطمینان کر لینا چاہا۔

"بالکل۔" اس نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

"اوہ!" وہ بے حد خوش ہو گئے اور کمرے میں خوشیوں کی مدھم پھوار برسنے لگی۔ وہ اس طرح غیر متوقع طور پر اس کے ساتھ دینے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ خواہ کچھ بھی سہی۔ وہ کیسے بھی سہی مگر وہ اپنے وقت کے بیشتر لمحوں میں اس کی ذات کے لیے سوچتے ہیں کہ وہ تو وفا ہے' موت کے بعد بھی زندہ رہنے والی ایک امر حقیقت۔

اور وہ سوچ رہی تھی مقدر کے ان لمحوں میں وہ روئے یا پھر مسکرائے۔ تقدیر نے بڑا عجب تیر اس کی جھولی میں لا گرایا تھا۔ بالکل ٹیڑھا کہ سیدھا کرنے کی کوشش میں ہاتھ زخمی ہو جاتے تھے۔ مگر اس لوہے پر کوئی اثر ہی نہ تھا۔ آج وہ تیر صرف ایک بول' ایک بات' ایک کام کے لیے موم بن کر

پگھل رہا تھا اور اس کی ساری وفائیں آنسو کے قطرے بن کر چہرے پر گر پڑی تھیں۔ بے خبری کا صرف ایک لمحہ یہ کیسا روپ؟ یہ کیسی حقیقت دکھا گیا تھا۔

شام کو وہ حسب عادت تیار ہو کر باہر چلے گئے۔ آج ان کی آنکھوں میں ایک واضح چمک تھی۔ پراسرار اور مبہم سی۔ وہ مطمئن انداز میں باہر جاتے ہوئے بولے۔

"سنو تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ باہر پہرہ ہے۔"

وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ راج بابا جانے سے پہلے ایک ٹوکری میں پھول سجائے اُسے دینے چلے آئے۔ وہ ساری اہم باتیں ایک تحریر کی صورت میں لکھ کر مرجھائے ہوئے گلدستے کے اندر رکھ چکی تھی۔ کھڑکی کے باہر گہرا اندھیرا تھا۔

"بابا جی!" وہ پھول رکھ کر پلٹے تو اس نے پکارا۔ "یہ مرجھائے ہوئے پھول تو لیتے جائیے۔"

وہ مسکرائے اور آگے بڑھ کر کارنس پر رکھا سوکھے پھولوں کا گلدستہ اٹھا لیا۔

"یہ شاہ جی کو دے دیجئے گا۔" اس نے سرگوشی کی۔

بابا جی نے سر ہلایا اور پھر باہر نکل گئے۔

دو راتوں کی جاگی ہوئی وفا ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو جانے کے بعد اب اعصاب کو پرسکون رکھنے والی دوا کھا کر سو چکی تھی۔

ڈاکٹر آصف اس رات واپس نہ آئے۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی ایزی چیئر پر دراز اخبار دیکھ رہے تھے۔

"ہیلو۔" وہ مسکرائے۔ "پرسکون ہو؟"

"جی ہاں۔" اس نے مطمئن اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔" وہ بولے۔ "انسان کو سب سے پہلے اپنے متعلق سوچنا چاہیے۔ باقی ساری چیزیں ثانوی ہیں۔" انہوں نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔ وہ خاموش رہی۔

"کل کا کام یاد ہے نا۔"

"جی۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

پھر خاموشی کے بے کراں لمحات چھا گئے۔

"سر!" دروازے کی دوسری طرف سے آواز آئی۔

"یس۔" وہ اپنی بھاری آواز میں بولے۔

"فون ٹھیک کروانا ہے سر۔" ملازم نے کہا۔

"اچھا۔" انہوں نے کہا اور پھر وفا کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آؤ جب تک تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔" وہ اُسے ساتھ لیے ہوئے باہر آئے۔ اُسے اس طرح قید کرنے کے بعد وہ خود کو بالکل محفوظ خیال کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"بیرا!" انہوں نے پکارا۔ "ناشتہ یہاں ہی لے آؤ۔" انہوں نے آواز لگائی۔ کل سے وہ ذرا خوشگوار موڈ میں تھے۔

نوعمر بیرے کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیں لرزنے لگیں۔ وہ ادب سے جھکا اور کچن میں چلا گیا۔ ڈاکٹر آصف شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑے باہر دیکھنے لگے۔

بیرے نے سینٹر ٹیبل پر برتن لگائے اور چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ناشتہ لے آیا۔ ڈاکٹر آصف اب رخ پھیرے کچھ سوچ رہے تھے۔ وفا صوفے پر تنہا بیٹھی تھی۔

بیرا جھکا اور پھر کمال احتیاط کے ساتھ اس نے ایک پرچہ وفا کے پاؤں کے نیچے دبا دیا۔ وہ چکرا گئی۔ جانے کیسا راز پاؤں تلے آ گیا تھا۔ کھلی چپل اور پاؤں کے درمیان ایٹم بم جیسی حقیقت چھپی ہوئی تھی۔ دونوں نے کئی دنوں بعد ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ وفا کمال اداکاری کے ساتھ اپنے تاثرات چھپاتی رہی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ یہ آستانہ اب بارود لگی چٹان کی طرح ہے۔ سب کچھ بکھر جائے گا۔ یہ ساتھ نہ رہے گا' یہ زندگی نہ رہے گی۔ صرف قربانی کی ایک داستان باقی رہ جائے گی۔

"فون ٹھیک ہو گیا ہے سر!" ملازم نے اطلاع دی۔

"اچھا۔" انہوں نے پوچھا۔ "تم نے چیک کر لیا ہے؟"

"جی!" وہ مؤدب انداز میں جھکا۔ "کام کر رہا ہے۔"

"او کے۔" انہوں نے جانے کی اجازت دے دی۔

"سر۔" اب کی مرتبہ بیرے کی آواز آئی۔ "مجھے چھٹی چاہئے۔"

"کیا تکلیف ہے؟" وہ سخت لہجے میں بولے۔

"میری ماں بیمار ہے اور......"

"مرنے کے قریب ہے۔" انہوں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"خدا نہ کرے۔" بے ساختہ وفا کے منہ سے نکلا۔

"ارے تمہیں نہیں معلوم۔" وہ وفا سے مخاطب ہوئے۔ "چھٹی لینے کے لئے تو ان لوگوں کی مائیں سال میں نہ جانے کتنی مرتبہ مرتی ہیں؟"

ان کا یہ نفرت آمیز جملہ وفا کا دل جلا گیا۔

وفا کی سفارش پر انہوں نے اُسے دس روز کی رخصت دے دی۔

"شکریہ صاحب!" وہ جھکا۔ اس نے وفا کی طرف دیکھا اور پھر اس کی خاموش آنکھیں بول اٹھیں۔

"میرا کام ختم ہو گیا میڈم اجازت؟ اور خدا حافظ کہ آپ کو تو ابھی بہت آگے تک جانا ہے۔"

"تم کمرے میں چلو۔" ڈاکٹر آصف نے وفا سے کہا۔ "میں آفس جا رہا ہوں۔" انہوں نے اطلاع دی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ قدم اٹھانا بہت مشکل تھا کہ پہاڑوں جیسے بوجھ تلے پاؤں دب گئے تھے۔ ڈاکٹر آصف اس کے ساتھ چلنے کو بڑھے۔

"مجھ پر اعتبار نہیں۔" وہ مسکرائی اور عرصے کے بعد گھرے سیاہ بادلوں میں جیسے بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"بالکل ہے۔" اُن کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"تو پھر میں چلی جاؤں گی۔ آپ جائیے نا۔"

وہ مسکرائے اور باہر نکل گئے۔

وفا کمرے میں آ گئی۔ اس کی نظر سامنے پڑے فون پر پڑی۔ وہاں ایک احتیاطی تدبیر فون پر لگائے گئے لاک کی صورت میں موجود تھی۔ گویا باہر سے رنگ کیا جا سکتا تھا۔ مگر وہ خود فون نہ کر سکتی تھی۔

"یہ کیسا اعتبار ہے ڈاکٹر آصف؟" وفا کا دل بھر آیا۔

وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ پاؤں کے نیچے سے پرچہ نکالا اور کونے میں بیٹھ کر پڑھنے لگی۔ ملازم شاہ نے قلم کی زبانی بہت کچھ پوچھا تھا۔ سارے جواب لکھ کر اس نے مرجھائے ہوئے پھولوں کی

ٹوکری میں رکھ دیے۔

اور آج راج بابا خلافِ معمول ڈاکٹر آصف کے آنے سے قبل ہی وہ ٹوکری اٹھا کر لے گئے۔

گہری اور پُراسرار شام "آصف لاج" پر چھا گئی۔ باہر کا سارا اندھیرا دل کے اندر تک اتر گیا تھا۔ کمرے میں سناٹا اور سکوت تھا۔ البتہ باہر کی فضا میں زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

گھڑی کی سوئیاں آگے کی طرف منزل طے کر رہی تھیں اور وفا کا دل دھڑک رہا تھا۔

ٹھیک چھ بج کر بیس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ وہ ریسیور اٹھانے کے لیے آگے بڑھی، مگر ڈاکٹر آصف نے ہاتھ کے اشارے سے رُک جانے کو کہا۔ چوتھی مرتبہ گھنٹی کی آواز پر انہوں نے اُسے فون اٹھانے کا اشارہ کیا۔

"ہیلو!" وفا نے بڑی مشکل سے تھوک نگل کر کہا۔

"پانی کا بہاؤ کس طرف ہے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ وفا نے دیکھا۔ ڈاکٹر آصف اس کے سر پر کھڑے تھے۔

"شمال کی طرف۔" وفا نے جواب دیا اور دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر آصف مطمئن انداز میں مسکرائے۔ آگے بڑھ کر انہوں نے وفا کو کندھوں سے تھام لیا۔

"شکریہ۔" وہ بولے اور ہنسی کی بے شمار لہریں ان کے ہونٹوں کے اردگرد رقص کرنے لگیں۔

وہ چند منٹ تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر تیار ہونے لگے۔ باہر چلتی ہوئی سرما کی خنک ہوا طویل جدائی کا نوحہ سنانے لگی۔

وفا نے ڈاکٹر آصف کی طرف دیکھا۔ آس و یاس کے ان لمحوں میں وہ کتنے اچھے، کتنے اپنے سے لگ رہے تھے۔

"نہیں...... نہیں۔" وفا کے اندر کی کمزور عورت کا دل چلایا۔ شاید بہت کم وقت رہ گیا تھا۔

"وفا!" اچانک وہ مڑ کر بولے۔

"میرا لانگ کوٹ تو دینا۔" کتنا خوبصورت گھریلو انداز تھا کہ وفا کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔

"باہر موسم اتنا زیادہ سرد تو نہیں۔" اس نے کہا۔

"باہر کے موسم کا تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔" بات شروع کرتے کرتے انہوں نے حسب

عادت سگار جلا لیا۔ وفا نے کالا لمبا کوٹ الماری سے نکال کر ان کے کندھوں پر ڈال دیا۔

"کہیں جا رہے ہیں؟" وفا نے پوچھ ہی لیا۔ حالانکہ دل کی وحشت بڑھ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ حسب عادت دھوئیں کا غبار بکھیر کر بولے اور اس غبار میں ان کا چہرہ چھپ گیا۔

وہ بریف کیس اٹھا کر جانے کو بڑھے، مگر کچھ سوچ کر رک گئے۔

"میں کچھ بھی سہی۔" ان کی گمبھیر آواز یہ وحشت ناک سناٹا چیر گئی۔ "مگر اتنا ضرور یاد رکھنا کہ......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر اُسے دیکھنے لگے۔

بڑی گہری اور افسردہ نظریں تھیں۔

"الوداع!" آنکھیں بولنے لگیں۔

"میں لوٹ آؤں گا۔" لب پکارے۔

"الوداع!" وفا کی آنکھوں کے آنسو چلائے۔ "الوداع میرے حبیب کہ اب بھروسوں کے زمانے گزر گئے۔"

اُن کے قدم آگے کی سمت بڑھے اور پھر بند دروازہ اُن کی اور وفا کی زندگی کے درمیان حائل ہو گیا۔

باہر فضا سرد تھی۔ ہواؤں میں شدت اور تیزی آ گئی تھی اور پانی کا بہاؤ شمال کی طرف پا کر وہ نہایت مطمئن انداز میں اپنے انتہائی ضروری مشن پر جا رہے تھے۔ آبادی بہت دور رہ گئی تھی۔ چاند کی دھندلی روشنی میں وہ کچے راستے پر درختوں کے درمیان بنی سڑک پر رواں دواں تھے۔

اچانک وہ رُک گئے۔ بند گاڑی کے اندر گہرا سکوت تھا اور بہت دُور آگے رات کے اس گھور سیاہ اندھیرے میں درختوں کے جھنڈ میں ایک مشعل روشن تھی۔

"سب ٹھیک ہے نا؟" ڈاکٹر آصف نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یس سر!" بھاری اور کرخت آواز گونجی۔

"پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انہیں جلتی مشعل کی طرف گھوم جانا تھا اور گاڑی کی لائٹس آن کیے بغیر اس جلتی مشعل کی رہنمائی میں باقی فاصلہ طے کرنا تھا۔

مگر وہاں جلتی مشعل ساکن تھی۔ صرف جلتا شعلہ نظر آیا تھا۔

"کریم داد۔" ڈاکٹر آصف کی آواز میں لرزش تھی۔ "کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

جلتی مشعل رہنمائی کرنے کے بجائے قریب آ رہی تھی۔

"لو سر۔" کریم داد اعتماد سے بولا۔ "اپنے ہی لوگ ہیں ممکن ہے ابھی تک ہمیں دیکھ نہ سکے ہوں۔"

"پھر......؟" انہوں نے مشورہ لینے والے انداز میں پوچھا۔

"ذرا سا آگے تو بڑھیں۔" اس نے اسٹین گن پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ "ویسے لیبارٹری کی عمارت داہنی طرف ہے۔" ڈرائیور نے حسب عادت سر ہلا کر تعمیل کی اور گاڑی کا رخ مڑ گیا۔

مگر اب مشعل نے حرکت کرنی شروع کر دی اور اس کا رُخ سامنے کی طرف ہو گیا۔

"اوہ!" وہ حسب عادت غصے میں آ گئے۔ "یہ کمال الدین تو نرا گدھا ہے۔" انہوں نے مشعل سے رہنمائی کرنے والے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

گاڑی مڑ گئی اور مشعل کی سمت چلنے لگی۔

آزمائش کے لمحے قریب تھے۔

انہوں نے تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک دم بیشمار روشنیاں جل اٹھنے کے باعث ان کی آنکھیں چکاچوند روشنی سے بھر گئیں۔

"ہینڈز اپ۔" ایک سخت آواز گونجی۔

سب لوگ دم بخود ساکت کھڑے تھے۔ وہ جس وطن کی مٹی سے غداری کرتے تھے اور آج اسی دھرتی پر کھڑے اس کے محافظوں کے نرغے میں مقید اپنے ہوش وحواس کھو چکے تھے۔

مگر پہلی گولی ڈاکٹر آصف نے ہی تو چلائی تھی اور پھر زبردست طوفان اُمڈ آیا تھا۔

گولیوں کی زبردست بوچھاڑ نے ہر طرف لہو رنگ بکھیر دیا۔ بڑا جان لیوا معرکہ تھا کہ جسم و جان کے ساتھ روح بھی گھائل ہو گئی تھی۔ مگر احساس فرض پکار رہا تھا۔ "ہم ابھی زندہ ہیں' دیکھو...... وقتی طور پر بھٹک جانا دوسری بات ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ ہم اپنا فرض بھول گئے ہیں۔ ہم تو فرض کی پکار پر جان دینے والوں کی نسل ہیں اور سنو ہم اس پکار پر ایک ہو کر سوچتے ہیں۔ اے وطن کی مٹی گواہ رہنا کہ ہم میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

معرکہ ختم ہو گیا۔ کمانڈو ایکشن کے چیف نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سامنے

ڈاکٹر آصف اپنے ساتھیوں سمیت خاموش پڑے تھے۔ ان کا لہو قطرہ قطرہ ٹپک کر اس مٹی میں جذب ہو رہا تھا' جس سے بے وفائی کرنے کا سبق وہ غیروں سے سیکھ کر یہ بھول چکے تھے کہ مٹی اپنا قرض کبھی معاف نہیں کرتی۔

چاند اتر کر بالکونی کے عین اوپر آن رُکا۔ رات گزر رہی تھی مگر جانے والا لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ ایک بے قرار روح مضطرب تھی کہ اچانک ایک شور اور ہنگامے نے ہر طرف سے آصف لاج کا گھیراؤ کر لیا۔

"اب یہاں کیا باقی رہ گیا ہے؟" وفا نے دُکھ سے سوچا۔ "شکر ہے کہ اس منزل پر وفا کے قدم ڈگمگائے نہیں ورنہ شاید قربانی کی برسوں پرانی ریت اس طرح نبھ نہ سکتی۔"

سارے گھر کی بتیاں روشن تھیں۔ مگر دل کے اندر والی تہہ تک گہرا سیاہ گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور وفا کی نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ وہاں تنہا' اداس اور خاموش ملائم شاہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ یہ شاید کامیابی کی نوید کا ردعمل تھا یا پھر جذبات کا کوئی نازک پہلو۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش میں خاموش تھا۔

وہ آگے بڑھا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ وفا کے سر پر ٹک گیا اور آنسوؤں کی ایک قطار اس کے معصوم و مسکین چہرے پر رواں ہو گئی۔ وفا کو سہارا دے کر وہ باہر تک دلایا اور وہ پتھرائی ہوئی اس گاڑی کے سامنے کھڑی ہو گئی جس کے اندر ڈاکٹر آصف کا وجود بے بس اور خاموش پڑا تھا۔ مضبوط اور نہ مٹ سکنے کا اعتماد رکھنے والا۔ وہ خاکی انسان بہت دُور جا چکا تھا۔

ملائم شاہ وفا کی بیوگی کا دُکھ لیے آزردہ تھا۔ وفا نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم جیت گئے۔" اس کے لب تھرتھرائے مگر......!

"مبارک ہو......" وفا کی وفا شناس روح بولی۔

سب ہی کچھ تو کھو گیا تھا۔ سب کچھ مٹ گیا تھا اور وہ اماں کے چھوٹے سے گھر کے کچے آنگن میں کھڑی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہانی کا انجام کیا عجیب ہوا تھا۔

بہت سا وقت گزر گیا تھا۔ اداس اور ویران شام اُتر آئی تھی۔ فضا میں اب ہر طرف سکون تھا۔ اس گزرتے وقت نے آہستہ سے مرہم کا پھایا رکھ دیا۔

مسکین چہرے اور دُکھی دل والا ملائم شاہ اس اندھیری شام میں پھر سے سامنے چلا آیا۔ "سنو

وفا۔'' اس نے پوچھا۔ ''تم نے کچھ سوچا؟''

''تمہارا اس طرح دُکھ بانٹ لینے کا سوال بہت مشکل ہے۔'' وفا نے جواب دیا۔ ''میں آزمائش کے ایک طویل دور سے گزر چکی۔ وفا سرخرو ہو چکی۔''

''مگر آخر کب تک اس طرح تم......؟؟''

''میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گی۔'' اُس نے دکھی آواز میں کہا۔

''اگر چاہوں بھی تو اس راہ پر کبھی آگے نہ بڑھ سکوں گی۔''

''آخر کیوں......؟'' وہ اُلجھ کر بولا۔

''اس نے وقت کے آخری لمحے میں مجھے اپنی محبت کا ثبوت آنسوؤں کی صورت میں دیا تھا ملائم شاہ۔ کاش وہ آنسو تم دیکھ سکتے جو اس صبح میرے چہرے پر گرے تھے۔ وہ آنسو سرمایہ حیات تھے اور وفا کا اعلان تھے۔ اُن پتھر آنکھوں سے نکلے وہ آنسو ایک دولت تھی' مجھ سے وفا کی دولت اور وفا شعار لوگ یہ دولت سنبھال کر رکھا کرتے ہیں۔ دوسروں کو سونپا نہیں کرتے۔''

بے تحاشا آنسوؤں کی برسات برسنے لگی۔ ملائم شاہ نامراد وفا کے در سے جانے لگا۔ وہ دہلیز تک پہنچا تو وفا کی آواز آئی۔

''اور سنو! وفا کسی کی بھی میراث نہیں ہوا کرتی۔ وہ مذہب' ملت' وطن اور انسان سب کے لیے ہوتی ہے۔ آج سے اِس احساس کے ساتھ جیو کہ تم جہاں بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

اداس اور دُکھی ملائم شاہ نے اپنے آنسو پونچھے اور پھر دہلیز عبور کر کے باہر گلی کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

* * *

پاؤں کی جوتی

شوال کا چاند دیکھتے ہوئے ملا جی کی نظر صرف ایک بار بھٹکی اور پھر وہیں جم کر رہ گئی۔ ملکوں کی حویلی کی چھت پر آسمان کے نیچے اور دھرتی سے اوپر باریک ہلال کے ساتھ ابھرتے ستارے کی بالکل سیدھ میں ایک سنہری سراپا چمک رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرا اور لاحول پڑھتے ہوئے نیچے اتر آئے کہ احتیاط اور مذہب کا تقاضا یہی تھا۔ صرف ایک نظر تو جائز تھی' لیکن عورت پر جان بوجھ کر دوسری نظر ڈالنے کا راستہ سیدھا جہنم کی طرف جاتا تھا۔ بچپن ہی سے انہیں یہی کچھ بتایا گیا تھا۔

محلے کی مسجد سے قریب ترین حجرے نما گھر میں رہنے والے ملا باقر علی شاہ کے چھوٹے فرزند سید اعجاز حسین شاہ عرف چھوٹے ملا جی بے حد شریف النفس انسان تھے۔ حلیے کے اعتبار سے راہ چلتی لڑکیوں کو وہ تیسرے درجے کے اداکار لگتے' جن کی چال ان کے جسم کا ساتھ دینے سے قاصر رہتی اور اعضا اِدھر اُدھر جھومتے رہتے۔ گیروے رنگ کا بے حد لمبا کُرتہ، شلوار ٹنگ مہری کی ٹخنوں سے اونچی اور ایڑیوں پر سے گھسی ہوئی چپل۔

حلیے کے اعتبار سے تو وہ ہرگز متاثر کرنے والی شخصیت نہیں تھے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کو جب یہ بتایا جاتا کہ موصوف اسلامیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد اسلامی موضوع پر ریسرچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ اپنی مخصوص ادا کے ساتھ ایک دوسرے کو ''Dont Tell Me'' کہہ کر اظہار حیرت کرتیں۔

اگرچہ حلیے کا حال خراب ہی سہی کہ یہ سو فیصد ان کے اپنے اختیار کی بات تھی، مگر شکل و صورت دینے میں خدا نے نہایت فیاضی سے کام لیا تھا۔ آباؤ اجداد کا سلسلہ سیدوں کی کسی اعلیٰ ہستی

سے جا ملتا تھا۔ گلابی رنگ کی آمیزش لیے گال، لمبی ستواں ناک سے ذرا نیچے اور گلابی ہونٹوں کے اوپر چپکی مثلث نما سنہری مونچھیں۔ جن کے کونے ذرا ذرا سے باہر نکل کر ڈاڑھی کے زاویے میں گم ہو جاتے تھے، لمبا قد اور کسی حد تک اسمارٹ جسم۔

اپنی شرمیلی مسکراہٹ سمیت وہ لڑکیوں کی نظر میں ایک ایسا سنگ میل تھے، جسے بے شمار نظریں دیکھتی ضرور ہیں۔ مگر بغیر چھوئے گزر جاتی ہیں۔

اپنے بے پروا اسٹائل میں وہ روز دو نمبر کی بس پکڑ کر جب جامعہ کے اسلامی شعبے کے سامنے ہاتھ میں گہری زرد کاپی اُٹھائے، پکڑ دھکڑ کا سا انداز لیے آگے جانے والی لڑکیوں سے بچتے بچاتے اترنے لگتے تو ایک ساتھ بے شمار چہروں پر مسکراہٹ کی لہر ابھر آتی۔ لڑکیوں کی نظریں کیسی بھی سہی، مگر وہ بھی اپنی ذات میں ایک اکائیاں تھے۔ کبھی کسی کو لفٹ نہ دی اور نہ ہی بے جا التفات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہم جماعت لڑکیاں عرف عام میں انہیں ''کریلا'' کہتیں اور وہ تھے بھی اسی سبزی کے ہم صفت۔ یعنی اوپر سے کھردرے اور اندر سے ملائم مگر بے حد کڑوے۔

ایک انسان کی شخصیت بنانے میں جو عناصر بے حد اہم کردار ادا کرتے ہیں سید اعجاز حسین شاہ کی شخصیت بنانے والے وہ عناصر سیدھی سادی سپاٹ زندگی گزار کر اب اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح اولاد کو ان رنگینیوں سے دور رکھا جائے، جو ان کا مقدر نہیں بن سکی تھیں۔

پہلا عنصر تو تھے بڑے مُلا جی، ایک درجن اولاد کے خالق سید باقر علی شاہ بھلے وقتوں میں انڈین آرمی میں حوالدار رہ چکے تھے۔ برما کے محاذ پر جاپانیوں سے ان کی دست بدست لڑائی کا حال اہلِ محلہ اتنی بار سن چکے تھے کہ انہیں زبانی یاد ہو چکا تھا اور یہ داستان اب سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی جا رہی تھی۔ بات کا بتنگڑ بنانا انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ڈینگیں مارتے ہوئے وہ اکثر وہاں تک نکل جاتے جہاں انہیں لوگوں کی دبی دبی ہنسی بھی نہ سنائی دیتی۔ لوگ ان کا مذاق اڑاتے، آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے، مگر سنتے جاتے کہ سنانے والے ملا جی ہوتے تھے۔

نماز کے درمیان وقفے میں اکثر یہ محفل جمتی اور جب محفل عروج پر پہنچ جاتی تو سننے والوں کا اٹھنا محال ہو جاتا۔ مذہب کو جان سے عزیز رکھنے والے لوگ مُلا جی کی زبان کا ہر لفظ تبرک سمجھتے۔ بھلے آپس میں لاکھ مذاق اڑاتے رہیں، مگر محفل سے اٹھ کر جانے کی کوشش کوئی نہ کرتا۔ ہر بار محفل کے اختتام پر جب مرد حضرات واپس تشریف لاتے تو محلے بھر کی بیویاں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ مُلا جی کی شان میں بھی قصیدے سنا ڈالتیں۔

دوسرے روز جب کوئی منچلا ازرہِ تعریف کہہ دیتا۔

''وہ جی کل باؤ کی اماں نے پوچھا۔ دیر سے کیوں آئے تو میں نے کہہ دیا کہ ملا جی کی باتیں سن رہا تھا وہ کہنے لگی......'' کہنے والا ذرا دیر کو رکتا کہ ملاجی کی حالت اس ٹائر کی طرح ہو جاتی، جو عنقریب پنکچر ہونے والا ہوتا ہے۔ بظاہر وہ توجہ نہ دے پاتے۔ مگر اندر ہی اندر کھد بد جاری رہتی کہ باؤ کی اماں نے کیا کہا؟

''کہنے لگی واللہ ایمان تازہ ہو گیا ہو گا۔'' کہنے والا دل ہی دل میں مسکراتا حالانکہ باؤ کی ماں کا قصیدہ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہا ہوتا۔

ملاجی گہری سانس لے کر مطمئن ہو جاتے۔

ملا جی کی زندگی میں عورت کا صرف اس حد تک تعلق رہا کہ ان کی مہربانی سے اپنے پاؤں تلے جنت لا کر اس جنت کی آبیاری میں مصروف ہو گئی تھی۔ اپنی گفتگو میں وہ عورت کا ذکر پاؤں کی جوتی کے انداز میں کرتے۔ آن کے زریں اصولوں کے مطابق اس مخلوق کو منہ لگانا، عقل کے سنہرے اصولوں کے سراسر منافی تھا۔ اپنے گھر میں وہ اس اصول پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔

ان کی بیگم اور محلے بھر کی ''بیوی جی'' ایک عاجز خاتون تھیں۔ جن کو ملا جی دن کی روشنی میں شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے۔ مسجد اور محلے کی مصروفیات انہیں اس بات کی اجازت کم ہی دیتی تھیں اس کے باوجود وہ اپنے گھر سے غافل نہیں تھے خدمتِ خلق سے فارغ ہو کر ہر آدھ گھنٹے بعد وہ گھر کا چکر ضرور لگا جاتے۔ ان کی چمکتی سیاہ آنکھیں کونے کونے کا جائزہ لے کر اطمینان کرتیں کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ لڑکوں نے کسی غیر عورت اور لڑکیوں نے کسی غیر مرد سے بات نہیں کی۔ رہ گئیں بیوی جی، تو ان کی بھلا اب ایسی باتوں کی کون سی عمر رہ گئی تھی! ساری جوانی امام صاحب کے سائے تلے گزار کر وہ سو فیصد جنت کی حق دار ہو چکی تھیں اب اس عمر میں اپنی عاقبت بھلا کیوں کر خراب کر لیتیں؟ یہی وجہ تھی کہ ملا جی کم از کم اس بے بس گائے کی طرف سے قطعی طور پر غافل تھے!

پھر بھی ہر آدھ گھنٹے کا یہ سرسری دورہ اولاد کی نگرانی کے لیے عمل میں آتا تھا۔ یہاں تک کہ جوں توں کر کے آٹھ بیٹیوں کو بیاہ چکے تھے۔ دو بڑے بیٹے بھی بیاہ کر اپنی سسرال جا چکے تھے۔ وہ یوں کہ ان کے تیکھے مزاج والی بیویوں نے ملا جی کے زیرِ سایہ رہنا گوارا نہ کیا تھا۔ منجھلا بیٹا بچپن میں ہی ماموں نے مانگ لیا تھا۔ مگر اب وہ ان راہوں پر چل نکلا تھا، جہاں اُسے پہچان کر بھی مولانا اپنی اولاد بتاتے ہوئے شرماتے تھے۔

لے دے کے صرف بڑھاپے میں پیار کی آخری نشانی اعجاز رہ گئے تھے۔ جن پر انہوں نے دستِ شفقت کچھ اس حد تک رکھا تھا کہ ان کی اپنی کوئی شخصیت باقی ہی نہ بچی تھی۔

اعجاز حسین شاہ اَب عمر کی اُس منزل پر تھے جہاں کسی بھی جگہ رک کر سکون اور پڑاؤ نصیب نہیں ہوتا۔ مدھر سپنے جھونپڑی، محل، کوٹھی، مکان ہر جگہ ہر موسم میں گنگناتے، برسات کی سی پھوار لیے اتر آتے ہیں۔ مگر وہ تو سارے احساسات سے عاری تھے۔ بقول اپنی کلاس فیلوز۔

"اتنا اچھا، اتنا اسمارٹ لڑکا جوانی میں ہی اپنی قدامت پسندی سے ضائع ہو رہا تھا۔"

ان کی ساری زندگی گھر سے مسجد اور مسجد کے حجرے سے یونیورسٹی تک کی آمدورفت کے محور پر گھوم رہی تھی۔ گھر میں ان کا بہترین وقت وہ ہوتا جب ماں انہیں مسکرا کر دیکھتیں۔ انہیں یوں لگتا جیسے ساری کائنات مسکرا رہی ہو لیکن جب بھی گھر کے کسی کونے سے ملا باقر علی شاہ کی کھردری زبان سے "اوئے۔ اعجاز" کی آواز آتی تو وہ کانپ جاتے۔ جہاں، جس وقت، جس حالت میں ہوتے بھاگ کر باپ کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ سفید کروشیے کی ٹوپی کے نیچے ملا جی کا قدرے لمبوترا سر اور گندمی رنگت پر چمکتی کالی آنکھیں، اعجاز عرف چھوٹے ملا جی کے وجود میں پیوست ہو جاتیں۔

اعجاز کو ایسے محسوس ہوتا جیسے جلد کی بجائے ان کے جسم پر ایک ایسا ٹرانسپیرنٹ چپکا دیا گیا ہے جس کے آر پار مولانا کی نظریں اچھی طرح دیکھ سکتی ہیں۔

"جی آیا جی۔" وہ نماز کے انداز میں ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے ہو جاتے۔

"اوئے......" وہ ان کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہتے "یہ...... یہ رخساروں پر سے ڈاڑھی کے بال کدھر گئے؟"

"وہ جی۔" اعجاز کے لہجے میں مسکینوں کی سی عاجزی ہوتی۔ "شیو کے دوران خط بناتے ہوئے ذرا کٹ گیا تھا جی۔" وہ پوری تفصیل بتاتے۔

"دماغ کہاں بھٹکتا ہے تیرا۔" وہ بھویں تان کر اور لبوں پر ایسی مسکراہٹ لا کر کہتے جو اگر اعجاز دیکھ بھی لیتے تو محسوس نہ کر سکتے تھے۔

"اوئے۔ خیالات سیدھے رکھ تو ہاتھ بھی سیدھا ہی چلے گا۔ اچھا اب تو جا۔" وہ حدیث کی موٹی سی کتاب کھول کر بیٹھ جاتے اور چھوٹے ملا جی، جلدی چھوٹ جانے پر خدا کا شکر بجالاتے اور گالوں پر ہاتھ پھیر کر اپنی جلد کی اُس نرمی کا احساس کرتے جو بذاتِ خود بالوں کی قید سے آزاد

ہونے پر اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوتی۔ کمرے میں آ کر وہ کتابوں کی دُنیا میں گم ہو جاتے جو صرف ان کی اپنی تھی۔

امتحان اپنے ناگوار بوجھ سمیت اعجاز حسین کی زندگی سے نکل چکے تھے۔ ان کا واحد سہارا کتابیں، اب خاموش پڑی تھیں۔ زندگی کا سفر محدود ہو کر صرف حجرے، گھر اور مسجد کے درمیان رہ گیا تھا گھر کی فضا ان دنوں عجب سی تھی۔ ملا جی کی بڑی بیٹی عشرت بیگم اپنی ساس سے لڑ جھگڑ کر میکے آ گئی تھی۔ ساتھ میں وہاں گزارے گئے بے مثال وقت کی چھ نشانیاں بھی موجود تھیں، جن کو ایک ساتھ پالنا بے حد مشکل کام تھا اور بیٹی نے ایسا گل کھلایا تھا جس کا اختتام صرف طلاق پر تھا۔

حالانکہ ملا جی بیٹیوں کو جوانی میں کوئی کارنامہ انجام دینے کی مہلت دیے بغیر یکے بعد دیگرے چودہ سال کی عمر میں بیاہ کر، بے فکر ہو گئے تھے۔ گھر میں مچنے والے اودھم نے اعجاز، ملا جی اور بیوی جی کی پرسکون زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ ملا جی کو ایک عرصے سے گھر میں خاموشی اور سکون کی عادت تھی۔ وہ اعجاز اور بیوی جی جیسے بے زبان جانوروں پر حکم چلانے کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر عشرت بیگم واپس کیا آئیں کہ گھر بھر میں منہ پھٹ بچوں کی گالیاں ملا جی کی تعلیم کی نفی کرنے لگیں۔ وہ بچوں کو ڈانٹ کر ایک بات کہتے تو وہ نانا جان کو ایک کی دس سناتے۔ یہ بات انہیں ددھیال سے ورثے میں ملی تھی۔ معرکہ گرم ہوتا۔ عشرت بیگم بچوں کی طرف داری کرتے ہوئے اپنے مجازی خدا کی شان میں وہ وہ کلمات ادا کرتیں کہ اہلِ محلہ عش عش کر اُٹھتے۔ بیوی جی دبی زبان میں بولتیں تو ملا جی کا سارا غصہ ان پر اترتا۔ ان کی زد میں بیوی جی اور اعجاز صرف دو نفوس تو رہ گئے تھے۔ بیوی جی بھی عشرت بیگم کی موجودگی میں کچھ کچھ بولنے لگی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ کم از کم ان دنوں ملا جی انہیں مارنے کی صورت میں اپنی دی گئی تعلیم کو عشرت بیگم کے سامنے ہرگز نہیں جھٹلائیں گے۔ پھر بھی وہ بے حد غصے میں حسبِ عادت ان کی طرف لپک پڑتے اور وہ بدک کے پیچھے ہٹ جاتیں۔ بچے نانا کے غصے کا جو ان کے مذہب کی رُو سے سراسر حرام تھا، مذاق اڑاتے۔ بعض اوقات تالیاں پیٹ پیٹ کر فریقین کو اپنی بے ہنگم آوازوں کے ذریعے جوش دلانے سے بھی باز نہ آتے۔

"اوئے ذرا ہٹ کے بچ کے بھائی اولگا۔" جیسی آوازیں سن کر عشرت بیگم کو بھی بچوں کی بدتمیزی، وقتی تفریح کا سامان بہم پہنچاتی اور وہ کھی کھی کرتے ہوئے دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر قہقہہ روکنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ رہے چھوٹے ملا جی تو ان کی حیثیت اس سارے کھیل میں گیارہویں

کھلاڑی کی سی تھی جو ابھی اس میدان میں آنے والے ہوتے اور جب آجاتے تو آخری کھلاڑی ہونے کی بنا پر کھیل جلدی ختم ہوتا۔

وہ زندگی کی ایک عام سی، سیدھی سپاٹ شام تھی۔ کئی دنوں کی گرمی کے بعد آج بادل گھر آئے تھے اور ہوا میں کسی قدر خنکی تھی چھوٹے ملا جی حجرے سے نکلے اور مغرب کی نماز کے لیے مسجد کی طرف چلے۔ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر کے جب واپس لوٹے تو باپ کی ہدایت پر ان کا پیغام پہنچانے مفتی صاحب کے ڈیرے کی طرف چل دیے۔

ملکوں کی حویلی راستے میں پڑتی تھی۔ وہ تنگ گلی کی پچھلی طرف نظریں جھکائے چلے جا رہے تھے کہ اچانک حویلی کے پچھلے دروازے سے ایک گلابی آنچل تیزی سے آگے بڑھا۔ یہ بڑے ملک صاحب کی بیٹی نزہت تھی۔ وہ عین ان کی نظروں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

گلی میں دور تک کسی اور کا گزر نہ تھا۔ شام کا بڑھتا ہوا اندھیرا گلی میں پہلی تاریخوں کی سی باریکی لیے چاند جیسی لڑکی اور چھوٹے ملا جی پسینہ ان کے جسم کے مساموں سے پھوٹ نکلا۔ وہ پیچھے ہٹے اسی وقت ایک ملائم ہاتھ ان کے چہرے سے لگا۔ انگلیاں بالوں پر پھرنے لگیں پھر ایک شوخ آواز ابھری۔

”اوئے۔ کی ریگ مال ورگا منہ اے تیرا۔“

اعجاز حسین کا سارا وجود زبردست قہقہوں کی بوچھاڑ میں آگیا۔ حویلی کی کھڑکیاں کھل کر اپنے شیشوں کے اندر سے جھانکتی بے شمار آنکھوں کو سامنے لے آئیں۔ چھوٹے ملا جی بوکھلائے، بے اختیار پہنی ہوئی ٹوپی پر ہاتھ رکھا اور بھاگ کر باقی فاصلہ طے کر گئے۔ گلابی آنچل ہنستے ہوئے وجود کو اپنے جلو میں لیے کھلی ڈیوڑھی کے اندر گم ہو گیا۔ اعجاز حسین نے ایک جگہ رک کر لاحول پڑھی۔ لڑکیاں اس زمانے میں اتنی زیادہ بے شرم ہو گئی تھیں، اس کا انہیں اندازہ نہ تھا۔ وہ عجیب کیفیت میں مفتی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے اور واپسی کے لیے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔

گھر کی فضا ویسی ہی تھی جیسی ہر روز ہوتی تھی۔ مگر جانے کیوں سید اعجاز حسین شاہ کو اس کے در و دیوار سے نیچے اترتی کالی گھور رات بہت روشن اور چمکیلی لگی۔ رات بھر گلابی آنچل سپنوں میں لہراتا رہا۔ ملائم ہاتھ کا مدھر لمس اور شوخی سے بھرپور آواز۔

”اوئے۔ کی ریگ مال ورگا منہ اے تیرا“ کانوں میں شہد گھولتی رہی۔

ان کی زندگی کی یہ پہلی رات تھی جس میں انہیں نیند بالکل اونگھنے والے انداز میں آئی۔ وہ

بے شمار آیات پڑھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے رہے مگر گلاب آنچل تمام تر ضدی اداؤں کے ساتھ خوابوں میں موجود رہا۔ پھر وہ صبح کے مدہم اجالے میں ان کے بالکل قریب چلی آئی۔ چھوٹے ملا جی نے چاہا کہ بڑھ کر چھوئیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان سے پہلے ہی وہ ملائم سفید ہاتھ گال پر آن کر ٹک گیا اور مخروطی انگلیاں بالوں میں پھرنے لگیں۔ انہوں نے آہستہ سے نزہت کا ہاتھ تھاما اور اس کا سراپا دیکھنے کی کوشش کی۔ کالی چپل میں جکڑے سفید پاؤں ننھے منے خرگوشوں کی طرح زمین پر دھرے تھے۔ گلابی شلوار کے اوپر گلابی آنچل لہرا کر پاؤں کو چھو رہا تھا۔ چھوٹے ملا جی نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور چاہا کہ ایک ہی بار اسے دیکھ کر حسرت پوری کر لیں لیکن نگاہ اٹھاتے ہی بدک کر اس طرح اٹھے کہ گرتے گرتے بچے۔ اس نازنین کے نازک شاخ کی طرح لہراتے بدن کے اوپر ملا باقر علی شاہ کا چہرہ نمایاں تھا۔

”اوئے۔ اعجاز۔“ ملا جی کی آواز گونجی۔

”جی۔ ابا جی۔“ سید اعجاز حسین شاہ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

”اوئے نماز کے لیے کیوں نہیں آیا تو؟“

تب چھوٹے ملا جی نے دیکھا کہ کمرے میں صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ رات کا وہ مدھر اندھیرا اور آکاش سے سپنوں کے جھولے میں بیٹھ کر اترنے والی نزہت اب کہیں نہیں تھی۔ چارپائی کے بالکل سامنے ملا جی کا وجود اپنے اندر ساری کرختگی لیے اس سے جرح کر رہا تھا۔

عورت کا سامنا ہوتے ہی ان کی زندگی کی پہلی نماز قضا ہو گئی تھی۔

”اوئے۔ میں پوچھتا ہوں۔“ ملا جی نے حسب عادت ”اوئے۔“ کی تکرار کے ساتھ بات جاری رکھی۔ ”تو نے کل شام مفتی صاحب کو کیا پیام دیا تھا؟“

”وہ جی۔ میں انہیں بتا آیا تھا کہ آپ جمعہ پڑھانے اس بار جامع مسجد نہیں جائیں گے۔ آپ کو جی کہیں اور جانا ہے۔“ بڑی مشکل سے تھوک نگل کر چھوٹے ملا جی نے جواب دیا۔

”اوئے کیا ہو گیا ہے تجھے؟ کس دنیا میں رہنے لگا ہے تو یہ کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں وکیل صاحب کا نکاح پڑھانے ہرنس پورہ جاؤں گا۔ وہ بھی نماز کے بعد وہاں آجائیں؟“ ملا جی نے پوچھا۔

”کہا تھا جی۔“ اعجاز حسین کو یاد آگیا۔

”تو پھر راستے میں تیرے آدھے خیالات کس نے چرا لیے؟ بتا؟“

اب وہ بھلا کیا بتاتے اگر بتاتے تو مار کھاتے لہٰذا خاموش کھڑے رہے۔ ملاجی صلواتیں سناتے اور اس کی ماں کو برا بھلا کہتے خود ہی مفتی صاحب کو بتانے نکل کھڑے ہوئے۔ اعجاز حسین ان کا کرخت چہرہ دیکھتے رہ گئے۔

دن گزر گیا۔ سہ پہر بھی رخصت ہوگئی۔ چھوٹے ملاجی حجرے میں ہی رہے۔ شام کو ملاجی کی غیر موجودگی میں امامت کے فرائض انہی کو انجام دینے تھے۔ عشا کی نماز سے ذرا پہلے وہ کھانے کے لیے گھر آرہے تھے۔ ذہن میں رات کا سپنا اور صبح سویرے کی ڈانٹ کا اثر تازہ تھا۔ انہیں یوں لگا جیسے ملاجی اُن کی ذات کے گرد حصار کھینچے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں۔ حالانکہ وہ اس وقت شاید وکیل صاحب کا نکاح پڑھانے کے بعد ولیمہ کھا رہے تھے۔ ملکوں کی حویلی راستے میں پڑتی تھی اپنے مسکن تک پہنچنے کے لیے انہیں یہیں سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ آگے بڑھے۔ کچھ سوچ کر جھجکے اور اس سے پہلے کہ وہ آگے کا سفر جاری رکھ سکتے۔ اچانک رباب کے تاروں سے نکلتی موسیقی نے ان کے سارے وجود کو حصار میں لے کر قید کرلیا۔ ان کے قدموں نے آگے جانے سے قطعی انکار کردیا۔

ملکوں کی حویلی میں ان کے پشاوری دوستوں نے نجی بیٹھک میں محفل جما رکھی تھی۔ عشاء کا وقت قریب تھا مگر وقت کے تقدس کے خیال سے دور، رات کسی اور ہی رنگ میں اُتری تھی۔ زندگی میں پہلی بار سنائی دینے والی موسیقی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ ایک دم دل میں اُتر گئی۔ وہ رباب کے تاروں کی دل فریب آواز میں کھو گئے۔ یہاں تک کہ اپنے وجود سے بھی غافل ہوگئے۔ ان کا سارا وجود صرف احساس بن گیا۔ جس نے پہلی بار کرخت آوازوں کی بجائے مدہم سروں کی موسیقی کو پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ اچانک یہ موسیقی برسات کی پھوار میں بدل گئی۔

اوپر سے کسی نے پانی سے بھری بالٹی انڈیل دی تھی۔ چھوٹے ملاجی کا اکہرا وجود ٹھنڈ میں نہا گیا۔ یک بیک انہوں نے اوپر دیکھا۔ جیسے ساری بات سمجھ گئے ہوں۔ نگاہوں میں بجلیاں تھرتھرائیں، رباب کے ساز کی دل میں اترتی آواز کے ساتھ ہنسی کی کھنک شامل ہوئی اور ''کھٹ'' کی بے ڈھنگی آواز کے ساتھ کھڑکی بند ہوگئی۔

چھوٹے ملاجی اس رات کھانا کھانے گھر نہیں آئے۔ وہاں سے ہی پلٹ کر وہ حجرے میں چلے گئے۔ کپڑے اتار کر نچوڑے اور چٹائی پر لیٹ کر ان سارے حالات پر غور کرنے لگے۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت ہوگیا اور انہیں گیلے کپڑوں میں ہی امامت کرنی پڑی۔ رات گئے محلے کا ایک بچہ بیوی جی کا پیام آنسوؤں کی زبانی لایا۔ تو وہ اٹھ کر گھر گئے۔ ملاجی واپس آچکے تھے اور وکیل

صاحب کے نکاح کی داستان بڑی گرم جوشی سے سنا رہے تھے۔

''ایسا پکا تھا کہ مرغ پلاؤ کی بجائے......'' وہ کہتے کہتے رک گئے! کھلے دروازے سے اعجاز حسین اندر آرہے تھے۔

''وجیہہ لگتا تھا۔'' بے معنی انداز میں گفتگو کا سلسلہ جوڑ کر وہ پھر سے بولنے لگے۔ ''بہت خرچہ کیا تھا کم بختوں نے۔ شرع پر تو کوئی چلتا ہی نہیں۔ اسلامی نظام بھلا کیا کرے؟'' اب ان کی گفتگو کا رخ چونکہ سیاست کی طرف مڑ گیا تھا لہٰذا سامعین جن میں ان کے آدھ درجن سے ایک زائد یعنی عشرت بیگم کی گود کا وہ بچہ جن کو وہ میکے میں جنم دے چکی تھیں بور ہوکر اٹھنے لگے۔

جلسہ ختم ہوتا دیکھ کر وہ اٹھے اور اعجاز کمرے میں آگئے۔

''اوئے۔ کچھ پریشان ہے تو؟'' انہوں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ بالکل اس طرح جیسے عالِم اپنے معمول سے بات کرتا ہے۔

''جی ہاں......ابا جی!'' ذرا وقفے سے ایک دم ان کے منہ سے نکلا۔

''کیا......؟'' ملاجی اس طرح چونکے گویا نوجوان بیٹے نے کوئی غیر متوقع بات بتا دی ہو۔

''تو پریشانی کیا ہے۔''

''وہ ابا جی۔ ملکوں کی لڑکی ہے ناں جی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے۔''

''کیا کہا اوئے۔ کون سی لڑکی۔ ایک سو میں لڑکیاں رہتی ہیں اُس آٹھ کنال کی حویلی میں......'' ملاجی شاید پوری طرح باخبر تھے۔

''نام کا نہیں پتہ جی۔'' وہ رک رک کر بولے۔

''سُن اوئے۔'' ملاجی نے اسے اپنا فلسفہ سمجھایا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے نا۔ تو یہ سمجھ کہ تو نے اسے دیکھا ہی نہیں! اب تو اُدھر سے مت گزرنا!'' وہ کہتے کہتے تھوڑی دیر کے لیے رک گئے۔ ''تجھے یقین ہے کہ وہ صرف تجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔'' وہ شک کی تصدیق کر لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے خیال کے مطابق سید اعجاز حسین شاہ کو وہاں تک پہنچا چکے تھے جہاں کوئی لڑکی اسے دیکھ کر طنزیہ تو ضرور مسکرا سکتی تھی مگر اس خیال سے ہرگز نہیں جو اعجاز حسین سمجھا تھا اور ملاجی کے ذہن کے مطابق انہوں نے اس کے دماغ میں اتنی عقل ضرور باقی چھوڑی تھی کہ وہ اپنے ہی خیال کو صحیح انداز میں سمجھ سکتا۔

''جی۔ ابا جی۔ اس وقت گلی میں اور کوئی نہیں تھا۔'' اعجاز نے بتایا۔

"تو ٹھیک ہے۔" ملا جی نے خیال کی تصدیق کے بعد بات جاری رکھنے کے انداز میں کہا۔

"تیری زندگی میں شادی سے پہلے کوئی عورت نہیں آنی چاہیے۔ میں کئی دنوں سے تجھے سمجھانے کی سوچ رہا تھا۔" ملا جی نے خطبہ دینے کے انداز میں کہا۔ "بھلے مانس۔ عورت جب زندگی میں آتی ہے تو ایمان زندگی سے نکل جاتا ہے۔ اب دیکھو ذرا۔" وہ خطابت کے جوش میں باآواز بلند بولے۔ "ایک سے ایک راشی افسر بھرا پڑا ہے اس شہر میں۔ سب جمعہ پڑھنے آتے ہیں جامع مسجد میں، میں نے ایک بار رشوت کے موضوع پر تقریر کی تو سب کے سب ڈرے، کانپے مگر کہنے لگے کیا کریں جی مجبور ہیں۔ گھر کا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ بیوی کی فرمائشوں سے تنگ آ کر رشوت لیتے ہیں!" انہوں نے اعجاز کے چہرے کا ردِعمل دیکھا اور کہنے لگے۔

"مرد جب کوئی برائی کرتا ہے ناں تو اس کے پیچھے ضرور کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت کو گھر ضرور لاؤ، ضرور بساؤ، مگر صرف پاؤں کی جوتی بنا کر۔ اگر تم ڈر گئے، دبک گئے تو ہو گا یہ کہ اگلے دروازے سے عورت اندر داخل ہو گی تو گھر کے پچھلے دروازے سے تمہاری مردانگی اپنی آن سمیت باہر نکل جائے گی......اوئے! سمجھے!" انہیں چپ دیکھ کر ملا جی دھاڑے۔

"جی۔ جی ہاں۔" وہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولے۔

"اوئے چپ کیوں ہو گیا نیک بخت۔" وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔ "میں نے پٹی تو نہیں باندھی تیری آنکھوں پر۔ بڑے بڑوں کا حشر خراب ہوتے دیکھا ہے میں نے اس صنف کے ہاتھوں۔ اوئے میں اور تو کیا چیز ہیں۔"

وہ زندگی میں پہلی بار اعجاز کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر ہنسے۔ اس وقت وہ اعجاز کو امام صاحب اور ناصح کی بجائے بے تکلف دوست کی طرح لگے۔ وہ جم کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے!

"یہ کپڑے کیوں گیلے ہیں تیرے؟" جرح ابھی تک جاری تھی۔ اعجاز خاموش رہے۔

"سب جانتا ہوں میں۔" وہ لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ سجا کر بولے۔ "پسینے چھوٹ گئے ہوں گے تیرے۔" اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے وہ بولے۔ "ارے یہ مظلوم اور کمزور مخلوق صرف ایک مسکراہٹ سے مرد کے اندر کی دنیا کو باہر لے آتی ہے۔ تو سمجھ رہا ہے ناں میری بات؟" ان کی وزنی دلیل اگرچہ اعجاز شاہ کے سر سے گزر گئی تھی۔ بہرحال انہوں نے گردن ہلا دی۔

وہ جانے کے لیے اُٹھے اور پلٹ کر بولے۔ "اب ادھر سے گزرنے میں احتیاط کرنا۔ بچے اگر وہ تجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تو اپنے ہونٹوں کو جواباً اس کی اجازت ہرگز نہ دینا۔ اوئے عورت

جب مسکرا کر مرد کو دیکھتی ہے ناں تو اس کا کوئی مطلب ضرور ہوتا ہے اور وہ مطلب کیا ہے؟" وہ کچھ دیر سانس لینے کو رکے۔ "اوئے جانتا ہے نا؟"

"جی۔ جی۔ نہیں۔" اعجاز شاہ کی آواز یوں نکلی جیسے گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہے ہوں۔

"اوئے مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مسکراہٹ کے بل بوتے پر اسے جیت کر اُس کی مردانگی سے کنگال کر دے اور مرد کی زندگی سے جب مردانگی نکل جائے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ تب وہ عورت اپنی شاطر چالوں سے زندگی بھر اسے اشاروں پر نچاتی ہے۔" وہ چپ ہو گئے۔

عورت کے متعلق ایسا ڈراؤنا فلسفہ سن کر اعجاز شاہ کو چپ لگ گئی۔ ایسی گم صُم، کمزور نظر آنے والی شے اتنی زبردست ہو گی۔ انہیں بہت حیرت ہوئی۔ انہوں نے بے بس مسافر کی طرح ملا جی کے چہرے کی طرف دیکھا مگر ان کی بات نہ جھٹلا سکے کہ ان باتوں میں اُن کی زندگی کا تجربہ بول رہا تھا۔

"اوئے کیا کہا ہے میں نے؟" اسے خاموش دیکھ کر ملا جی گویا ہوئے۔ "کچھ سمجھا؟"

"جی سمجھ گیا جی۔"

"چل اب ذہن سے ساری سوچیں جھٹک کر سو جا اور دیکھ پھر اب کوئی بات ہو نا تو مجھ سے کچھ مت چھپانا......"

"جی بہت بہتر۔" سعادت مند اولاد نے سر ہلایا۔ وہ اُٹھے لاحول پڑھ کر اعجاز شاہ پر پھونکی۔ جیسے اُسے دنیا کی تمام برائیوں سے محفوظ کر لینا چاہتے ہوں اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گئے۔

زندگی اپنی پہلی ڈگر پر آن رُکی۔ بے کیف شب و روز، اندھیری سیاہ راتیں، رزلٹ کے انتظار میں کٹتے دن، مسجد سے حجرے اور گھر تک کا سفر، ملا جی کی گرم نگاہوں کا سامنا، عشرت بیگم کے بچوں کی بدتمیزیاں، بیوی جی کی اداس التجا آمیز نگاہیں اور وہی اعجاز شاہ عرف چھوٹے ملا جی! کبھی ان کا دل چاہتا۔ وہ دلفریب شرارتیں ایک بار پھر ہوں۔ ویسی ہی ہنستی ہوئی موسیقی کی طرح آواز، پانی کا گرنا، کھڑکی کے بند ہونے کا دھماکہ اور ان کا بھیگتا، لرزتا بدن۔

خیالات بے قابو ہو کر نکلنے کی کوشش کرتے اور اعجاز شاہ کو انہیں پرانی ڈگر پر واپس لانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا۔ تب وہ باپ کے فلسفے پر غور کرتے۔ جس کے زیرِ اثر انہوں نے اپنی ساری زندگی گزارنی تھی۔

کبھی کبھی انہیں لگتا جیسے وہ انسان کی بجائے ایک کٹھ پتلی ہیں جس کی ڈوریاں بڑے ملا جی

کے ہاتھ میں تھیں اور وہ اسے کھینچتے کھینچتے وقت سے بہت پیچھے لے گئے تھے جہاں عورت کو دیکھ کر ان میں بولنے کی سکت ہی باقی نہ رہ جاتی تھی۔

انہوں نے سر جھٹک کر سو بار ان خیالات پر لعنت بھیجی۔ مگر دوسری یا شاید تیسری بار ایک حسین اتفاق راستے کے سنگِ میل کی طرح کھڑا ملا تو اعجاز شاہ کو یقین ہو گیا کہ زندگی اب پلٹا کھانے والی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی چاہے تو سو بار پلٹا کھائے، ان کی شخصیت کا پلٹ جانا مشکل ہی تھا۔ اس لیے کہ ان کی تعمیر میں معمار نے لوہے کی طرح مضبوط بنیادیں رکھی تھیں۔

وہ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کے درمیانی موسم کی ایک سہ پہر تھی۔ چھوٹے ملا جی کا رزلٹ آج ہی آیا تھا۔ انہوں نے کلاس میں ٹاپ کیا تھا۔ ساتھ ہی اسلامک ریسرچ سنٹر میں ریسرچ کی سہولت کے ساتھ نوکری کا مژدۂ جاں فزا بھی تھا۔ وہ آج بے حد خوش تھے۔ شکرانے کے نفل ادا کر کے وہ مسجد سے نکلے اور خوشی خوشی گھر کی طرف چلے۔ ساری مرادیں ایک ساتھ مل گئی تھیں۔ وہ دھیمے قدموں سے رواں دواں تھے۔

گلی خاموش اور ویران تھی۔ اچانک ایک آواز سانس کے زیر و بم کی طرح ابھری۔

"اوئے......جازی!"

اعجاز شاہ جہاں تھے وہی کھڑے رہ گئے۔ "اوئے" کہنے کا انداز تو ملا جی کا سا ہی تھا مگر یہ اس زبان پر آ کر اتنا شیریں کیسے ہو گیا؟ اور پھر "جازی" وہ تو صرف سید اعجاز حسین یا پھر "اوئے اعجاز" تھا۔ آج "جازی" کس طرح بن گیا؟

پچھلی ڈیوڑھی سے رنگین آنچل سمیت نزہت سامنے چلی آئی۔ "اوئے۔ اپنے ابا سے شکایت کیوں لگائی تھی میری؟ لالہ سے ناحق مجھ کو ڈانٹ کھلوائی۔ اللہ تجھے کبھی نہیں بخشے گا ملا جی۔"

اعجاز شاہ مبہوت کھڑے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"اور تو جو چاند کے بہانے اس شام مجھے چھپ کر دیکھ رہا تھا تو میں نے تو نہیں بتایا کسی کو ورنہ تیرے ابا......"

"کس شام جی؟" ابا کا سن کر اس کی تالو سے چپکی زبان بول اٹھی۔

"اوئے اسی شام۔ جب تو دعا مانگنا بھول گیا تھا۔ تیرے ہاتھ ویسے ہی اُٹھے رہ گئے تھے اور تو......" وہ رک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"معاف کر دیں جی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔" وہ جانے کو بڑھے۔

"اچھا ایک بات تو بتا۔" وہ میٹھی گولیاں چوستے ہوئے بولی۔

"کہاں سے آ رہے ہو اس وقت؟" ابا جی کے بجائے آج وہ جرح کر رہی تھی۔

"اسلامک ریسرچ سنٹر سے۔" اعجاز شاہ کی گھگھیائی آواز بمشکل نکلی۔

"کس پر ریسرچ کر رہے ہو؟" وہ ادا سے ایک آنکھ میچ کر بولی۔ اعجاز شاہ کا بدن کانپ کر بھاگ جانے کی فریاد کرنے لگا۔

"وہ اسلام پر جی۔" اب ذرا ہمت کر کے انہوں نے اوپر دیکھا انہیں حیرت ہوئی کہ ان کے قدم جانے کب بے خودی میں انہیں ڈیوڑھی کے اندرونی حصے تک لے آئے تھے جہاں کم از کم ابا کے دیکھے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ تھوڑے سے بے فکر ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"اسلام پر کیا ریسرچ کرو گے تم؟" نزہت کی آواز آئی۔

"اُف توبہ۔" وہ حیران رہ گئے۔ اتنی سی لڑکی کے یہ خیالات! معاملہ چونکہ مذہب کا تھا۔ لہٰذا اسے مطمئن کرنا اپنا فرض سمجھ کر انہوں نے بات شروع کی۔

"ایسا نہ کہیں جی۔ گناہ ہوتا ہے۔ اسلام تو وہ اعلیٰ نور ہے جس کی روشنی......"

"بس۔ بس۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اب زیادہ صفائیاں نہ پیش کرو۔ عورت کو تو ذرا بھی آزادی نہیں۔"

اعجاز شاہ کا دل چاہا۔ کہہ دیں۔ "اب اور کس قسم کی آزادی چاہتی ہیں؟ سڑکوں پر دندناتی اپنی صنف کو دیکھیے پاؤں کی جوتی کے بجائے مردوں کے سر کی ٹوپی بن گئی ہیں۔ مردوں کی عزت اب جن کے ہاتھ میں ہے۔"

مگر وہ اس وقت تقریر کے موڈ میں نہیں تھے۔ دوسرے وہ نزہت کو ناراض کر کے بلاوجہ کوئی پریشانی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ چند لمحے جو اس کے ساتھ کٹ رہے تھے تو کیا برے تھے۔ ابا جی اس وقت اپنے بلند و بالا فلسفے سمیت دور رہ گئے تھے۔

"آپ کو کیا پتہ ہے جی۔" اُس نے بات شروع کی۔

"مجھے سب پتہ ہے جی۔" وہ چھٹی گولی چوس کر اٹھلائی۔ "جو کچھ میں اسکول میں تھی جان گئی تو یونیورسٹی تک پہنچ کر بھی نہ جان سکا۔ جا بے ملا جی تو بھی یونہی رہا۔"

اس کا طنز سمجھ کر اعجاز شاہ کا دل دُکھ گیا۔ اپنی شکستہ شخصیت کا احساس، آزردہ کرتے کرتے بہت کچھ سمجھا گیا۔

"اچھا یہ بتا تیرا پورا نام کیا ہے؟" وہ اسے پوری طرح گھیرے ہوئے تھی۔

"سید اعجاز حسین شاہ۔"

"عرف چھوٹے ملا جی۔" وہ فقرہ پورا کر کے ہنس پڑی۔ "اُف اتنا لمبا نام۔ لگتا ہی کہ ایک ہی بندہ ہو گا۔ سید اعجاز حسین اور شاہ۔ تو کیا یہ ایک ہی بندے کا نام ہے۔ اُف۔"

"عجب منہ پھٹ لڑکی ہے۔" اعجاز شاہ نے سوچا۔

"جان ہی نہیں چھوڑ رہی۔" دماغ نے کہا۔

"تم جانا کب چاہ رہے ہو۔" دل نے بچی بات کہی۔

یوں کھڑے کھڑے دل و دماغ کی جنگ جاری ہو گئی۔

"سنو۔ تم اپنا نام 'جازی' کیوں نہیں رکھ لیتے؟ ویسے بھی آج کل چھوٹے ناموں کے فیشن ہے۔ مگر تم فیشن کرتے ہی کہاں ہو؟" وہ اس کے بے تکے لباس پر نظر ڈال کر بولی۔ چھوٹے ملا جی نے گھبرا کر شلوار ٹخنوں سے نیچے کرنے کے لیے اس پر ہاتھ مارا۔

"نام رکھ تو لوں جی مگر مجھے پکارے گا کون اس نام سے؟"

"میں۔" نزہت کے لبوں سے نکلی یہ سریلی "میں" دل کے اندر تک اُتر گئی اور دماغ بالکل ہار تسلیم کر لینے کے انداز میں کہیں دور چلا گیا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ سب کچھ......

"تم۔" وہ شہادت کی انگلی اُٹھا کر بولے۔ "تم کہو گی مجھے جازی...... بھلا کہو تو۔"

"جازی......" ہوا کا مدہم جھونکا سرگوشی کرتے ہوئے نکل گیا۔

"جازی......" بند کواڑوں سے آواز آئی۔

"جازی......" برسات کی پھوار برسی۔

"اوئے اعجاز......" بادل ایک دم گرجا۔ اعجاز شاہ گھبرا کر مڑے۔ وہ لالہ رُخ، ماہ پارہ غائب تھی اور ڈیوڑھی میں ابا کا چہرہ اُبھر اُبھر کر ڈوب رہا تھا۔

"کیا کر رہا ہے تو یہاں؟" انہوں نے متاعِ عزیز کا بازو پکڑ لیا۔

"وہ ابا جی۔ راہ چلتے بارش ہونے لگی تو میں یہاں کھڑا ہو گیا۔"

"دماغ خراب ہے تیرا۔" وہ اُسے تاریک ڈیوڑھی سے کھینچ کر باہر لے آئے۔ باہر آتے ہی اعجاز شاہ کی آنکھیں روشنی سے بھر گئیں۔

بارش نہ سہی مگر سورج اب دنیا کا سفر ختم کر کے ڈوب جانے کو تھا۔ تب اعجاز شاہ کو یہ احساس

ہوا کہ وہ اس سے باتیں کرتے کرتے وقت کا احساس بھلا بیٹھے تھے۔ ملا جی کو سر پر مسلط دیکھ کر ان کی گھگھی بندھ گئی۔ نزہت کی قربت اور اس کی باتوں میں، نرم اور مدھر لفظی کی بارش ہی ہوئی تھی۔ مگر اب جو بارش ہونے والی تھی اس کے احساس سے گھگھی کا بندھ جانا فطرت کے عین مطابق تھا۔

ملا جی اسے کھینچتے ہوئے گھر لے آئے!

بیوی جی حیران ہو کر آگے بڑھیں۔ عشرت پریشان سی اُٹھی مگر ملا جی نے اعجاز شاہ کو کمرے کے اندر لا کر دروازہ بند کر لیا۔

"سچ سچ بتا کیا کر رہا تھا وہاں؟" بڈھے شیر کی گرج میں گرتی عمارت کی شکستہ دھمک تھی۔

"میں آ رہا تھا یونیورسٹی سے۔ راہ میں لالہ کا پشاوری دوست مل گیا کہنے لگا لالہ کو یہ پیام دے دینا کہ پشاور سے......!" وہ رُک رُک کر مجرموں کے سے انداز میں بیان دینے لگے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ اب آگے کیا بتائیں۔

"ہاں۔ بول۔ پشاور سے کیا......؟"

"مال آیا ہے۔ وہ چھڑا لیں۔" دماغ نے ساتھ دیا۔ دل کا تو برا حال تھا۔

"اچھا تو یہ پیام دینے تو وہاں کھڑا تھا۔ مگر تو نے بارش کا بہانہ کیوں بنایا؟"

"ابا آپ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔" چھوٹے ملا جی نے اعتراف کر لیا۔

"اب تو جھوٹ بھی بولنے لگا ہے اعجاز۔ یہ گناہ ہے بیٹے۔" وہ خلاف اُمید ٹھنڈے پڑ گئے۔

"اور ایسے پیام تو آئندہ مت لانا۔ چار سو بیسی کرتے ہیں یہ لوگ۔ ارے ایسے ہی تو نہیں آٹھ کنال میں بنتی ناں حویلی! یہ ٹرک دکانیں اور اِدھر کا مال اُدھر۔ کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ اندھے ہیں ہم؟" وہ سانس لینے کو رکے۔ اعجاز شاہ چپ رہے۔

"اور یہ لالے کا پشاوری دوست ایک نمبر کا وہ...... ہے! اس مال سے کیا مراد تھی۔ نہیں سمجھا ہو گا تو...... یا سمجھا؟"

"نہیں ابا جی۔"

"سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ارے ابھی تیری عمر ہی کیا ہے؟" انہوں نے اعجاز شاہ کی پیٹھ تھپک کر دلاسہ دیا۔ رزلٹ اور نوکری کی خوشی کو وہ ہنگامے کی نذر ہرگز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اتنے نادان تو تھے نہیں۔ جانتے تھے کہ جھکی ہوئی ڈالی پر بوجھ ڈالا تو شاید ٹوٹے نہیں مگر تڑخ ضرور جائے گی۔

بیوی جی نے فضا کو سازگار دیکھا تو عشرت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خبر دی۔

اعجاز شاہ تھکے تھکے سے لگتے تھے۔ جلدی سو گئے۔

رات دھیمے سروں میں بہتی ندی کی طرح روانی لیے آ گئی۔ اعجاز شاہ نے چونکہ نزہت کو پہلی بار اتنے قریب سے اور اپنی کھلی آنکھوں اور بے فکر ذہن کے ساتھ دیکھا تھا۔ لہٰذا ان پر "پہلی پہلی دار میتوں ہو یا اے پیار" کی بجائے "پہلی پہلی وار میں نے تکی اے بہار" والی کیفیت طاری تھی۔ پیار والی بات کچھ فٹ نہیں تھی۔ اس لیے کہ ابتدائی تعارف میں فی الحال اس کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

"خواہ مخواہ ابا نے آ کر پھڈا ڈال دیا تھا۔" وہ یہی سوچتے ہوئے سو گئے اور نیند کی پری انہیں وہاں لے گئی جہاں وہ حقیقت میں نہ پہنچ سکتے تھے۔

پھر ایسے سپنے روز ہی دکھائی دینے لگے۔

اعجاز شاہ اِن دنوں داخلے اور نوکری کے معاملے میں الجھے رہے۔ نزہت کا وجود ذرا دیر کے لیے پس منظر میں گم ہو گیا مگر جلد ہی پھر جلوہ دکھانے آ گیا۔

اس دوپہر ریسرچ سنٹر سے اپنی پہلی تنخواہ وصول کر کے وہ واپسی پر بازار چلے گئے تاکہ اس خوشی میں آپا اور ان کی اولاد کے علاوہ ماں باپ کے لیے مٹھائی لے جاسکیں۔ مٹھائی کی دکان سے تھوڑے فاصلے پر واقع سنیما ہاؤس سے نزہت اپنی چار پانچ سہیلیوں کے ساتھ نکلی وہ تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے باہر آئی۔ اعجاز شاہ لاحول پڑھتے ہوئے سنیما ہاؤس کے باہر لگے پوسٹرز پر اداکاراؤں کے توبہ شکن پوزوں سے نگاہیں بچاتے ہوئے مٹھائی کی دکان تک پہنچے ہی تھے کہ وہ بھی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے قریب آ گئی۔ اعجاز کو دیکھ کر رکی اور باقی لڑکیوں سے بولی۔

"لو ہو گیا مسئلہ حل۔"

اعجاز شاہ اتنی بلاؤں کو قریب آتے دیکھ کر بوکھلا گئے۔ شکر ہے مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ ورنہ ضرور زمین پر گر جاتا۔

"ارے شاہ جی۔" وہ زور سے بولی اور باقی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "ہے نا بالکل فلمی سچویشن؟"

"ارے کیا ایسا ہوتا ہے ہیرو؟" نیلے برقعے سے آواز آئی۔

"تعارف تو کراؤ نا۔" اب کی بار نسواری برقعہ بولا۔

"پشاور والی خالہ کا بیٹا ہے نثار گل۔" اس نے اتنے اعتماد سے جھوٹ بولا کہ اعجاز شاہ حیران رہ گیا۔

"تاں ہی اتاں چٹا اے۔" اب کالے برقعے کی باری تھی۔

"خالو پٹھان ہیں ناں۔" نزہت نے ان کا شک دور کیا۔

"نثار گل۔ ہوں۔" شاید نیلے برقعے نے جالی دار نقاب سے ان کا جائزہ لے کر کہا تھا "کیا یہ نثار ہے تجھ پر نزی؟"

کھی کھی کرتی ہنسی اُمڈ آئی۔ "نزی۔ نزی۔" اعجاز شاہ کے دل نے پکارا۔ کتنا پیارا نام ہے۔ دماغ نے بھی رائے دی۔

دل اور دماغ اس وقت دونوں آزاد، اپنے اپنے مقام پر بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ صرف دل ہی دل میں ذرا اتھل پتھل جاری تھی۔ مگر اس دن کی نسبت تھوڑی کم یہ زبردست تبدیلی اعجاز شاہ نے وہیں کھڑے کھڑے نوٹ کی۔

"اوئے...... باؤ۔" دکاندار کی آواز نے خواب چکنا چور کر دیا۔ "مٹھائی چک تے لے جا اتاں بیبیاں توں اینتھوں۔"

"چلو بی بی جاؤ۔ راہ نہ روکو مسافراں دا۔" لڑکیوں نے فوراً یہ فیصلہ کر لیا کہ اب نزہت کو چھوڑنے نہیں جائیں گی وہ اب اپنے خالہ زاد "نثار گل" کے ساتھ جائے گی اور پھر وہ اپنے اپنے راستے پر چلی گئیں۔

اعجاز شاہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی اندھیری گلی میں زندگی کا سفر طے کر رہے تھے کہ نزہت روشنی کا گولہ بن کر ان کا رستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے ساتھ چلنے کے خیال سے انہیں وحشت ہو رہی تھی مگر اپنی روایتی بزدلی کی بنا پر وہ منہ سے کچھ نہ بول سکے۔

زندگی میں پہلی بار ایک کالے برقعے میں ملبوس وجود کو ساتھ لیے چلنا بے حد دشوار تھا۔ حالانکہ یہاں کسی کے بھی دیکھ لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ ابا تو اس علاقے میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ شریفوں کی بستی کے مکین تھے اور لہو ولعب کے اس علاقے میں آنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ یوں بھی صرف بس کا کرایہ ہی چار روپے تھا جو کہ خاصا بارگراں تھا۔ اُن کی طرف سے مکمل طور پر لائن کلیر تھی۔ دوست تو ان کا کوئی تھا ہی نہیں۔ یونیورسٹی کی کسی جاننے والی یا کلاس فیلو کے ملنے کی صورت میں وہ اپنی بہن کے حوالے سے نزہت کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ "ویسے بھی اسلام میں

سب مسلمان بہن بھائی ہی ہیں نا۔" انہوں نے دل و دماغ کی سوچوں کو راستہ دیا۔ نزہت کے ساتھ چلتے ہوئے ان کا دماغ دوبارہ اُسی پٹری پر چل پڑا جہاں خوف یا ڈر کا ہلکا سا شائبہ اور کچھ کچھ سرور بھی شامل تھا۔

"میدان پاکستان" تک انہیں تانگے سے جانا تھا۔ آگے چار گلیاں پڑتی تھیں اور پھر سڑک پار کر کے بالکل سامنے والے محلے میں ان دونوں کا گھر تھا۔ اعجاز شاہ نے تانگہ روکا۔ چال میں بے پناہ خود اعتمادی لیے نزہت اچک کر تانگے میں بیٹھی۔ اعجاز شاہ بھی دوسری طرف سے سیٹ پر بیٹھنے کے لیے بڑھے۔ تیزی میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ان کا گال نزہت کے برقعے سے نکلی سرسر کرتی زلفوں نے چھو لیا۔

"اوئے" وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "بچ کے بھئی۔"

چھوٹے ملا جی اس کی بے باکی سے کچھ پریشان ہو گئے۔

کوچوان نے چابک شڑاپ کی آواز کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر مارا۔ تانگہ ذرا آگے پیچھے ہوا اور پھر "ٹپ ٹپ" کی آواز کے ساتھ اس کی ٹاپیں سڑک کا سینہ کوٹنے لگیں!

نزہت گھر سے سہیلیوں کے ساتھ بہانہ بنا کر بارہ سے تین والا شو دیکھنے لالے سے چھپ کر گئی تھی کہ یہ حسین اتفاق ہو گیا۔ بالکل فلموں والے مناظر زندگی کی اسکرین پر ابھر آئے۔ چلتا تانگہ، ڈولتا لہراتا کالا برقعہ پکار پکار کر اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا اور ہیرو کے روپ میں سید اعجاز حسین شاہ عرف "جازی" تھے۔

"چھوٹے ملا جی" سے "جازی" بن جانے کا سفر پل بھر میں طے ہو گیا۔ اڑتے سپنے فضا سے ذہن کے دریچوں میں اتر کر آ بیٹھے یہاں تک کہ راستہ کٹنے لگا۔ تانگے والے نے ان کی پُراسرار چال سے کچھ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں بھی تو عمر کے ساتھ گھوڑے اور تانگے کا سارا تجربہ بول رہا تھا۔ ان کی خاموشی سے پریشان ہو کر اس نے ہنکارا ابھرا۔ تانگہ چلاتے ہوئے اسے پچھلی سیٹ سے ابھرنے والے مکالمے سننے کی عادت تھی۔ ورنہ اس کا مزاج برہم ہونے لگتا اور وہ سارا غصہ گھوڑے کی پشت پر نکالتا۔

"ہنکارا" سن کر وہ ہوش میں آ گئے۔

"اس ریگ مال کو ہٹا کیوں نہیں دیتے؟" نزہت نے بات شروع کی۔ "شکر ہے کہ داڑھی کا فیشن ہے آج کل۔ ورنہ میری سہیلیاں میرا مذاق اڑاتیں کہ ایسا ڈاڑھی والا کزن ہے تیرا۔"

"اوہ!" وہ ہنسے۔ گویا اعتراض اوپر کی منزل سے شروع ہوتا تھا۔ ابھی تو سارا بدن باقی تھا مگر عشق میں شرعی حدود کے اندر رہنا ضروری تھا۔ شرعی قربانی کا تو سوچنا بھی گناہ تھا۔ "مشکل ہے جی۔" اعجاز شاہ نے بے چارگی سے کہا۔

"کیوں۔ ابا ماریں گے کیا؟" نزہت مسکرائی۔ جانے کیوں اس لمحے اعجاز شاہ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا مگر انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔

"نہیں۔ بس دل نہیں چاہتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے بات ختم کرنی چاہی۔

"تو ذرا یہ نوکیں ہی درست کر لو۔ پھر دیکھنا اندر سے کیا ملائم جلد نکلتی ہے جیسے ناریل کا خول اتارا جائے تو......" نزہت نے قہقہہ لگایا۔

اس کا یہ بے باک انداز اعجاز شاہ کو سخت ناگوار گزرا۔

منزل آ پہنچی۔ یہاں سے آگے اکٹھے جانے میں خطرہ تھا دونوں اترے۔ راستہ جلدی ختم ہو جانے پر اعجاز شاہ کو قدرے افسوس سا ہوا۔ وقت نے کتنی بے دردی سے حسین پل چرا لیے تھے۔ کرایہ ادا کر کے جب وہ مٹھائی کا ڈبہ لیے تانگے کے پچھلے حصے کی طرف آئے تو نزہت جا چکی تھی۔

"کمینی۔" بے اختیار ان کے لبوں پر آ گیا۔ "مطلب نکل گیا تو بغیر دعا سلام کے چلی گئی۔" انہیں بہت غصہ آیا۔ "ہے نا پاؤں کی جوتی۔" وہ آگے بڑھ گئے۔ مگر جونہی چاروں گلیوں کے پھیر سے نکل کر آگے آئے تو آخری گلی عبور کرنے سے پہلے ہی وہ سامنے آ گئی ایک بار دونوں پھر آن ملے۔

"واہ شاہ جی۔" وہ اپنے اسی لہجے میں بولی۔ "مٹھائی اکیلے ہی اکیلے۔ صلح بھی نہیں ماری۔ لاؤ نکال میرا حصہ۔"

اچانک حملے سے اعجاز بوکھلا گئے۔ سفید ملائم ہاتھ برقعے کی سیاہ گھٹا سے چاند کی طرح نکل آیا۔

"محلے داری کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔" وہ لڈو کھاتے ہوئے بولی خدا جانے کب کس طرح اور کیوں کر مٹھائی کا ڈبہ کھلا اور لڈو ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل ہوا تھا۔ اعجاز شاہ کو کچھ خبر نہیں تھی۔

"دیکھو ملا جی۔ تو کپڑے ذرا ٹھیک ٹھاک پہنا کر۔" اعتراض اوپر کی منزل سے شروع ہو کر

قسطوں میں بتدریج نچلی منزل کی طرف آ رہا تھا۔ ''قمیص تو خیر لمبی ٹھیک ہے۔ بس شلوار ذرا ٹخنوں سے نیچے رکھا کر۔ لگتا ہے کہیں سے دریا پار کر کے آ رہا ہے! اور یہ تو چل کس طرح رہا ہے۔ ذرا مردوں کی طرح چھاتی نکال کر چلا کر۔''

''وہ جی......'' اعجاز کے پسینے چھوٹ گئے۔ ''کوئی دیکھ لے گا۔''

اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو احساس ہوا کہ اب نزہت اتنی بھی بھولی نہیں تھی۔ گلی کے ایک طرف لگے کھمبے کے نیچے جہاں کبھی بینو پنواڑی کی دکان تھی۔ وہاں وہ قدرے آڑ میں کھڑے تھے۔

''اوئے شیر بن شیر اعجاز شاہ۔'' اب کی بار اُنہوں نے غور سے نزہت کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے اعتماد سے کھڑی تھی۔ جیسے اگر اعجاز نے اسے چھو لیا تو خود ہی پارہ پارہ ہو جائے گا۔

پلک جھپکتے ہی وہ بڑی سڑک عبور کر کے اس طرف مڑ گئی جہاں سے اس کی حویلی اور ملا جی کے حجرے کا ذرا سا کونہ نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ پکڑے وہ وہیں کھڑے رہ گئے۔

''کی گل اے شاہ جی۔'' بدتمیز لہجے اور کرخت آواز پر وہ پلٹے تو محلے کا غنڈہ سکندر شاہ کھڑا تھا۔ ''تیرے وی پر پرزے نکل رہے ہیں۔ اوئے اس کُڑی سے کیا کہہ رہا تھا؟ محلے میں بدمعاشی نہیں چلے گی آخر......''

اعجاز شاہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''اوئے کُڑی نوں مٹھائی نال ہی ٹرخا رہیا ایں۔'' سکندر شاہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ اعجاز کو یوں لگا جیسے اس ''اوئے'' نے ان کی ذات کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہو۔ سکندر شاہ اس کی ناک کی سیدھ میں آ کر بولا۔ ''ویسے بڑا چنگا دانہ اے۔'' اس نے شہادت کی انگلی کے ساتھ انگوٹھا ملا کر داد دی۔

اعجاز شاہ ہونق بنے کھڑے رہے۔

''اوئے بک دی۔ اے چکر کی اے۔'' وہ ہاتھوں سے اشارہ کر کے بولا۔ ''جے کوئی چکر ہے تاں۔ تے فیر خالی خولی مٹھائی سے کام نہیں چلتا۔ اُستادوں نے کہیا اے کہ اِک صدی جتنی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ تب کہتے جا کر تے لونڈیا قابو اچ آتی ہے۔'' آخری فقرہ اس نے سرگوشی کی صورت میں ادا کیا۔

چھوٹے ملا جی کا بدن پسینہ بن کر ٹھنڈی سڑک پر بہنے لگا۔

''اچھا یار مٹھائی تے کھلا۔ اوئے کجھ بول وی!'' سکندر شاہ اُس کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ جھپٹ کر بولا۔ ''فوت ہی ہو گیا ایں۔''

''جی۔ جی۔'' گھبراہٹ میں اعجاز شاہ کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ سکندر شاہ نے ڈبہ کھول کر تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔

''اوئے اِک لڈو کس نوں دے آیا ایں۔'' ایں کو لمبا کر کے اس نے جان بوجھ کر کہا اور پھر ہنستا چلا گیا۔ اس کا بھاری بدن ہلنے لگا اور بڑی بڑی مونچھیں پھڑ پھڑانے لگیں۔

''اوئے''......وہ ایک آنکھ بند کر کے بولا ''کڑی نوں کھلا دتا ای تعویذ پا کے چل بھئی ملا جی تو بھی اپنا استاد ہی نکلا۔''

سکندر شاہ نے برفی کی ایک ڈلی نکال لی۔ ''میرا خیال ہے'' وہ ڈلی منہ میں رکھ کر بولا۔

''کڑی برفی پسند نہیں کردی کی خیال اے ملا جی؟''

''جی۔ جی۔ مجھے کچھ نہیں پتہ۔'' اعجاز شاہ اِس افتاد سے گھبرا گئے۔

''تینوں تے کجھ نہیں پتہ۔ پیو نے اس قابل ہی نہیں چھوڑیا۔'' وہ براہ راست بڑے ملا پر طنز کر رہا تھا۔

''ایسے مت کہو جی۔'' اعجاز شاہ کی نوجوان آواز میں ایک نابالغ بچے کی آواز بول رہی تھی۔

''اِس وچ فلسفے والی کیڑی گل اے۔'' سکندر شاہ نے کچھ شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے ڈبہ بند کر کے اسے واپس پکڑا دیا اعجاز شاہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہیں سکندر شاہ سے اس شرافت کی قطعی امید نہ تھی۔

''کڑی نوں برفی پسند نہیں ہوئے گی۔'' وہ منہ صاف کر کے بولا۔

''اوئے۔ او تے آپ برفی دی ڈلی اے۔ اوہنوں برفی کھان دی کی لوڑ اے۔''

اعجاز شاہ کا سر شرم سے جھک گیا۔ نزہت کا اِس انداز سے ذکر اسے بے حد ناگوار گزرا۔

''کی زنانیاں وانگر شرما رہیا ایں۔ سر اُتے چک اوئے۔''

اعجاز شاہ ہاتھ ملنے لگے۔

''جا کا کا گھر جا۔ ماں دی جھولی اچ بہہ۔ تینوں تے کجھ وی نہیں پتہ۔'' سکندر شاہ ہاتھ جھاڑ کر بولا۔

اعجاز شاہ نے خدا کا شکر ادا کر کے جانے کو قدم بڑھائے سکندر شاہ کے ہاتھ کا دباؤ ان کے

بازو پر پڑا اور ان کا دوسرا اُٹھتا قدم رک گیا۔

"جاتے کدھر ہو شاہ جی۔ مال نکالو۔"

"مال؟" وہ کانپ گئے۔ "مجھے جانے دو میرے پاس کچھ نہیں۔"

"کچھ کس طرح نئیں۔ جدوں پیو کولوں جوتیاں پے گیاں ناں سارا مال آپ ہی جیب اچوں باہر آ جائے گا۔ چل شرافت نال کڈ دے!"

"معاف کر دیں شاہ جی۔ آپ بھی سید ہیں۔" جان چھڑانے کے لیے اعجاز شاہ کو ذات کا سہارا لینا پڑا۔

"میں تیرے جیا سید نئیں۔ مذہب دا ٹھیکہ تے نئیں میرے کول۔ اوئے بندے بندے وچ فرق ہوندا اے ملا جی کج سمجھا کر۔ دنیا بہت اگے نکل گئی اے۔ تو اپنے حجرے سے نکل تو پتہ چلے۔" سکندر شاہ کسی طرح صلح پر آمادہ نہ تھا۔

"سن جے ہر مہینے مینوں غنڈہ ٹیکس نہ دتا ناں۔ تے ساری اسٹوری بمعہ ایکشن دے ملا جی نوں دس دیاں گا۔ سمجھ گیا ایں ناں!"

ہر چند کہ ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ غنڈہ ٹیکس کیا بلا ہے۔ کبھی اخبار دیکھا ہوتا تو پتہ چلتا۔ مگر انہوں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

"اباجی کو کس طرح پتہ چلے گا۔" بے خیالی میں اعجاز شاہ کے منہ سے نکل گیا۔ سکندر شاہ دھمکی دے کر جاتے جاتے پلٹ گیا۔

"مینوں تیرے تے ترس آندا اے اعجاز شاہ۔" وہ واپس آ گیا "دنیا اتنی جئی ہو گئی اے۔" اس نے مٹھی بند کر کے دکھائی۔ "اس ویلے ولایت اچ کی کج ہویا اے۔ شام توں پیلاں پتہ چل جائے گا۔ دن دی روشنی وچ عاشقی معشوقی کریں گا تے جگ ویکھے گا۔ اک جگہ دی خبر دوسری تھاں جاندیاں صرف ایک منٹ لگدا اے......" وہ مسکرایا اور تھوک کر بولا۔ "صرف ایک منٹ اوئے۔ میری گل جے پوری نہ کیتی ناں پیو کولوں جوتیاں پوادیاں گا چنگا فیر رب راکھا۔"

وہ انہیں ساری دنیا کو پالنے والے رب کے حوالے کر کے چلا گیا جو ہر قسم کے لوگوں کو حتیٰ کہ اپنے نافرمان بندوں کو بھی پالتا ہے۔ مگر کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں لیتا۔

اعجاز شاہ بُری حالت میں گھر کی طرف چلے۔ خوشی نے زندگی میں ذرا کم ہی لفٹ کرائی تھی اور اب جو دل کے بند دروازوں پر دستک ہونے لگی تھی تو سکندر جیسے لوگ رنگ میں بھنگ ڈالنے

آ گئے تھے۔

اعجاز شاہ کے قدم بے خودی کے عالم میں بھی انہیں گھر کی دہلیز تک لے آئے۔ عشرت بیگم کے بچے مٹھائی کا ڈبہ دیکھ کر "ماموں ماموں۔" کہتے دوڑے۔ انہوں نے بڑے لڑکے کو بے دلی سے ڈبہ پکڑانا چاہا مگر ملا جی نے پہلے ہی جھپٹ لیا۔

"اوئے مبارکاں۔ میرا بیٹا مٹھائی لایا ہے۔" وہ برآمدے کی طرف منہ کر کے بولے۔ گویا بیوی کو سنانے لگے ہوں۔ مگر انہوں نے اُس کا نام لے کر نہیں پکارا۔ شاید شرع میں اس کی اجازت نہیں تھی کھلا ڈبہ دیکھ کر انہیں شک ہوا۔ "راستے میں کس کو کھلا آیا ہے؟؟"

"اباجی! وہ سکندر شاہ مل گیا تھا۔ اس نے......"

محلے کے غنڈے کا نام سن کر ملا جی کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی بل پڑ گئے۔ "اُس کو دے آیا تو......اوئے مرد بن اعجاز۔ مرد۔"

ان کا دل چاہا وہ پوچھیں۔ "کس طرح بنوں اباجی۔ ذرا یہ بھی بتا دیں کبھی؟" مگر وہ خاموش رہے۔

ملا جی نے ڈبہ کھول کر تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ لڈو اور برفی جہاں سے اٹھائی گئی تھی۔ وہ جگہ خالی تھی۔ "واہ کیا بات ہے!" ملا جی بولے۔ "اصلی گھی کی لگتی ہے۔ ہے ناں؟"

"جی۔ اصلی ہے بالکل۔ ملاوٹ بالکل نہیں۔" اعجاز شاہ نے موقع پا کر کہا۔

"سکندر شاہ نے کیا کھایا؟"

"جی۔ ایک برفی کی ڈلی۔ اور ایک لڈو۔"

"کیا جوڑی منتخب کی ہے خبیث نے! ایک برفی اور ایک لڈو! بڑا دس نمبری ہے۔" ملا جی نے ڈبہ بند کر دیا اور اپنے شاطرانہ انداز میں بھویں تان کر بولے۔ "جھوٹ تو نہیں بول رہا تو؟"

"نہیں جی۔" ساری خوشی اس عورت کے چکر نے کرکری کر دی تھی۔ اعجاز شاہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔ "سچ ہی کہا ہے کسی نے سارے فساد کی جڑ ہے یہ صنف۔" اب نہ وہ انہیں ملتی۔ نہ یہ سارا ڈراما بنتا اور نہ ہی مٹھائی خرید کر گھر لانے کے جرم کی پاداش میں اتنی زبردست تفتیش ہوتی۔

"اوئے۔" ملا جی کی سرگوشی داڑھی کے بالوں سے سرسراتی ہوئی اعجاز شاہ کے وجود میں پیوست ہو گئی۔ "کسی لڑکی کو تو نہیں کھلا آیا!"

اتنا زبردست اندازہ لگانے پر وہ عش عش کر اُٹھے بے ساختہ ان کا دل ملا جی کے سابق

تجربے کی داد دینے کو چاہا۔ مگر وہ کھڑے صرف "نہیں نہیں" کی تکرار کرتے رہے۔

"اپنا اعتبار تو اس دن کے جھوٹ کے بعد ختم کر چکا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ سکندر شاہ سے چیک اپ کرلوں گا۔" وہ پرانے فوجی لہجے میں بولے۔

اعجاز شاہ کا دل خوف سے ڈوب گیا۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر اپنا ہاتھ جیب پر رکھ دیا۔

جیب پر ہاتھ رکھتے ہی انہیں تنخواہ میں ملنے والے کڑک نوٹوں کا لفافہ یاد آ گیا۔ باپ بیٹے کے دل میں یہ خیال ایک ساتھ آیا۔ اس بارے میں ملاجی کے چیدہ چیدہ سوالوں کے جواب دینے کے بعد صدری کی جیب سے نوٹوں کا وہ لفافہ مٹھائی کے ڈبے سمیت ملاجی کے تصرف میں چلا گیا۔ چھوٹے ملاجی تہی دست رہ گئے۔

دوسری صبح جب وہ اپنے ضروری کاغذات لینے جانے کے لیے نکلے تو سامنے تخت پر بیٹھے ناشتہ کرتے ہوئے ملاجی کو اچانک جیسے دن کی روشنی میں کوئی بے حد انوکھی چیز نظر آ گئی ہو۔

"اوئے۔ اعجاز۔ ادھر آ۔"

اعجاز شاہ ادب سے اُن کے حضور آن موجود ہوئے۔

"شیو بنایا ہے آج؟ خط درست کیے ہیں؟" طویل سوال ایک ہی قسط میں آیا۔

"جی۔" مختصر جواب بمشکل منہ سے نکل سکا۔

"وہ شیشہ مجھے پکڑا۔" انہوں نے طاق میں دھرے شیشے کی طرف اشارہ کیا۔

آئینے کا دستہ پکڑ کر انہوں نے ملاجی کے زانو کے بالکل قریب رکھ دیا۔

"ہوں۔ شکل دیکھی ہے اپنی؟"

"دیکھی ہے جی۔"

"درست ہے؟"

"بالکل درست ہے جی۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں جی۔"

"اُلو کی اولاد۔" وہ چلائے۔ "تو پھر یہ کیا ہے؟" انہوں نے شیشہ سامنے کر دیا۔

اعجاز شاہ کو اپنا اجنبی چہرہ جھانکتا نظر آیا۔ لمبی ستواں سفید ناک کو گھنی مثلث چھوڑ چکی تھی اور باریک مونچھوں کی ایک لکیر ناک کو انڈر لائن کیے ہوئے تھی۔ خط کہیں کہیں سے غائب تھے۔ صاف

لگتا تھا کہ داڑھی صاف کرنے کی لاشعوری طور پر کوشش کی گئی ہے لیکن ذہن کسی خوف کے تحت ہاتھ کا ساتھ نہ دے سکا۔ نتیجہ اب سامنے تھا کہ خط بنانے کی کوشش میں چہرہ بدخطی کا اعلیٰ نمونہ بن گیا تھا۔

"کیوں تو نے یہ کوشش کی تھی کہ......"

مگر انہوں نے زچ ہو کر فقرہ کاٹا۔ "یہ بات نہیں اباجی دانے نکل آئے تھے منہ پر۔"

"ہوں سب سمجھتا ہوں بچو۔" وہ ران پر ہاتھ مار کر بولے۔ "یہ جو رات ہی رات میں تیرے دانے نکل آئے ہیں تو اس کا سبب کیا ہے؟ اوئے اک عمر گزاری ہے میں نے۔"

"اباجی۔ وہ دراصل ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے....." اعجاز شاہ نے پڑھی لکھی دلیل پیش کرنی چاہی۔

"اوئے۔ اپنی پڑھی لکھی زبان میں نہ سمجھا مجھے۔ فطرت کے اس اصول کے مطابق ہم بھی جمے پلے ہیں۔ مگر ہمارے ہارمونز کبھی خراب نہ ہوئے۔ صاف کیوں نہیں کہتا کہ خیالات خراب ہو گئے ہیں تیرے ملکوں کی کڑی کو دیکھ کر۔" مولانا نے نفسیاتی نکتہ پکڑا۔

"میں نے اسے نہیں دیکھا" اعجاز شاہ نے صفائی پیش کی۔

"مکر نہ اب۔" مولانا نے اپنی مخصوص نظر نہ آنے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تو نے اسے دیکھا ہی ہوگا جبھی تو وہ مسکرائی۔ اب کیا تجھے الہام ہونے لگا تھا کہ اس وقت فلاں لڑکی مسکرا رہی ہے اور فلاں رو رہی ہے۔"

"اباجی۔" اعجاز شاہ بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑائے۔

"اباجی کے بچے۔ اپنے خیالات سیدھے رکھ تو ہاتھ بھی سیدھا پڑے گا۔ منہ پر ایسا جھاڑی کتا جنگل نظر نہیں آئے گا جیسا اب ہے! میں تیری آنکھوں کی بڑھتی روشنی نوٹ کر رہا ہوں کاکا......" تھوڑی دیر وہ سانس ٹھیک کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگے اور دوبارہ جب انہوں نے بات شروع کی تو ان کا لہجہ دھیما تھا۔

"اوئے۔ میں برما کے محاذ پر تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد کی بات ہے۔ تھکے ہوئے اعصاب کے مارے افسروں اور جوانوں کی بری حالت تھی۔ میری ڈیوٹی انگریز کپتان کے ساتھ چھاؤنی والے بنگلے پر لگی۔ کیا کیا حالات ہوتے تھے وہاں۔ مگر اپنا بھی تو ایمان تازہ تھا ان دنوں۔ انگریزوں کا اعلیٰ اخلاق ہی دیکھا تھا یاروں نے۔ ان کی حرام زدگیوں سے واقف نہیں تھے۔ وہ وہ

للکارے تھے کہ واہ' کم بخت دل جوان تھا لاکھ بار مچلا ہوگا۔ مگر اندر دل تھا اور باہر مذہب اس لف لائف میں بھی دل مذہب کے خوف سے قابو میں رہا۔ اس لیے کہ ایمان کی مضبوطی نے دل کو کبھی مذہب کے دائرے سے باہر ہی نہیں آنے دیا اور آج کل ......" وہ ہنسے۔ "صرف خیالات خراب ہوجانے پر لوگ دائرہ اسلام سے ہی خارج ہوجاتے ہیں۔ اوئے میں بھی تو نوجوان تھا مگر کبھی اس چیز کی ضرورت ہی محسوس نہ کی وہاں؟ کیا تھا اس جنگل میں؟ جب ہم جنگ کی آڑ میں سب کچھ کر سکتے تھے۔ ارے اب تو اس دنیا میں تیری توجہ بٹانے کو ایک ہزار چیزیں پڑی ہیں تیرے خیالات کس طرح بھٹک گئے؟"

"ان ہی چیزوں کی وجہ سے۔" انہوں نے جل کر دل میں کہا۔

تقریر ختم ہوئی۔ اعجاز شاہ کا دل چاہا وہ بھاگ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔

"دانے نکل آئے تھے تو آپ ہی آپ ختم بھی ہوجاتے اوئے۔" وہ گھٹنے پر ہاتھ لہرا کر بولے۔ "جوانی میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے وہ کیا کہا تھا تم نے ہارمونز۔ وہ چاہیں تو ہاریں یا پھر بدن کی جنگ جیتیں۔ ایسا ہوا ضرور ہے۔" ان کا لہجہ اب خاصا بے باک تھا۔ "کچھ کام کی باتیں سوچا کر۔"

"وہاں بھی تو آپ نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔" اعجاز شاہ کا دل بولا۔

"مگر ابا جی۔" ان کے بے باک لہجے میں بولے گئے مکالمات کا مطلب سمجھ کر انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا سوال کیا۔ "وہ برما کے محاذ پر نرس والا قصہ کیا تھا جو آپ اس روز چاچا فتح محمد کو سنا رہے تھے؟"

سوال بم کی طرح دماغ پر آن گرا۔ جگری یار فتح محمد کے ساتھ یادیں تازہ کرتے کرتے وہ شاید اس مقام پر آ گئے تھے جہاں کسی لمحے ان کی بے خودی سے فائدہ اٹھا کر اعجاز شاہ نے کچھ سن لیا تھا اپنے وقت کے وہ بھی مداری رہ چکے تھے صرف گزرے وقت کو انہوں نے مذہب کی چادر سے اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ تہہ کھلنے پر بھی کچھ نظر نہ آتا۔ وہ ذرا سا بدکے، سنبھلے اور مسکرا کر اعجاز کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"وہ تو میں سیدھا سادا بیاہ کرنے لگا تھا۔ شرع کے عین مطابق۔ بے چاری زمانے بھر کی دکھی اور ستائی ہوئی تھی۔ خدا زنی میں میرے گلے آن پڑی۔ میں نے اسے مسلمان کرلیا وہاں کوئی مولوی تو تھا نہیں کہ نکاح پڑھاتا۔ چھاؤنی سے امام مسجد کو بلایا مگر ان کے آنے سے پہلے ہی کمپنی

کمانڈر کو پتہ چل گیا وہ سالا ایک دم خرانٹ انگریز تھا۔ اسی کے بنگلے سے تو وہ مجھے ملی تھی شریف عورت تھی۔ اس رات اس کے اردلی کی زیادتی سے گھبرا گئی اور شور مچا دیا۔ میں نے جا کر اس کی منت کی کہ اسے چھوڑ دے مگر وہ جل کر کہنے لگا، تیری خالہ تو نہیں لگتی ناں، بس پھر کیا تھا۔ ادھر والے بھی چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی خاصی مرمت کر ڈالی وہ تھا صاحب کا منہ چڑھا۔ اس کے ساتھ ہر بات میں شریک رہتا تھا۔ جا کر اس نے صاحب سے ایک کی بجائے دس لگا کر سنائیں صاحب نے مجھے کوارٹر گارڈ دلا دی۔ قید کے بعد وہ مجھے دوبارہ ملی میں نے انسانیت کا فرض جان کر اسے مسلمان کرلیا مگر وہ عین وقت پر امام صاحب کی بجائے جا کر کرنل صاحب کو لے آیا۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر راجہ عدالت خان کو جو گکھڑ ذات کا اونچا راجہ تھا، جب پتہ چلا کہ میں بال بچے دار آدمی ہوں تو مجھے تو دیا بائیس روز کا پٹھو، رمضان کا مہینہ تھا اور ساتھ میں کر دیا ایک مسلمان اردلی۔ کہ اگر میں کوئی روزہ چھوڑوں تو برابر سزا ملے گی۔ بائیس دن یاروں نے دھوپ میں گزارے۔ سخت محنت کی اس سالی عورت کے پیچھے۔ تب سے مجھے اس حقیقت کا پتہ چلا کہ اس ذات کے پیچھے چلنے کی بجائے اسے اپنے آگے چلاؤ۔"

"اور ابا وہ نرس؟" اعجاز شاہ نے یاد دلا۔

"اوئے......!" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ "ان ہی دنوں جب میں قید میں تھا اس نے شادی کر لی اور پھر کہیں نظر نہ آئی۔ جب قید سے باہر آیا تو کرنل راجہ عدالت خان نے میری جلی رنگت اور لاغر بدن پر ایک نگاہ ڈالی۔ واہ کیا شان دار شخصیت کا مالک تھا وہ خود اونچا لمبا قد، سفید بھرا ہوا چہرہ، وردی میں شیر نظر آتا تھا۔ گھوڑے پر سوار جب وہ بیرکوں میں چکر لگاتا تو مانو سانپ سونگھ جاتا! خیر اب تو وہ بات ہی نہیں رہی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ویل ڈن باقر علی! کہ دانہ خاک میں مل کر گل دگلزار ہوتا ہے، پھر جب تک میں ریٹائر نہیں ہوگیا۔ میرا خیال رکھا۔ اللہ اسے زندہ سلامت رکھے۔ آمین۔"

ملا جی کی دعا ختم ہونے پر اعجاز شاہ کی بس کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ آج کی داستان تھی بھی مزے دار۔ وہ حجرے کی طرف جانے لگے۔ آج تو اس داستان میں بوریت کا قطعی کوئی پہلو نہیں تھا۔ طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی تھی۔ وہ جانے لگے تو ملا جی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اوئے۔ اپنے خیالات سیدھے رکھ کا کا! ہاتھ بھی سیدھا ہی چلے گا۔"

"جی اچھا ابا جی۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

گلی میں زندگی رواں دواں تھی۔ ٹھیلے والے سبزیوں پر پیٹ کے دوزخ کا سامان بیچتے پھر رہے تھے۔

"ہر چیز بکاؤ ہے۔" اعجاز شاہ نے خیالات سیدھے رکھنے کی کوشش میں سوچنا شروع کیا۔ "پیٹ کا دوزخ، دل کی جنت سب ہی کچھ بک جاتا ہے۔" لیکن اچانک ان کے خیالات کو بریک لگ گئی۔ رفیق ٹال والے کی دکان کے پیچھے سے سکندر شاہ کا طویل سراپا اپنے سنگ بھاری ہلتے جلتے بدن کا نمونہ لے کر پیش ہوا اور دم بھر میں سامنے آن رکا۔

"اوئے شاہ جی۔" اس نے پکارا۔ اعجاز شاہ کا خوش گوار موڈ پل بھر میں غائب ہوگیا۔ اعجاز کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اس کا قہقہہ فضا میں اچھل کر سیدھا اعجاز شاہ کے کانوں میں آن گرا۔

"اوئے۔ اے کی حال بنا لیا ای۔ میاں مجنوں۔" سکندر شاہ نے بے تکلفی سے ان کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ جی دانے نکل آئے تھے!"

"ہیں" سکندر شاہ نے حیرانی کے انداز میں اداکاری سے کہا۔

"اوئے مبارکاں شاہ جی۔ فیر تے تسی جوان ہوگئے! چلو اسی خوشی وچ میں بھنگڑا پادیاں۔ تے فیر اے لو۔"

وہ زمین پر گری لکڑیوں کے درمیان بے ڈھنے پن سے ناچنے لگا۔ لکڑیاں اس کے پاؤں کی جنبش سے اچھل اچھل کر اعجاز شاہ کے اردگرد بکھرنے لگیں۔ ٹال پر کام کرنے والے تماشہ دیکھنے لگے اور تالیاں بجا بجا کر "اوئے۔ اوئے" کرنے لگے۔

اعجاز شاہ کو محسوس ہوا جیسے وہ سب اس پر اوئے۔ اوئے کر رہے ہوں۔ وہ گھبرا کر مڑے مگر سکندر نے ان کا بازو پکڑ لیا۔

"کتھے چلے او شاہ جی۔ لیکس نی جے دینا؟"

اعجاز شاہ اس سوالی پر گھبرا گئے۔ جھوٹ خود بخود زبان پر آ گیا۔

"میں آ تو رہا تھا مگر......"

"اگر مگر کی یار۔ سیدھا کہہ کہ ملاجی نے منع کر دتا سی؟" وہ ان کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "سچ کہہ ریاں اے ناں؟"

"ہاں۔ ہاں۔" اعجاز شاہ نے دوبارہ بات شروع کی۔ "مگر وہ کہہ رہے تھے کہ تو سکندر شاہ

سے نہ ملا کر۔"

"کی کہیا ای۔" وہ ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اوئے ملاجی میں ایسا بندہ نہیں کہ اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔" وہ اب اعجاز شاہ کو سمجھانے کے لیے اردو بولنے لگا تاکہ اپنا مفہوم بہتر طور پر ادا کر سکے۔ "بتا دینا ملاجی کو۔ مجھے پتہ نہیں ہے کہ اس کا مذہب کیا بتاتا ہے مگر سکندر شاہ۔ دہری شخصیت نہیں ہے۔ اوئے بدمعاش ہے تو صرف بدمعاشی کا دعویٰ کرتا ہے۔ بدمعاشی کر کے خود کو شرافت کے خول میں نہیں سجاتا۔ سکندر شاہ رات کو جرم کر کے وہ صبح کو ملا' مفتی، افسر، ماسٹر، ڈاکٹر بن کر نہیں نکلتا۔ دنیا اسے صرف سکندر شاہ کے نام سے جانتی ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں جرم کر کے صبح کی روشنی میں سیٹھ صاحب نہیں بن جاتا سکندر شاہ کیا ہے یہ ملا اور اس کا مذہب نہیں جان سکتے وہ صرف ایک انسان ہے غنڈہ انسان۔ سمجھے! میں اس کا خطبہ نہیں سنتا کہ جان سکوں وہ اور اس کا مذہب کیا چاہتے ہیں۔ مگر میں کسی کی غیبت نہیں کرتا، ڈاکا نہیں ڈالتا، غریبوں کا خون نہیں چوستا مگر میں اس کی نظر میں دائرہ اسلام سے باہر ہوں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔ ایک گہری غصے بھری نظر اعجاز شاہ کے چہرے پر ڈالی۔ اور دکھی آواز میں بولا۔ "اس نے تمہیں مجھ سے ملنے سے منع کیا ہے۔ یار بڑا افسوس ہے۔ میں تو تجھے ستا رہا تھا۔ ابے اگر تجھ سے مال لینا ہوتا تو اسی دن لے لیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ تیری جیب میں نوٹ بھی ہیں۔ میں تو ذرا مذاق کر رہا تھا مگر ہمیں تو کسی سے مذاق کرنے کا بھی حق نہیں۔ ہم سے سارے حق چھین جو لیے گئے ہیں اور انسان سے جب اس کے حقوق چھین لیے جائیں تو وہ ان کی شرافت سے واپسی کا امکان نہ دیکھ کر ان کو حاصل کرنے کے لیے غنڈہ بن جاتا ہے۔ تو جا یار۔ تو پڑھا لکھا ایک ان پڑھ کا فلسفہ کیا سمجھے گا!!"

پانی کے دو نمکین قطرے سکندر شاہ کے گالوں پر اتر آئے! بے ساختہ اعجاز شاہ کا ہاتھ آگے بڑھا اور سکندر شاہ کے چہرے پر ٹک گیا۔

"اوئے۔ جازی۔" سکندر شاہ نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"جازی۔" کیسا خوبصورت نام تھا۔ اس سے پیار کرنے والوں نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔ آن واحد میں دوستی کا مرحلہ طے ہوگیا۔ گیارہ بج چکے تھے وہ دونوں چلتے ہوئے "خوف خدا" ہوٹل میں آ بیٹھے۔ زندگی میں اعجاز شاہ پہلی بار ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ وہ بار بار چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ سکندر شاہ ان کی کیفیت بھانپ گیا۔ ان کا ہاتھ دبا کر بولا "آرام نال بہہ یار۔ کوئی پھڈا ہوگیا تے اسی آپے سنبھال لاں گے۔"

"وہ ابا۔" وہ ڈرتی آواز میں بولے۔

"چھڈ یار۔ اک تے ابا ہر ویلے تیرے نال چپک جاندا اے۔" سکندر شاہ کسی قدر ناگواری سے بولا۔ "مینوں بڑا ترس آندا اے جازی۔ یار کسی طراں تو اس خول وچوں نکل نئیں سکدا۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہمدرد کو سارے حالات بتا سکتے۔ سکندر شاہ کی کیفیت بدل گئی۔ سر پر ٹوپی درست کر کے وہ مؤدب بیٹھ گیا۔ اعجاز شاہ نے قدرے حیرانی سے دیکھا ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر دھرے ہوئے ریڈیو سے نعت خواں کی پرسوز آواز ابھری۔

جسے چاہا در پہ بلا لیا جسے چاہا اپنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے
وہ خدا نہیں بخدا نہیں وہ خدا سے پھر بھی جدا نہیں
وہ ہے کیا مگر وہ کیا نہیں یہ محب حبیبؐ کی بات ہے

سکندر شاہ کو مؤدب بیٹھا دیکھ کر انہیں یوں لگا جیسے وہ کوئی پہنچا ہوا انسانیت کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھا مقدر کا ولی ہے۔ تب انہیں اچانک وہ شام یاد آ گئی جب ملکوں کی حویلی سے نکلتی موسیقی کی لہروں نے اسی طرح ان کے وجود کا احاطہ کرلیا تھا اور وہ بے خود ہو گئے تھے۔ آج ویسی کیفیت سکندر شاہ کی تھی۔

کتنا زبردست تضاد تھا معاشرے کے ان دونوں کرداروں میں۔ نعت ختم ہوگئی۔ سکندر شاہ سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے بولا:

"نعت سنی جازی! کنی سوہنی گائی اے۔" شاید اسے گانے اور نعت پڑھنے کا فرق معلوم نہیں تھا۔ "یار ایمان تازہ ہوگیا اے اپنا تے۔" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

ایمان؟ ایک غنڈے، چھٹے ہوئے بدمعاش اور ذلالت کی حد سے بھی نیچے گرے ہوئے انسان میں ایمان؟ اعجاز شاہ حیران رہ گئے۔ حیرانی میں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں انہیں پار والے کھوکھے کے پاس کھڑے ملاجی کی تیز غضب ناک نگاہیں بھی نظر نہ آسکیں۔ وہ بھی کہیں جاتے ہوئے نعت سننے وہاں کھڑے ہوگئے تھے۔ گھر میں تو سرے سے ریڈیو تھا ہی نہیں کہ موسیقی سراسر حرام ہے۔ رہیں خبریں؟ تو وہ ریڈیو پر سنائے جانے سے پہلے ہی افواہوں کی صورت میں گردش کرتی ہوئی یہاں کے محلے تک پہنچ جاتی تھیں بے شمار لوگوں کا شغل یہی تھا جو سارا دن بیکار رہتے تھے اور شام کو تازہ اور گرما گرم خبروں کے ساتھ واپس آتے تھے۔

سکندر شاہ بل دینے چلا گیا۔ خلاف توقع شرافت سے بل دے کے پلٹا۔ ہوٹل والے نے حیران ہوکر اسے دیکھا اور پھر اعجاز پر نظر پڑتے ہی سب کچھ سمجھ کر مسکرا دیا۔

"چل یار جازی۔ فیر ملاں گے۔" وہ باہر آنے کے لیے نکلنے لگے۔ سلام دعا کا اور پھر ملنے کے لیے وقت اور جگہ کے تعین کا مرحلہ طے ہونا باقی تھا کہ سکندر شاہ مصروف آدمی تھا۔ اکثر شہر کے مختلف علاقوں کے دورے پر نکل جاتا تھا۔

حالات سازگار تھے۔ فضا خاموش اور مطمئن تھی مگر اب اس میں اداسی کا رنگ نمایاں ہونے والا تھا۔ ملاجی اپنی چھڑی لیے آہستہ آہستہ چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔

"اوئے......اعجاز۔"

اعجاز گھبرا کر زمین میں گڑ جانے کو تھے مگر سکندر شاہ اعتماد سے کھڑا رہا۔

"کیا کررہا ہے تو یہاں؟"

"ابا جی۔ میں نعت سن رہا تھا اس کے ساتھ!" انہوں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنا مفہوم واضح کرنا چاہا۔

"اس کے ساتھ؟" ملاجی نے طنز سے چھڑی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ......؟ ارے یہ کیا سمجھے گا نعت کو؟ یہ کہہ کہ تجھے بھی اپنے ساتھ بدمعاشی پر اکسانے اور خراب کرنے لگا ہے۔"

سکندر شاہ کے کانوں میں نعت کے الفاظ گونجے

وہ خدا نہیں بخدا نہیں وہ خدا سے پھر بھی جدا نہیں

اُس کا دل چاہا۔ وہ پکار کر کہے۔ "خدا سے تو کبھی کوئی انسان جدا ہی نہیں ہوتا۔ مگر تم جیسے لوگ اسے دور کردیتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے کی سنی گئی نعت کا تاثر تمہارے دل سے ختم ہوگیا ہے۔ مگر میرے دل میں ابھی تک موجود ہے اس لیے کہ اس میں صرف خدا کا خوف ہے!"

مگر وہ خاموش رہا۔ ملاجی نے اعجاز کو کھینچ کر لے جانا چاہا لیکن ان کا ایک قدم سکندر شاہ کی طرف جانے کی ضد میں اور دوسرا ملاجی کے ہاتھ کی گرفت کی سیدھ میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔ چھڑی کے ایک بھرپور وار کے ساتھ دو قدم آپس میں مل کر جم گئے اور اعجاز شاہ سیدھا چلنے کی کوشش میں سکندر شاہ کی طرف جھک گئے۔

ملاجی نے سکندر شاہ کو بے نقط سنانی شروع کردیں۔

"ہوش اچ آؤ۔ بزرگو۔ کی ہوگیا جے۔" وہ ادب سے بولا۔

"بدمعاش میرے بیٹے کو خراب کرنے چلا ہے۔" دوسرا وار سکندر شاہ کی پیٹھ پر پڑا۔ پھر تیسرا یہاں تک کہ چھڑی شڑاپ شڑاپ کی آواز کے ساتھ اس کے جسم پر برسنے لگی۔ لوگوں نے دیکھا کہ محلے کا مانا ہوا غنڈہ سکندر شاہ خاموش کھڑا مولانا باقر علی شاہ کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔ یہ وہ انسان تھا جس کی طرف کبھی کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ خاموش مطمئن انداز میں مذہب کے نام پر چھڑی سے پٹ رہا تھا لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سب سکندر شاہ کی برائیاں اور ملاجی کی نیکیوں کا ذکر کر رہے تھے۔

"چل، اوئے چل دفع ہو جا ایتھوں۔" محلے کے کرتا دھرتا چودھری نے ساری بات سمجھ کر سکندر شاہ کو دھکا دیا وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

"اور تو......!" ملاجی جو اب تک ہانپ ہانپ کر کانپنے لگے تھے، اعجاز کی طرف بڑھے۔ "اب اگر تجھے میں نے اس کے ساتھ دیکھا تو جان لینے سے کم کوئی کام نہیں کروں گا۔" وہ اعجاز کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگے۔

"ملاجی۔" محلے کا ایک کھلنڈر نوجوان بولا۔ "غنڈوں سے اس کی دوستی تو ہو ہی گئی ہے۔ اب ذرا اس سے یہ بھی پوچھیں کہ اس کا نام بدل کر "جازی" کس نے کر دیا ہے؟"

"سکندر شاہ نے۔" اعجاز شاہ کے منہ سے مری مری آواز نکلی۔

"لو۔" وہ ہنس پڑا۔ "بھئی کیا بات ہے سائنس کی ترقی کی۔ پلک جھپکتے ہی جنس بدل گئی۔ اب دیکھو نا کل تک ملکوں کی لڑکی "جازی" کہنے والی نزہت آج سکندر شاہ بن گیا۔ واہ کیا بات ہے جی۔" وہ تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگا۔

"کمال ہے یار۔" دوسرا بولا۔ "وہ کڑی اس کے ساتھ کس طرح پھنس گئی؟"

"استاد ہے یہ بھی...... ایسے ہی مت سمجھو۔"

بھرے مجمعے کے سامنے باپ بیٹا تماشا بن گئے۔

وہ گھر کس طرح پہنچے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ البتہ دکھتے جوڑوں نے جب بدن کو ہلانے کی اجازت نہ دی تو وہ ہوش میں آ گئے۔ رات کا یہ دوسرا پہر تھا۔ ماں کے آنسو ان کے چہرے پر گرے تو انہیں صبح والی واردات میں سکندر شاہ کے وہ آنسو یاد آ گئے جسے صرف وہ دیکھ سکے تھے جو، آنکھوں میں آنے کو بے تاب تھے مگر انہیں نفس کی خودداری باہر آنے کی قطعی طور پر اجازت نہیں دیتی تھی ماں کے بند ہونٹ اسے سکندر شاہ کی طرح لگے کہ جن کے کھل جانے میں کئی پردہ نشینوں کا

نام آتا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو دیے۔ ان کا کوئی نہیں تھا۔ وہ تنہا تھے بالکل تنہا۔

ان کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہوا کے جھونکے کی مانند نکل گئی تھی۔

ان کی دنیا میں آنے والا پہلا دوست سماج کو پسند نہیں تھا۔ سید اعجاز حسین شاہ تنہا رہ گئے۔

گھر سے نکلنے پر مکمل پابندی۔ گھر سے حجرے اور مسجد سے گھر تک ہر قسم کی نگرانی جاری رکھی گئی۔ پھر چند ہی دنوں بعد مولوی باقر نے ٹھکانہ بدل دیا۔ محبوب کے کوچے سے دور دوست کی گلی سے طویل فاصلے پر، سید باقر علی شاہ نے ایک اور مسجد کے زیر سایہ اپنے خاندان کو لا بسایا۔ برسوں کا بنا بنایا گھر، محلہ، قرابت داریاں سب ہی کچھ دور رہ گیا۔ ملاجی نے بیٹے کی شخصیت کے لیے عورت کا وجود ایک چبھتے ہوئے طعنے کی صورت استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ ذرا خیالوں میں گم ہوتے تو فوراً آواز آتی۔ "اوئے اعجاز سنتا کیوں نہیں۔ کس زنانی کے بارے میں سوچ رہا ہے؟"

"ارے تیرے اعصاب پر تو عورت سوار ہے۔ اب تو ریسرچ کیا خاک کرے گا۔"

بیوی جی کو مخاطب کر کے کہتے۔ "خوش ہو جا نیک بخت پتر زنانیوں پر ریسرچ کرنے چلا ہے۔"

اعجاز شاہ کا خون ابل ابل کر باہر آنے لگتا! مگر زبان پر لگائے گئے تالے بہت مضبوط تھے۔

اعجاز شاہ کی زندگی بالکل محدود ہو کر مٹھی میں بند ہو گئی۔ ریسرچ کا کام تیز ہو گیا۔ کلاس میں اسٹوڈنٹس کی دبی دبی ہنسی اور کبھی کبھار کوئی اچھلتا فقرہ، لڑکیوں کی "سر" پر سرگوشیاں۔

اعجاز شاہ سب سے بے نیاز ہو گئے۔ مذہب نے ان کی ذات کا احاطہ کر لیا۔ مگر اس احاطے کے باہر بھی سید باقر علی شاہ کی ذات منڈلاتی رہی۔ وہ جب قرآنی آیات میں عورتوں کے متعلق پڑھتے "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس۔" تو ان کا ذہن بری طرح الجھ جاتا۔ "قرآن نے تو عورت کو لباس قرار دیا ہے۔ پھر معاشرے میں وہ جوتی کس طرح بن گئی؟ کس نے دیا ہے عورت کو یہ نام؟ کتنا تضاد ہے ان لوگوں میں۔ عورت کو پہلے پاؤں کی جوتی بناتے ہیں اور پھر اس کے قدموں تلے جنت تلاش کرتے ہیں۔ واہ رے زمانے۔" اعجاز شاہ کا دل ہنستا۔ انہی دنوں شدید مصروفیت کی بنا پر انہیں ہوسٹل میں آنا پڑا۔ گھر سے جامعہ کا فاصلہ اتنا تھا کہ آنے جانے میں پانچ گھنٹے لگ جاتے تھے۔ مجبور ہو کر ملاجی کو اجازت دینی پڑی۔ عشرت بیگم بھی اہل محلہ کی مہربانی سے صلح صفائی کروا کر بخیر و خوبی واپس چلی گئی تھیں۔ ملاجی عصر کی نماز پڑھ کر کبھی کبھی اعجاز کی خیریت پوچھنے جامعہ آ جاتے۔ یہاں وہ شام کی نماز کی امامت کرتے اور عشا سے پہلے واپس چلے جاتے۔

بیوی جی خالی گھر کی دیواروں کو گھورتی رہتیں! انہیں لگتا شوہر زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں اور بچے ایک ایک کر کے اپنی جنت میں گم ہو گئے۔ رہ گیا ان کا لاڈلا "جازی" تو اسے مذہب کی زنجیروں نے جکڑ لیا تھا اور وہ ماں کے "جازی" سے اب ڈاکٹر سید اعجاز حسین شاہ بننے چلا تھا۔

ساون بھادوں کی ملہار گانے والی رُت تھی۔ ملا جی، اعجاز سے ملنے ہوسٹل گئے۔ شام کی نماز کے بعد جب انہیں اعجاز بس شاپ تک چھوڑنے آ رہا تھا۔ بس اسٹاپ کے سامنے بنے فلیٹ کی بالکونی میں تین چار لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

"اوئے جازی۔" ایک آواز آئی۔ یہ سکندر شاہ تھا۔ اس نے دیکھا دُور سے آتے ہوئے اعجاز اور ملا جی اس طرح لگ رہے تھے گویا چور سپاہی ایک ساتھ چل رہے ہوں۔

"ستیاناس اس ملاں دا۔ ایسے سوہنے منڈے نوں تباہ برباد کر کے رکھ دیتا اے۔" وہ تاش پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے۔ فیر وی......"

"بازی تے نا یار۔" دوسرا بولا۔ سکندر شاہ چلنے کے لیے آگے بڑھا۔

"اچھا جا فیر تُم پہلے اُونوں۔" وہ جل کر بولا۔ سب نے پتے پھینک کر برابر کر دیے۔

سکندر شاہ گراؤنڈ فلور سے نکل کر سامنے آ گیا اس سے پہلے کہ وہ انہیں پکار سکتا۔ ملا جی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اعجاز کو انہوں نے اپنے پیچھے کر لیا۔ جیسے اسے کسی غلاظت سے بچانا چاہتے ہوں۔

"سلام بزرگو۔" سکندر شاہ ادب سے بولا۔

"اوئے تو کیا کر رہا ہے یہاں؟" ملا جی غصے سے بولے۔

"ڈیرا ہے جی اپنا ادھر۔" وہ تمیز سے بولا۔ "آپ کو دیکھا تو سلام کرنے چلا آیا۔ کی حال اے جازی؟"

ملا جی کا غصہ آسمان پر پہنچ گیا۔ بیٹے کو وہ دنیا سے جس قدر بچانا چاہتے تھے، دنیا اسی قدر عریاں ہو ہو کر سامنے آ رہی تھی۔

"چل دفع ہو، نامراد راستہ چھوڑ۔" ملا جی نے غصے سے چھڑی اٹھائی۔

"ذرا ٹھنڈے ہو کے جی۔ بزرگو تمیز نال گل کرو۔ میں اس دن بھی جازی کی دوستی میں خاموش رہا باتیں تو مجھے بھی کرنی آتی ہیں۔"

"جازی کی دوستی میں۔" مولانا پر بم پھٹ پڑا۔

"اوئے بدمعاش۔ تو کیا دوستی کرے گا اس سے جسے دنیا کا ابھی پتہ ہی نہیں۔ کمینے ذلیل۔"

"بس بس۔" سکندر شاہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مجھ سے میری ذہنی قابلیت کے مطابق بات کریں۔ میں پڑھا لکھا انسان ہوں مگر جاننا چاہو گے کہ غنڈہ کیوں بنا؟ اس میں بھی آپ جیسے لوگوں کا کرم شامل حال ہے۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دور ہو جا ذلیل تیری تو......" گالی ملا جی کے منہ پر آتے آتے رہ گئی۔ گالی کا مفہوم ادا کرنے سے پہلے ہی پوری طرح سکندر شاہ کے ذہن میں اتر گیا۔

"بنو نہ بزرگو، کھول دیاں جے پول۔ خیر جان دیو۔" وہ آگے بڑھا اور ایسی سرگوشی میں بولا جسے اعجاز نہ سن سکے۔ وہ لاکھ غنڈہ سہی مگر بیٹے کے سامنے باپ کی بلند و بالا شخصیت کا تعمیر کردہ بُرج گرانا نہیں چاہتا تھا "یاد جے او حجرے والی شام؟"

ملا جی گھبرا کے پیچھے ہٹ گئے۔ ان کی چھڑی سکندر کے قدموں میں گر پڑی۔

"جب آپ نے مجھے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ نزہت کو کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ یاد ہے وہ بڑے ملک صاحب کی گوری چٹی کڑی نزہت جسے آپ قرآن پڑھاتے تھے مگر میرے بروقت آ جانے کی وجہ سے کوئی دوسری پٹی پڑھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جانتے ہیں نزہت کو کون سا زہریلا کیڑا کاٹنے والا تھا۔ وہ۔ وہ آپ تھے ملا جی آپ۔" سکندر شاہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ "انسان ہو کر فرشتہ بننے کا دعویٰ نہ کریں جناب یہ بڑا مشکل کام ہے۔ آپ کی دنیا میں جنس کے پردے کا نام شرافت ہے اور میری دنیا میں روح کی نرمی، زبان کی مٹھاس اور مظلوم کی حمایت کا نام شرافت ہے۔ سمجھ گئے او۔ جاؤ تہاڈی نماز نہ قضاء ہو جائے۔" سکندر شاہ نے ایک دکھی نظر جازی پر ڈالی اس کے اور جازی کے بیچ میں ملا جی ایک بلند بُرج کی طرح کھڑے تھے اور سکندر شاہ جیسا غنڈہ اس بلند و بالا بُرج کی دوسری جانب کھڑے جازی تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

تینوں اپنی اپنی راہ پر ہو لیے۔ ان کی منزلیں الگ اور راستے جدا تھے کبھی نہ ملنے والے طویل اور پُر خار۔

پرانے محلے میں آج کسی کا انتقال ہو گیا تھا بیوی جی کو بھی ضرور جانا تھا۔ ملا جی تبلیغی جلسے کے سلسلے میں رائے ونڈ گئے ہوئے تھے۔ اعجاز ویک اینڈ پر ہاسٹل سے گھر آیا ہوا تھا انہیں بیوی جی کے ساتھ جانا پڑا۔ عورت کی وجہ سے بھرے مجمعے میں جس طرح ملا جی کے ہاتھوں سکندر شاہ کے ساتھ ہی وہ بھی پٹ گئے تھے سب نے دیکھا تھا عورت کا خیال انہیں اور سکندر شاہ کو ایک اسٹیج پر کھڑا کر

گیا تھا اور ایک غنڈے کے ساتھ چھوٹے ملا جی بھی تماشا بن گئے تھے لوگوں کی۔ "اوئے اوئے" تو کئی دنوں تک ان کے کانوں میں گونجتی رہی۔

آج جب اماں کے ساتھ انہیں وہاں جانا پڑا تو دل میں لطیف جذبات کی بجائے نفرت کا احساس ابھر آیا۔ گلی میں زندگی اجاگر تھی ملکوں کی حویلی میں شادی کی تقریب کا سماں تھا۔ لالے کے دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ آج شاید کوئی لوک فنکار آیا تھا جو اپنی مخصوص رقت انگیز آواز میں دل کا درد الاپ رہا تھا۔

اعجاز شاہ کے قدم رک گئے۔ بیوی جی بے خبری میں آگے بڑھ گئیں پنجابی ٹپے کے ساتھ ہارمونیم کی لہریں رستے زخم کی طرح چھوٹے ملا جی کے دل میں اتر گئیں۔

چھلا میڈا جی ڈھولا کوئی تاگے دے وٹ چھوڑو

منہ واں پاویں نہ بولو اکھیں نال تاں دس چھوڑو

تقریب شاید زوردار طریقے سے شروع ہوئی تھی ہنگامہ اور شور شرابا اتنا تھا کہ اس پار کسی کا دھیان ہی نہیں تھا جہاں سے اس وقت ایک جنازہ اٹھنے والا تھا۔ ہمیشہ سے آکاش سے اتر کر دھرتی پر بیٹھی زندگی واپس آکاش کی طرف اٹھنے والوں کو نہیں دیکھا کرتی۔ اس کی نگاہیں صرف دھرتی پر ہونے والے ہنگاموں پر ہی رہتی ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے تو اسے آکاش کے کسی کونے سے مسکراتی اپنی موت بھی نظر آ سکتی ہے جسے وہ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی زندگی جو دلفریب اور حسین ہے، بھیانک چیزیں دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔

بیوی جی گلی پار کر کے سامنے والے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئیں۔

"باؤ جی۔" ایک نوعمر لڑکا قریب چلا آیا۔

"باجی آپ کو بلا رہی ہے۔" اعجاز نے اس طرح اوپر دیکھا جیسے جان نکل جانے کے بعد مردہ کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا رہتا ہے!

مگر وہاں کھڑکی میں زندگی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"نزہت۔" اعجاز کی زبان نے کہا۔

"نزی۔ نزی۔" دل نے پکارا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔" دماغ نے کہا۔ "ہرگز مت جانا اعجاز شاہ۔"

کھڑکی میں سفید ملائم ہاتھ لہرایا اور دوسرے ہی لمحے دھپ دھپ کرتے اس کے قدم

سیڑھیاں چڑھ گئے جسم کا ہر عضو الگ الگ اپنی اپنی مرضی کے مطابق کام کر رہا تھا۔

اوپر سامنے ہی نزہت کھڑی تھی۔ یہ حصہ اس وقت تقریباً ویران تھا سب لوگ تقریب میں شریک تھے جو نچلی منزل میں ہو رہی تھی!

نزہت نے اشارہ کیا اور ایک اشارے پر اعجاز اپنا ایمان، اپنا ضبط باہر ہی چھوڑ کر صرف دل لیے اندر چلے آئے۔

یہ نزہت کا آشیاں تھا جہاں وہ ایک عقاب کی بجائے بھیگی بلی بن کر بیٹھے تھے آشیاں کا ہر تنکا ان کی شرافت کی تعریف کر رہا تھا۔

"کیوں بلایا ہے مجھے۔" اعجاز شاہ کی قدرے بھاری آواز گونجی۔

"اُدئے جازی۔" وہ قریب آ گئی۔ "میں نے سنا تھا کہ سکندر شاہ نے تجھے ابا سے پٹوایا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا ضرور تو نے کوئی گڑبڑ کی ہو گی۔"

اعجاز شاہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ کس شان سے الزام تراشی کر رہی تھی۔

"بتا نا کیا گڑبڑ کی تھی؟ پھر میں پوچھوں گی تیرے ابا سے۔ اس کا مذہب جوان اولاد کے بارے میں کس تربیت کا بتاتا ہے۔"

"نزہت۔" وہ سرخ آنکھیں لیے کھڑے ہو گئے۔

"میں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ ہم شریف لوگ ہیں، بہنوں کے سامنے گھروں میں کنجریاں نہیں نچواتے۔" انہوں نے براہ راست لالے کے دوستوں پر طنز کیا۔

"جازی۔" ایسا گہرا وار سن کر نزہت تڑپ اٹھی۔ مگر انہوں نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ بولتے چلے گئے۔

"ساری دنیا کے سامنے میرا تماشہ بنا کر اب مجھے یہاں کس ذلالت کے لیے بلایا ہے کمینی لڑکی۔"

"خاموش رہو۔" وہ غصے سے بولی۔ "میں ایسی لڑکی نہیں۔"

"جانتا ہوں میں۔" وہ ہنسے۔ "کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں وہ جو گھروں سے بہانے بنا کر فلم دیکھنے جاتی ہیں، لڑکوں کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی ہیں، انہیں الو بنا کر دین و ایمان سے تہی دامن کر دیتی ہیں یہ بھی جانتا ہوں کیسی ہوتی ہے وہ لڑکی جو تنہائی اور اکیلے کمرے میں کسی لڑکے کو بلواتی ہے تم بھی ایک لڑکی ہو۔ کتنی پاکیزہ اور ستھری ہو گی۔ میں جان گیا ہوں۔"

"خدا کے لیے جازی مجھے غلط نہ سمجھو۔"

"خاموش رہو۔" وہ زور سے بولے۔ "ابا صحیح کہتا ہے۔ پاؤں کی جوتی۔" وہ نفرت سے بولے۔ "آوارہ، کمینی اگر آوارگی کا اتنا ہی شوق ہے تو جا کر کسی کوٹھے پر بیٹھ جا ہزاروں اپنے جیسے مل جائیں گے۔ ایک عالم کا ایمان تو نہ خراب کر۔" اعجاز شاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"خاموش چھوٹے ملا جی۔" نزہت نے زور سے کہا۔

"اپنے ابا سے کہہ دینا۔ مانا کہ پاؤں کی جوتی ہے عورت جسے مرد روز روز بدل لیتا ہے مگر عورت اپنا دوپٹہ کبھی نہیں بدل سکتی وہ تو قدرت کی طرف سے اس کے سر پر تانا گیا آسمان ہوتا ہے اور آسمان بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ انسانی اختیار سے باہر ہے۔ مرد کا وجود خاک ہو جائے تب بھی اس کی روح عورت کے سر پر آسمان کا سایہ قائم ہی رکھتی ہے......" وہ سانس لینے کو رکی۔ "چھوٹے ملا جی بہت بولنے لگے ہو۔ لگتا ہے ابا کی قید سے زبان چھوٹ گئی تمہاری۔ لڑکیاں اگر جھوٹ بول کر بہانے بنا کر کہیں جاتی ہیں ناں۔ تو یہ جھوٹ بولنا انہیں تم جیسے مردوں نے ہی سکھایا ہوتا ہے۔"

"بکواس نہ کرو۔" اعجاز شاہ کی مردانگی آج پہلی بار عود کر آئی۔ جانے کب کس طرح ان کا ہاتھ اٹھا اور نزہت کے گال پر نشان ڈال گیا۔

اس نے آنکھوں میں بے شمار آنسو لا کر ان کی طرف دیکھا۔ اعجاز شاہ کو یوں لگا جیسے آنسو فریاد کر رہے ہوں۔ "تم نے یہ کیا کیا؟ نزہت نے تو پہلی بار مذاق میں تمہارا گال اس طرح چھوا تھا کہ ہمیں ہمارے مسکن میں خبر ہی نہ ہوئی تھی اور تم نے آج یہ بدلہ دیا کہ اس کے گال پر طمانچہ لگا کر ہمیں پریشان ہو کر باہر آنے پر مجبور کر دیا کیا یہی انصاف ہے ملا جی؟"

اعجاز شاہ ان آنکھوں کی تاب نہ لا سکے۔ باہر جانے کو بڑھے۔

"یاد رکھنا جازی۔" وہ روتی آواز میں بولی۔ "جس طرح دائیں پاؤں کی جوتی بائیں پاؤں میں نہیں پہنی جا سکتی اسی طرح ہر عورت اچھی اور ہر مرد برا نہیں ہوتا۔ میرا یہ فلسفہ اپنی زبان میں اپنے باپ کو سمجھا دینا۔"

اعجاز کھٹاک سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے سیڑھیاں اتر کر وہ جونہی بڑی سڑک کے بیرونی کونے پر پہنچے بیوی جی ایک دوسری خاتون کے ہمراہ آتی دکھائی دیں انہوں نے بیٹے کو دیکھ کر دعا دی کہ ابھی تک ان کے انتظار میں یہیں کھڑا ہے۔ بے خبر عورت یہ نہ جان سکی کہ وہ تو زندگی کے

پورے پُل صراط سے گزر آئے ہیں اور اتنی آسانی سے گزر آئے ہیں کہ ان کے ایمان تک کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔

واقعی ان کے ایمان نے آج کیا انوکھی قوت بخشی تھی انہیں۔

اماں کے ساتھ انہیں پھر اسی راستے پر آنا پڑا ورنہ وہ تو اس وقت بھاگ جانا چاہتے تھے مگر اماں کے پیچھے چل پڑے۔ حویلی کے پاس سے گزرتے ہوئے تقریب کا شور سن کر دوسری خاتون نے اماں سے کہا۔

"سناؤ پھر تم کب لا رہی ہو بہو ملکوں کی حویلی سے؟"

بہو۔ اور وہ بھی ملکوں کی حویلی سے۔ اعجاز شاہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

رات اداس رنگ لیے اتر آئی۔ ملا جی کے گھر میں برآمدے کا چھوٹا سا بلب جل اٹھا بیوی جی اور اعجاز گھر میں اکیلے تھے ملا جی کو آج رائے ونڈ گئے چوتھا دن تھا۔ ان کی واپسی کا کچھ پتہ نہیں تھا کسی وقت بھی وہ کسی قسم کے حالات میں پُراسرار طریقے پر واپس آ سکتے تھے۔ لہٰذا دونوں چوکنے بیٹھے تھے مگر جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو جاگتے اعجاز نے جائے نماز پر تہجد پڑھتی ہوئی بیوی جی کی گود میں سر رکھ دیا۔ بیوی جی نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

"اماں میں شادی نہیں کروں گا۔" بیٹے کا بچپن کا سا ضدی انداز اور بے بسی کا لہجہ ماں کے کلیجے میں اتر گیا۔

"کیوں۔ کیا ہوا ہے تجھے؟"

"بس اماں۔ وہ بس یونہی۔" وہ کوئی جواز پیش نہ کر سکے۔

"تیرے سارے بہن بھائی بیاہ کر چلے گئے۔ سوائے فیروز کے۔" انہیں بچھڑا بیٹا یاد آ گیا۔ "بھائی کو خدا سمجھ کر میں نے خدا کی دی ہوئی امانت اسے دی تھی تاکہ اپنی اولاد سے محرومی پر وہ قدرت کو برا بھلا نہ کہے مگر قدرت شاید اسی لیے کچھ لوگوں کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتی وہ اس کی حفاظت نہ کر سکا اور میرا بیٹا کسی قابل نہ رہا۔ تیری شادی کر کے گھر میں اپنی پسند کی بہو لانا میری زندگی کی آخری خوشی ہے۔ بول کیا مجھ سے تو میرے نصیبوں کی طرح یہ آخری خوشی بھی چھین لے گا؟" بھرائی ہوئی ہمدرد بے بس آواز خاموش ہو گئی۔ سفید تسبیح کے موتی کی طرح آنسوؤں کے دو قطرے کھلی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

"اماں جی۔" اعجاز بے بسی سے بولے۔

"میں تیرے لیے ملکوں کی حویلی سے لڑکی لاؤں گی۔" بیوی جی کی آواز میں ایسی کھنک تھی۔ گویا کسی مخروطی انگلی نے ستار چھیڑ دیا ہو۔

"اماں۔ میرا بیاہ ہی کرنا ہے، ماں تو کسی سیدھی سادی غریب لڑکی سے کرنا ملکوں کی حویلی تو بہت اونچی ہے۔ وہاں تک تیری پہنچ ممکن نہیں۔" اعجاز نے کہا۔

"وہ انہی کے گھر پلی بڑھی ہے۔ بن ماں کی بچی ہے۔" بیوی جی نے تفصیل بتائی۔ "اس کا باپ بہت عرصے سے غائب ہے۔ ماں اسے انہی لوگوں کے در پر چھوڑ کر مری! اللہ بخشے وہ میری بہن بنی ہوئی تھی مگر ایسی کہ سگی بھی ہوتی تو اتنا ساتھ نہ نبھاتی۔ میں نے اسے قول دیا تھا۔"

"کیسا قول؟" اعجاز شاہ چونکے۔

"یہی کہ تیری شادی کلثوم سے کروں گی۔"

کلثوم۔ اعجاز شاہ کا دل بولا۔ اگر کہیں اماں کلثوم کی بجائے نزہت کہہ دیتیں تو......تو ان کا دل ڈوبنے لگا۔

بیوی جی نے آج پہلی بار زیادہ بات کی تھی۔ برسات کی نرم پھوار جیسی برستی آواز۔ اعجاز شاہ کے کانوں میں اتر گئی۔ دل میں مدھم سا احساس دیئے کی طرح روشن ہوا۔ اور اپنی شادی کا ذکر سن کر آج پہلی بار اعجاز شاہ کو محسوس ہوا کہ وہ جوان ہو گئے ہیں۔ بادلوں میں ابھرتے ڈوبتے چاند کی ملگجی روشنی میں ماں بیٹا اپنی اپنی سوچوں میں گھرے بیٹھے رہے!

"اوہو۔" چاند بالکل ہی ڈوب گیا اور بادل گرج کر برسا۔ "تو بیٹے کا رشتہ طے کر آئی ہے۔" ملاجی جانے کب چلے آئے تھے ساری بات سننے کے بعد چھڑی برآمدے میں لگی کھونٹی کے ساتھ لٹکا کر اب وہ شیروانی کے بٹن کھول رہے تھے۔

"ارے کہاں لگائی ہے بات! کچھ بول بھی۔"

"وہ کلثوم کی بات بتا رہی تھی۔"

"وقت آنے پر اسے پتہ چل جاتا۔ پہلے بتا کر اس کے خیالات خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب سارے کام کاج چھوڑ کر وہ صرف اس کے بارے میں سوچتا رہے گا۔"

اعجاز شاہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

"باہر سے باپ آیا ہے پانی کا ہی پوچھ لیا کرنا خلف۔" ملاجی نے تیکھی آواز میں کہا۔

اعجاز جا کر گھڑونچی پر رکھے گھڑے سے پانی انڈیلنے لگے۔ گھبراہٹ میں ذرا سا پانی نیچے گر گیا۔

"ہاتھ سیدھا رکھ کاکا۔" وہ چلائے۔ "اسراف ہے یہ سراسر، حساب ہوگا اس کا بھی، پر تو بھی کیا کرے ماں نے تیرے خیالات ہی الٹی طرف لگا دیئے ہیں۔"

اعجاز شاہ کا دل چاہا کہہ دیں "اباجی آپ کی ان دل جلانے والی باتوں کا بھی تو حساب ہوگا یا نہیں۔ نیکی بدی کے جو فرشتے آپ کے کاندھوں پر بیٹھے ہیں شاید وہ بھی ان باتوں سے آزردہ ہو جاتے ہوں گے۔" مگر وہ بول نہ سکے۔ ان کی زبان باپ کی مٹھی میں تھی۔

"چل ادھر آ ٹانگیں تو دبا۔" انہوں نے بیوی کو حکم دیا۔ "اس سالے جلسے نے تو تھکاوٹ کے مارے برا حال کر دیا ہے۔"

دین کی تبلیغ کرنے اور "خادم دین" کا خطاب حاصل کرنے والے انسان کی گفتگو کا یہ انداز اعجاز شاہ کو پریشان کر گیا۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

باپ کی شخصیت کے خول اور خیالات کی گرفت میں لپٹے ہوئے سید اعجاز حسین شاہ کی زندگی میں دوسری بار وہ سنہری سراپا رات کے اندھیرے میں چمکا اور کرنوں کی سی نرمی لیے ان کی ذات پر چھانے کے لیے لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ سراپا کلثوم کا تھا۔

چاند کا جوش اس رات شباب پر تھا جب کلثوم اس آنگن میں اتری۔

ملاجی کو اس رشتے پر قطعی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں تو بے زبان رعایا چاہیے تھی جس پر وہ حکومت کر سکتے۔ کلثوم بقول ان کے خدمت گزار بچی تھی سر پر باپ کا سایہ ہوتے ہوئے بھی اتنا اونچا تھا کہ اس تک پہنچتی دھوپ کی کرنوں کو نہ روک سکتا تھا۔ ماں مجازی خدا کی خدمت کرتے کرتے اور بے وفائی کا غم سہتے مٹی میں مل چکی تھی۔ چھوٹے ملاجی کی برات اس سپنوں کے محل یعنی ملکوں کی حویلی کے ایک چھوٹے سے حصے میں گئی۔ جہاں کلثوم کے ماما نے اسے شرعی حق مہر کے عوض بیاہ دیا۔

مولانا سید باقر علی شاہ بیٹے کے لیے صرف بتیس روپے آٹھ آنے میں نئی نکور، سجی سنوری،

آنکھوں میں کنوارے سپنوں کی برات سجائے ایک خوبصورت جوتی لے آئے۔ اس مہنگائی کے دور میں کتنا سستا سودا تھا یہ؟

ملا جی نے نکاح کے چھوارے بانٹے حسب توفیق ولیمہ کیا اور نفس نفس کر مبارک باد وصول کی اور یوں شرع کی حدود کے اندر چلتے ہوئے اعجاز شاہ اور کلثوم دونوں ایک سنگ میل پر آن رکے۔ مگر یہ سنگ میل ایسا تھا کہ جہاں اعجاز شاہ تو بالکل ایک دم ٹھہر گئے جبکہ کلثوم کچھ آگے جانا چاہتی تھی مگر ساری زندگی عورت کے خلاف پڑھائی گئی پٹی رنگ لائی۔ اعجاز شاہ کا دل اس بات کو تسلیم ہی نہ کرسکا کہ یہ مظلوم مخلوق محبت کرنے کے قابل ہے۔ کلثوم کے قرب میں ان کا دل انجانے خوف سے بھر گیا مگر جانے کیوں ان کے دل نے بارہا یہ محسوس کیا کہ اس خوف میں سرور بھی شامل ہے۔ ساری رات وہ اپنے سرد جذبوں سے لڑتے رہے مگر اس سنگ میل پر وہ خود بھی جم کر پتھر کے ہوگئے۔

اعجاز شاہ کی زندگی میں آنے والی پہلی خوبصورت رات ملا جی کے فلسفے کی نذر ہوگئی۔ کلثوم صورت حال سمجھنے کی کوشش میں پریشان ہوگی تھی۔ اعجاز شاہ دن کے اجالے میں تو دور رہتے ہی تھے۔ رات کا اندھیرا بھی ان کا اپنا نہ بن سکا۔ اندھیرے ان کے لیے وحشت کا سامان لاتے۔ کلثوم کی آنکھوں میں انگڑائیاں لیتی خاموش التجا، اپنے پیار کا حق مانگتی کالی زلفیں، اپنا ناکردہ جرم پوچھتا ہوا گورا بدن، ٹوٹ کر چاہے جانے کی آرزو کرتا دل، اور سینے میں لگی دھیمی دھیمی سی آگ جو کسی وقت بھی بھڑک سکتی تھی، اعجاز کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں ناکام رہی۔ وہ پیار کی ترسی ہوئی لڑکی تھی، چنانچہ اس نے نفس کو مار کر خدمت گزاری کے ذریعے ان کے دل پر قابض ہونا چاہا۔ اس دل پر جہاں تہہ در تہہ نفرت کے کالے غلاف ڈال دیے گئے تھے۔ وہ خدمت کے جذبے سے سرشار ان کے قریب آتی تو وہ پسینے پسینے ہو جاتے۔ اکیلے کمرے میں کلثوم کے ساتھ ان کا دم گھٹنے لگتا۔ باہر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتے تاکہ ابا جی کی باتوں کی آواز آتی رہے۔ اس وحشت میں یہی آواز انہیں اصل زندگی لگتی۔ وہ زور زور سے بولتے رہتے۔ کلثوم کو دیکھ کر ایک بات کرتے اور دس بار قہقہہ لگاتے۔ اعجاز شاہ کو ابا جی ان دنوں کچھ بدلے بدلے سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ذرا دیر اندر کمرے میں بیٹھتا کلثوم بھی ادھر جاتی تو وہ فوراً اسے آواز دے کر باہر بلا لیتے۔

''اوئے اعجاز'' وہ باہر چلے آتے اور مؤدب کھڑے ہو جاتے۔

''ہر وقت زنانی کے پاس نہ گھسے رہا کر۔'' ابا جی سرگوشی کرتے۔ ''مردوں کے کرنے والے اور بھی بہت سے کام ہیں دنیا میں!''

''جی'' ان کی یہ ''جی'' پہاڑ کا سا بوجھ لیے بیوی جی کے دل پر آن گرتی وہ سب کچھ جان گئی تھیں کہ باپ کا دیا ہوا فلسفہ کس خطرناک انداز سے بیٹے کی زندگی کی ناؤ کو بہتے پانی کے بے رحم دھاروں پر بہائے چلا جا رہا ہے مگر وہ مجبور تھیں کچھ بھی تو نہ کرسکتی تھیں۔ ان کی تجربے کار نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ بیٹا کسی قابل نہیں رہا۔ لاشعور میں بٹھایا گیا خوف اسے مردوں والی زندگی سے بہت دور لے گیا ہے کتنا ارمان تھا انہیں اعجاز کے بچے پالنے کا۔ ان کی گود سے اعجاز کو نکلے اب چوبیس سال ہوگئے تھے۔ چوبیس سال سے ان کی سونی گود پوتے کی آمد کی منتظر تھی مگر ہوا کیا تھا؟ کلثوم جب ہر روز صبح سوکھا سر اور خشک زلفیں لیے اٹھتی تو ان کے دل پر گھونسا لگتا۔ دس ماہ گزر گئے تھے مگر ایک بار بھی تو اس نے آنگن میں کھڑے ہو کر بال سکھاتے ہوئے اعجاز کو شرمیلی نظروں سے نہ دیکھا تھا۔ پر جمعہ کے جمعہ ضرور نہاتی اور گیلے بالوں کو سہ پہر سے پہلے باندھ کر نماز ادا کرتی۔ لگتا تھا وہ مرد اور عورت کے ازلی رشتے کی چاشنی سے بالکل ہی بے خبر کردی گئی ہے۔

اعجاز شاہ کی زندگی میں عورت کو داخل کرکے انہیں اس کے سائے سے دور کردیا گیا تھا۔

پھر ایک رات عجب بات ہوئی۔ سخت طوفان سے کھڑکی کے پٹ کھل گئے۔ کمرے میں خزاں کے زرد پتے ادھر ادھر بکھر آئے۔ دو چھتی پر رکھی گئی ایک چیزیں نیچے آن پڑیں۔ اپنے اپنے مسکن پر سوئے ہوئے دونوں تیزی سے اٹھے۔

''اوئے اعجاز'' باہر سے ملا جی کی آواز آئی۔ ''کس دنیا میں گم ہے تو'' وہ چلائے۔ ''کچھ باہر کے طوفان کا بھی اندازہ کرلے۔''

اعجاز نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ ملا جی جو خدا جانے اس وقت اپنے کس محروم جذبے کی پکار پر ادھر آگئے تھے۔ واپس پلٹ گئے۔

اعجاز اندر واپس آئے اور کھلی کھڑکی بند کرنے آگے بڑھے۔ عین اسی وقت کلثوم دیوار ٹٹول کر کھڑکی بند کرنے آگے آئی۔ وہ جھکی ادھر سے اعجاز شاہ تیزی سے آگے بڑھے اور کلثوم کا دل کی تپش لیے گورا بدن اعجاز شاہ کے پورے وجود میں سما گیا۔

''اوہ.....'' اعجاز شاہ نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اندر کا شور کچھ مچلا۔

"اُف......" خوبصورت نسوانی سرگوشی اندھیرے میں سرسرائی۔ "آپ یہ داڑھی منڈوا کیوں نہیں دیتے۔"

اعجاز شاہ نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ کلثوم بالکل قریب آ گئی۔

"جازی" دلفریب سرگوشی اعجاز کا دامن جلاتی نکل گئی۔

"جازی" دوسری بار آواز میں ہلکی سی سسکی نمایاں تھی۔

اس رات کے گھور اندھیرے میں اعجاز شاہ نے چوروں کی طرح چھپ کر کلثوم کو چوم لیا۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا پیار تھا جس کی لذت بہت ہولناک تھی وہ بے اختیار آگے بڑھے۔

"جازی" کلثوم کے وجود نے انہیں اپنے اندر سمیٹ لینا چاہا۔

"اوئے اعجاز۔" باہر کڑکتی بجلی ایک دم گری۔ "دروازہ تو بند کر لے بے حیا۔" ملاجی سامنے برآمدے میں لیٹے شاید اندھیرے میں بھی اندازہ لگا چکے تھے۔

گھبرا کر اعجاز شاہ نے زندگی میں پہلی بار ہاتھ میں آئی ہوئی عورت کے وجود کو چھوڑ دیا اور باہر نکل آئے اور پھر ساری رات دلہیز پر بیٹھے رہے اندر کمرے میں کلثوم کی سسکیاں تکیے کے اندر بھری بے جان روئی کی قبر میں دفن ہوتی رہیں۔

صبح طوفان تھم چکا تھا۔ فضا پرسکون، روشن اور خوشگوار تھی ملاجی کہیں جا چکے تھے۔ بیوی جی پڑوس میں کسی کی عیادت کو گئی تھیں کہ کوئی چراغ سحری تھا دنیا سے ناتا ٹوٹنے والا تھا مگر آنکھیں جینے کی جوت میں جگمگا رہی تھیں۔ کبھی کبھی رونے کی آواز آتی۔ جیسے کوئی رات کے اس سانحے پر رو رہا ہو ایک عورت کو منزل پر پہنچاتے پہنچاتے رہ گیا تھا۔

کلثوم ناشتے کی ٹرے لیے اندر آئی۔ اعجاز شاہ کرتہ پہن رہے تھے۔ سفید بے داغ پیٹھ ان کے کردار کی طرح شفاف تھی۔ اس نے چند لمحے ان کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر بولی۔

"ناشتہ کر لیں جی۔"

اعجاز شاہ نے اس کی سوجی آنکھوں کو غور سے دیکھا اور بولے "کلثوم تم مجھے "اوئے" کہہ کر بلایا کرو۔"

"کیوں جی؟" وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

"بس۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"ابا کہتے ہیں نا۔ تبھی۔" وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ "میں کیوں کہوں؟"

وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ میرا حکم ہے مگر اپنی بے تکی بات پر غور کر کے خاموش رہے اپنی کمزوری ان پر پوری طرح عیاں تھی۔ مرد جب عورت کو فتح نہ کر سکے تو وہ اپنی طبیعت کا غصہ اس پر صرف کر کے اس کی آواز بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سو اعجاز شاہ نے بھی یہی کیا گزری رات پوری طرح عیاں ہو کر سامنے چلی آئی تھی۔ اندھیرا اور طوفان اس پر قہقہے لگانے لگے۔ وہ کیسا مرد تھا۔ جو ان دونوں سے فائدہ نہ اٹھا سکا انہیں یوں لگا جیسے رات، اندھیرا اور طوفان ان سے کہہ رہے ہوں۔

"تم کیسے مرد ہو اعجاز شاہ۔ ہمیں مایوس کر دیا۔ ارے نادان ہماری آڑ میں تو لوگ دوسروں کی عزت لوٹ لیتے ہیں۔ نفس کے لیے ایمان خراب کرتے ہیں نفس کی پکار پر مرد کوٹھوں پر جا پہنچتا ہے اور عورت اپنے مرد کی چوری سے کسی اور کے دامن میں وہ خوشی تلاش کر لیتی ہے جو اپنا مرد اسے نہیں دے سکتا۔ تو کیسا مرد ہے؟ اپنی ہی عورت کو سکون نہ دے سکا۔"

مگر وہ چولا جو باقر علی شاہ نے اسے پہنا دیا تھا، اتار کر پھینک دینا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔

اعجاز شاہ نے پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ کلثوم کھڑی رہی۔ اعجاز شاہ نے کچھ سوچا۔ چائے کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی اور پھر برا سا منہ بنا کر گھونٹ بھرا۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے پیالی دیوار سے دے ماری۔

"یہ سلیقہ ہے تمہارا۔" وہ دھاڑے۔ "چائے کے نام پر گرم پانی اور پراٹھا ہے یہ۔" انہوں نے پلیٹ میں سے روٹی اٹھائی۔ "یہ لکڑی کا گول ٹکڑا کوئی انسان کھا سکتا ہے اسے؟"

ایک ٹھوکر لگی اور سب کچھ الٹ کر زمین پر آ رہا۔

بن ماں کی بچی حیران کھڑی رہ گئی۔ دس ماہ سے ہر رات کے بعد طلوع ہونے والی صبح وہ ایسا ہی ناشتہ بنا کر دیتی تھی جسے وہ خاموشی سے کھا کر چلے جاتے تھے مگر آج......؟ آج کیا ہوا تھا؟ دس ماہ کی ان راتوں میں ایسی کوئی رات بھی تو نہیں گزری تھی! مذہب کے چولے میں لپٹا نفس کا غلام انسان اپنے ہی نفس پر رات سواری کر کے اسے مارنے کی کوشش میں رہتا اور صبح اطمینان سے کام پر چلا جاتا مگر آج کی صبح مختلف تھی۔

روتی ہوئی کلثوم باہر چلی گئی اعجاز فائلیں اٹھائے جامعہ چلے گئے۔

پڑوس میں چراغ سحری گل ہو گیا تھا۔ ملاجی اور بیوی جی سارا دن وہیں رہے پل دو پل بیٹھ

کر کلثوم بھی چلی آئی سہ پہر بھی رخصت ہونے لگی۔ دھوپ ملاجی کے حجرے کی دیواروں پر سے ہوتی ہوئی منڈیر پر جا کر ٹک گئی۔ کلثوم آج تنہا تھی اعجاز شاہ کے انتظار میں گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھرتی رہی۔ پاؤں کی جوتی کو وہ صبح اتار کر دھتکار کر پھینک گئے تھے وہ اپنے وجود میں ساری بے قراریاں سمیٹے پھر سے پاؤں میں جانے کو بے تاب تھی۔ تخت پر لیٹے لیٹے وہ جانے کس وقت اونگھ گئی۔

دھوپ حجرے کی منڈیر چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی۔ اعجاز شاہ اندر آئے گھر کا دروازہ کھلا ہی ملا۔ آشیاں خاموش تھا سامنے تخت پر ان کی کل کائنات سوئی پڑی تھی۔ سفید چہرے پر مسکینی اور بے بسی کا تاثر نمایاں تھا۔ وقت کی ہر پکار پر لبیک کہتا ہوا بدن ایسے زاویے سے پڑا تھا کہ کوئی زاہد بھی دیکھے تو ڈگمگا جائے۔ کالی لمبی چوٹی نیچے لٹک آئی تھی جیسے ناگن بن کر بدن کے اس خزانے پر پہرہ دے رہی ہو، چہرہ کسی نامعلوم تپش سے انگاروں کی طرح سرخی لیے ہوئے تھا۔ لرزتی پلکیں کوئی ان کہی داستان سنا رہی تھیں ...... ان چھوٹے گلابی ہونٹ کنوارپن کی ساری سرخی جذب کیے ہوئے تھے! صاف لگتا تھا کہ ابھی تک یہ لالی انہوں نے دوسرے کے وجود کو منتقل نہیں کی کہ یہ حق لینے والے اس معاملے میں بے حد بدنصیب واقع ہوئی تھے۔

وہ ذرا سا جھکے اور چاہا کہ صرف ایک بار ان جیتے جاگتے نقوش کو ہاتھ لگا کر محسوس کر لیں کہ یہ حقیقت بھی تھی یا پھر وہ جاگتی آنکھوں سے طویل سپنا دیکھ رہے تھے۔

پڑوس میں جنازہ اٹھنے کا شور ہوا۔ آہیں، سینہ کوبی، ایک زندگی کے روٹھ جانے پر اتنا احتجاج! آوازیں آسمان چیر کر فریاد کرنے لگیں کہ کاش ایک بار صرف ایک بار روٹھی ہوئی زندگی مان جائے۔ مگر وہاں آکاش پر بیٹھا وہ مہربان مالک خاموش رہا۔ روز اول سے ہی اس نے روح سے واپسی کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس پر خاموش اور مطمئن قائم تھا۔

اعجاز شاہ گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ دروازے سے ملاجی وضو کرنے اندر چلے آئے تھے۔ کلثوم حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"اوے۔ کچھ شرم کرو اوئے۔ یہ کیا ڈراما بنایا ہوا ہے برابر میں میت ہوگئی ہے اور ان کو رنگ رلیاں سوجھ رہی ہیں تو اتنا بے شرم کیوں ہوگیا ہے اعجاز؟"

کلثوم اور اعجاز یوں سر جھکا کر کھڑے رہے جیسے کسی ناکردہ گناہ کی پاداش میں سنگسار کیے

جا رہے ہوں۔

"جا کا کی تو کچھ دن گھر رہ آ۔" وہ کلثوم سے بولے۔ "وہ تیرا ماما آیا ہوا ہے۔ پوچھ رہا تھا تیرا۔ تیار رہنا۔ وہ جنازہ پڑھ کر واپسی پر تجھے لیتا جائے گا۔"

"جی بہت اچھا۔" وہ اندر چلی گئی۔

"اوئے۔" وہ اعجاز شاہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر بولے۔ "تیرے رخساروں پر سے بال کدھر گئے اب کس لیے دانے نکلنے لگے ہیں؟"

اعجاز نے جلدی سے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ایک بار پھر وہی کوشش لاشعوری طور پر سرزد ہوگئی تھی۔ رات ہی تو کلثوم نے کسی لپکتے گرم لمحے میں کہہ جو دیا تھا "آپ داڑھی منڈوا کیوں نہیں دیتے؟"

"بول اوئے۔ اب تیرے خیالات کیوں بھٹکنے لگے! کس چیز کا خیال رہ گیا ہے اب زندگی میں؟" ملاجی کا ہر تیر طنز سے بھرپور تھا۔

"ابا جی۔ وہ کلثوم نے کہہ دیا تھا۔"

"اوہو۔" وہ مسکرائے۔ "بہت خوب! یعنی کہ اب مولانا باقر علی شاہ کا بیٹا بیوی کی فرمائش پر داڑھی منڈوائے گا۔ اوئے ناک کٹوا دے میری! دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گا اوئے۔"

وہ وضو کرنے آئے تھے تاکہ روٹھی ہوئی زندگی کے جسد خاکی کی امانت زمین کو لوٹا سکیں مگر یہاں زندگی کے جھگڑوں میں الجھ گئے!

کلثوم باہر نکل آئی اس کے ہاتھ میں سبز پلاسٹک کی ٹوکری تھی جس میں سے چند سرخ، سبز، نیلے، پیلے زندگی کے رنگوں سے بھرپور کپڑے جھانک رہے تھے۔

"دیکھو کا کی!" وہ کلثوم سے مخاطب ہو کر بولے! "تمہیں رہنا ہو تو اسی داڑھی والے شوہر کے ساتھ گزارا کرو ورنہ۔"

"وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔" برائے مہربانی میرے بیٹے کو مذہب سے، شرع کی حدود سے دور نہ کرو۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا۔"

وہ لوٹا لے کر وضو کرنے بیٹھ گئے! روتی ہوئی کلثوم ماما کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئی۔ اسے کسی نے نہیں روکا دروازے میں اس کی سفید ٹاسے کی چادر پھنس گئی اس نے جھٹکا دے کر اسے نکالا اور

نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"ہوں۔" ملاجی نے گہری سانس لی۔ "نرمی تو دیکھو ذرا خود ہی سمجھ آجائے گی۔"

"اباجی اس کا کیا قصور ہے۔ آپ نے زیادتی کی ہے۔" خدا جانے کس طرح اعجاز کی زبان بولی۔

ملاجی حیرت کے سمندر میں غرق ہوگئے۔ ساری زندگی کی ریاضت اکارت گئی۔ آج ان کے بیٹے سید اعجاز شاہ کی ذات میں ایک شوہر بول رہا تھا۔

"اب کیا کہا۔" وہ غصے سے لال ہوگئے۔ "کچھ ہوش کر اعجاز شاہ پاؤں کی جوتی کو سر پر رکھے گا تو کیا وہ ٹوپی بن جائے گی۔"

"اباجی۔ آپ نے ناحق اسے بھیجا۔ وہ رو رہی تھی۔" اعجاز کی زبان کا زنگ آج جانے کس طرح اتر گیا۔ وہ تو ہر فقرہ بولنے کے بعد خود بھی حیران ہوجاتے۔

"اوئے!" وہ پاؤں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھ کلائیوں تک دھوتے ہوئے بولے "یہ چلتر ہوتے ہیں عورتوں کے، تو سمجھتا کیوں نہیں! یہ سارے چلتر ہی تو مرد کو عورت کی زندگی سے نزدیک لاتے اور دور کرتے ہیں۔ ہونہہ۔ مگرمچھ کے آنسو۔" مولانا نے وضو جاری رکھا۔

"اباجی۔ وہ......" اعجاز نے کچھ کہنا چاہا۔

"اوئے میں برما کے محاذ پر تھا۔" وضو کے ساتھ تقریر بھی شروع ہوگئی۔ "یہ وقت تھا جب کہ دودھ کے ایک خشک ڈبے کے عوض عورت مل جاتی تھی۔" انہوں نے منہ میں پانی بھر کر کلی کردی۔ جیسے زبان کو اس ناپاک ذکر کے بعد دھو کر صاف کرلینا چاہتے ہوں۔ "ارے اتنی سستی چیز ہے یہ تو جس کے پیچھے پھر رہا ہے۔" انہوں نے چہرہ دھونا شروع کیا۔ "پھر بھی میں خراب نہیں ہوا اور تو میری اولاد، آج عورت کی طرفداری میں باپ کو سنا رہا ہے۔ کچھ شرم کر۔ اوئے باپ سے بحث کرتا ہے اور وہ بھی عورت کے پیچھے۔"

"مگر اباجی۔ کلثوم میری بیوی ہے۔ فرق ہوتا ہے ایک بیوی اور مانگی ہوئی لڑکی میں۔"

"ارے واہ۔ بیوی نے زبان ڈال ہی دی تیرے منہ میں بھی!" ملاجی تلملائے۔ "باپ کے منہ آتا ہے چل دور ہو یہاں سے۔!"

اعجاز شاہ روٹھے روٹھے سے کھڑے رہے آج غصہ سارے بدن کا لہو کھولا گیا تھا۔ ملاجی،

بیٹے کی کیفیت سمجھ گئے۔ اپنی اس متاع عزیز کو وہ ناحق غصہ کرکے نہیں کھونا چاہتے تھے۔ وضو کرکے اٹھے کندھے پر پڑے بڑے سے رومال کے ساتھ بازو پونچھتے وہ اعجاز کے قریب چلے آئے۔

"سن اعجاز شاہ۔ میں تیرے بھلے کے لیے ہی کہتا ہوں عورت کے وجود کو اپنی ضرورت سمجھنا چاہیے عادت نہیں بنالینا چاہیے۔" وہ نرمی سے اُس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"واہ ملاجی۔ اعجاز شاہ کا دل ہنس پڑا۔" اپنی بات کی خود ہی تردید کردی۔ عورت کا وجود اگر مرد کی ضرورت نہ ہوتا تو برما کی چھاؤنی میں آپ کو ایک عورت سے اتنی ہمدردی کیوں ہوتی کہ آپ ہزاروں میل دور بیٹھی اپنی بیوی اور دو بچوں کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنے کی کوشش کرتے؟ دوسرے الفاظ میں آپ نے وہ سب کچھ شرع کے اندر کرنا چاہا جو دوسرے شرع کی پروا نہ کرتے ہوئے کرتے تھے مگر دونوں باتوں کے پیچھے جذبہ صرف ایک ہی تھا۔ اپنا وعظ کبھی خود پر بھی آزمالیا ہوتا میرے بزرگ......اگر عورت کا وجود آپ کی عادت نہ ہوتا تو میری ماں کی بوڑھی کڑکڑاتی ہڈیاں چالیس برس کی عمر میں مجھے جنم نہ دیتیں یہ پوری ایک درجن اولاد کی ٹرین ظہور میں نہ آتی کاش کہ عورت کو ضرورت سمجھنے والے اس کے وجود کو بھی تسلیم کرلیں! کاش!"

اعجاز شاہ کا دل گلوگیر ہوگیا۔ ملاجی جنازہ پڑھا کر شاید وہیں سے مسجد چلے گئے تھے بیوی بھی لوٹیں اور اعجاز کو یوں بیٹھا دیکھا تو نظریں اِدھر اُدھر کسی کو ڈھونڈنے لگیں۔

"کلثوم کہاں ہے؟" انہوں نے اعجاز سے پوچھا۔

"چلی گئی۔" شکستہ بت سے آواز نکلی۔

"بغیر میری اجازت کے چلی گئی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ آج ماتم والے گھر میں کھانا بھجوانا ہے۔ اب کیا اس کا باپ آکر پکائے گا۔"

تب اعجاز شاہ نے دیکھا یہ ایک عورت کے روپ میں ایک ساس بول رہی تھی۔ ہر انسان حاکم بننا چاہتا ہے۔ انہوں نے سوچا وہ اپنے میں سے کوئی نہ کوئی محکوم تلاش کرلیتا ہے۔ تاکہ اپنی انا کی تسکین کے لیے اس پر حکومت کرسکے۔

"کس کی اجازت سے گئی ہے؟ بول کیا تو نے بھیجا ہے اسے کہ ماں اس بڑھاپے میں خوار ہوتی پھرے؟" ماں کے اس لہجے سے اس خوشی کی رخصتی ہوچکی تھی جس کے تحت وہ شادی پر آمادہ ہوئے تھے۔

"ابا جی نے بھیجا ہے۔" وہ سکون سے بولے۔

"کیوں؟" کڑکڑاتا گرم تیل جیسا لہجہ اُمڈ آیا۔

"یہ ان ہی سے پوچھیں؟"

"ارے بیوی تیری ہے یا......" وہ خاموش ہوگئیں پڑوس میں کھانا نہ بھجوانے پر ناک کٹنے کا خطرہ تھا اس لیے وہ بہت غصے میں تھیں چونکہ اعجاز شاہ نے آج پہلی بار اماں کو غصے میں دیکھا تھا وہ تو کبھی بولی ہی نہ تھیں انہیں ماں کی شخصیت کا یہ پہلو بے حد عجیب لگا۔

بیوی جی نے اٹھ کر محلے کی دو چار لڑکیوں کو پکارا کہ آ کر مدد کریں وہ گھر جہاں لڑکیاں شجرِ ممنوعہ تھیں، اس کے دالان میں رنگین آنچل کھانا پکاتے ہوئے لہرانے لگے اعجاز اٹھ کر کمرے میں چلے گئے زندگی اب آوازوں کے روپ میں بند دروازے سے ٹکرانے لگی۔

"بیوی جی۔کلثوم کیوں چلی گئی؟" کسی کا سوال تھا۔

"اعجاز کے ابا نے کچھ کہہ دیا۔ برا لگا ہوگا نواب زادی کو۔" یہ اماں بول رہی تھیں۔

"مگر ایسی تو نہ تھی وہ؟" کسی نے صفائی پیش کی۔

"ارے ایسی ویسی کی کیا بات ہے؟" اماں نے آہ بھری۔ "وہ تو میں نے ہی آج تک اپنی زبان بند رکھی۔ ورنہ آج کل کی لڑکیاں ناک پر مکھی بھلا بیٹھنے دیتی ہیں۔" اماں کو آج ہی موقع ہاتھ آیا تھا۔

"وہ تو زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھی۔" پہلے والی آواز آئی۔

"ارے توبہ کرو۔" دوسرا انوکھا تیز لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔ "تم نے بھی خوب کہی! لڑکی ملکوں کی حویلی میں پلے بڑھے اور خاموش رہے! تم نے سنا نہیں بڑے ملک صاحب کی نز[illegible] قصہ؟"

اعجاز شاہ کے کان کھڑے ہوگئے۔ نزہت کا قصہ کیا تھا؟ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہوا تھا؟ عرصہ ہوا کہ محبوب کی گلی کی خاک ان کے نقشِ پا کو ترس گئی تھی۔ وہ دروازے کے قریب کھسک آئے۔

"وہ منگنی توڑ دی ناں! اس کی پشاور والی خالہ کے بیٹے نے!"

"وہ کیوں؟" چار پانچ آوازیں اپنے اندر بے پناہ ٹوہ لینے کا انداز لیے ہوئے تھیں۔

"ارے سُنا ہے نثار گل نے اُس دن جب کہ نشاط کی شادی تھی، کسی لڑکے کو نزہت کے

کمرے سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ بس پھر کیا تھا انکار کر دیا اس نے کہ یہ لڑکی ٹھیک نہیں۔"

"ایمان سے۔" ایک آواز آئی۔

"سچی مچی۔" دوسری آواز میں سیدھا سادا نخرے کا انداز تھا۔

"اُف۔ توبہ۔ اللہ معافی دے۔" اماں بولیں۔

"اب دیکھیں ناں۔ بھلا بزرگوں نے کچھ کہہ دیا تو کلثوم بیگم آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر چلی گئی۔ گھر میں سو نیم سیم ہوتی ہی رہتی ہے۔ اب بزرگ ہیں تو اچھی بات ہی کہی ہوگی۔ مگر کیوں بھائی! ملکوں کے گھر سے آئی تھی۔ بات کیوں سنے!" جانے کس مکمل عورت کی یہ آواز تھی۔

"میں تو خالہ جان اس بات کے حق میں ہی نہ تھی۔" پڑوس والی، سارے محلے کی شگو آپا بولیں۔ جن کے چار بچے تھے مگر گھر کے سامنے رہنے والے اسکول ماسٹر سے باقاعدہ معاشقہ چل رہا تھا۔ "کئی بار میں آپ سے کہتے کہتے رہ گئی۔ اپنے اعجاز کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ ملکوں کی حویلی کی لڑکیوں کو سب ہی جانتے ہیں۔ بھئی میرے میاں کہتے ہیں کہ جن کے لڑکے ماؤں بہنوں کے سامنے گھر میں کنجریاں بلاتے ہیں اُن کی لڑکیاں بھلا کتنی شریف ہوں گی۔" شگو آپا نے ہانڈی میں سے چمچ نکال کر سالن اماں کی طرف بڑھایا۔ تا کہ وہ نمک مرچ کا اندازہ کر سکیں۔

"جیتی رہو۔" اماں نے دُعا دی!

کلثوم کو تو آج تک انہوں نے کبھی دُعا نہ دی تھی۔ حالانکہ اُس نے خدمت میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ دُور کے ڈھول سہانے جو ٹھہرے۔

"اعجاز کو مت جانے دیں اُسے لینے کے لیے۔" انہوں نے اماں کو بلا معاوضہ اپنی ماہرانہ رائے دی۔

"خود ہی آجائے گی جوتیاں چٹخاتی۔"

اعجاز کو یوں لگا جیسے وہ سب مل کر اپنے پاؤں کی جوتیاں ایک دوسری کے سر میں مار رہی ہوں۔

"ہاں بھلا وہ نزہت والی بات تو پوری سناؤ۔" اماں نے یاد دلایا۔

"بس خا[illegible] جان، بات کیا تھی جی۔ لڑکے نے کہا آنکھوں دیکھی مکھی کون نگل سکتا ہے۔ انگوٹھی تار کر منہ پر مار گیا۔ وہ تو شکر ہے لڑکے کو اس نے پہچان نہیں لیا۔ سید پٹھان ہے جی۔ پکڑ کر چار

ٹوٹنے کر ڈالتا۔"

آخری فقرہ سن کر اعجاز شاہ کانپ گئے۔

شگو آپا نے بات جاری رکھی۔ "نشاط کی شادی میں، میں بھی وہیں تھی۔ برات کے ساتھ آئے ہوئے سکندر شاہ نے سنا ہے کہ لڑکے کو صاف پہچان لیا تھا۔ مگر وہ بتاتا کسی کو نہیں۔"

"وہ تھا کون؟" بے خبر اماں نے سوال کیا۔

"ربّ جانے جی۔ بڑے ملک نے سکندر شاہ کو دھمکی، لالچ دیا۔ مگر وہ بتاتا نہیں۔ صرف اتنا کہتا ہے کہ میرا یار تھا۔"

"تو پھر غنڈہ ہی ہوگا اُسی کی طرح کا کوئی۔" اماں نے بات ختم کی۔

کام ختم ہو گیا، سارا کھانا پیک کر پڑوس میں چلا گیا۔

اعجاز شاہ اس رات بھوکے جاگتے رہے۔ "سکندر شاہ تو عظیم انسان ہے۔" اُن کا دل پکارا۔ "اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔" نزہت کے متعلق سوچ کر ان کا دماغ بولا۔ "سالی چلی تھی اپنے ساتھ میرا بھی ایمان خراب کرنے۔"

مگر دل، وہاں تو درد تھا، اندھیرا تھا، کسی کی لٹی زندگی کا ماتم تھا۔ جانے کیوں؟ اس کیوں کا ان کے پاس جواب نہ تھا۔

رات گئے ملا جی گھر واپس آئے۔ دالان ابھی تک کھانے اور رنگین آنچلوں کی ملی جلی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ملا جی کی چھٹی حس نے ان دیکھی عورتوں کے وجود کا اندازہ خوشبو سے لگا لیا۔ دالان کا ایک چکر لگا کر وہ باہر آئے۔ اعجاز کے کمرے کا بند دروازہ دیکھا۔ کھڑکی کے ذرا سے ہٹے ہوئے پردے سے اندر لیٹا ہوا اعجاز انہیں نظر آ گیا۔

"یہ لڑکا آج سرِ شام ہی اندر گھس گیا؟" وہ بیوی سے مخاطب تھے۔

"بیوی جو چلی گئی۔" ماں جی نے جواب دیا۔ "کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"تو بیوی کا غلام ہو گیا ہمارا بیٹا۔" وہ مسکرائے۔ "واہ باقر علی شاہ۔" انہوں نے خود کو مخاطب کیا۔ "عمر بھر کی تعلیم پر عورت حاوی ہو گئی! جواب نہیں بھائی اس ذات کا بھی!"

"تم نے کیا کہہ دیا اعجاز سے۔" بیوی نے پوچھا۔

"پھٹ تو نہیں مار دیا۔" غصہ پیشانی پر شکن لیے نمودار ہو گیا۔ "صرف سمجھایا تھا کہ عورت کو

چار انگلیوں کی مٹھی میں رکھو۔" انہوں نے چاروں انگلیاں ملا کر ہتھیلی کے ساتھ جما دیں۔ "اس طرح۔" وہ بولے! "اس انگوٹھے کی حد تک!" انہوں نے اشارہ کیا۔ "اگر اس حد سے باہر نکلنے کی کوشش کرے تو اوپر سے ذرا سا دبا دو۔" انہوں نے انگوٹھا دبایا۔ "تاکہ اسے پتہ چلے کہ اس کے اوپر بھی ایک چیز ہے جو اس سے بلند ہے اور وہ ہے اس کا مرد۔ سمجھیں۔" انہوں نے مٹھی کھولی۔ "یوں وہ پوری طرح تمہاری مٹھی میں رہے گی۔ اگر تم نے صرف اسے انگلیوں کی مٹھی میں رکھا تو وہ باہر نکل کر تمہیں خوار کر دے گی۔" وہ چند لمحے رُکے۔ "اور کیا کہہ دیا میں نے؟"

"مگر آپ کلثوم کا ذرا تو خیال کرتے!" بیوی جی کو خیال آیا۔

"آج کل تو ......!" مگر ملا جی پوری بات سننے سے پہلے اپنے ہی ذہن میں آنے والے خیال سے چونکے۔

"آج کل کیا؟...... کیا پاؤں بھاری تھا اس کا؟" بیوی خاموش ہو گئیں۔

"ارے بتاؤ بھی۔ شرع میں شرم کیسی؟" ملا جی پوچھنے پر آمادہ تھے!

"کیا بتاؤں۔ ایسی کوئی بات دس ماہ میں نہ ہو سکی تو اب کیا خاک ہو گی۔" بیوی جی کے لہجے میں دنیا جہان کی بیزاری تھی۔

"تو کیا اتنا وقت گزر گیا؟" ملا جی کا احساس جاگا...... پھر کس طرح کلثوم سونی گود واپس چلی گئی تھی؟ کہیں اس لڑکے نے خود کو خراب نہ کر لیا ہو۔

"اوئے اعجاز۔" ان کی آواز کواڑ سے ٹکرائی۔ "اب باہر نکل۔ مرد بن اوئے۔ کب تک عورتوں کی طرح منہ چھپائے روتا رہے گا۔" مگر وہ باہر نہ آئے۔

"نافرمانی بھی کرنے لگا ہے۔ عورت کا چکر ہے سارا۔ سالی مرد کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔" وہ اعجاز کے کمرے کی طرف بڑھے۔ وہ احتراماً اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "میں آ ہی رہا تھا ابا جی۔"

"او، رہنے دے یار۔ اب تو کب آنے لگا باپ کے پاس۔ زنانی کے رنگ میں رنگا گیا تُو تو۔ باپ کا دیا چولا اتار کر پکا سہرا ہی باندھ کر دلہا بن گیا ہے میرا شیر۔" وہ اعجاز کے قریب بیٹھ گئے۔

"اتنا وقت گزر گیا ہے۔" مولانا نے اعجاز کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ "کلثوم آج سوکھی کوکھ لیے چلی گئی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس وقت کم از کم تیرا ایک بچہ ضرور ہونا چاہیے تھا جو دادی کی گود

میں پڑاماں کے دودھ کے لیے بلک بلک کر رو رہا ہوتا۔ تب وہ واپسی اسی در پر آن گرتی۔ مگر اب وہ کاہے کے واسطے آئے گی۔ جا بے اعجاز، تُو نے تو نام ڈبو دیا مردوں کا۔" وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگے۔ مگر وہاں گہری اور جامد چپ تھی۔ چٹانوں کی سی سختی تلے ہر احساس دبا دیا گیا تھا۔

"تُو ٹھیک تو رہا ہے ناں شادی سے پہلے؟" چٹان کے سینے میں بارود بھر دیا گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔

"مطلب یہ کہ جن دنوں تو بتا رہا تھا ناں کہ تیرے چہرے پر دانے نکل آئے ہیں ان دنوں......کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں......اشتہاری دوائیاں استعمال......"

"ابا جی۔" چٹان کے سینے میں بھرا گیا بارود پھٹ گیا۔ اعجاز شاہ دھاڑتے ہوئے اٹھے۔ مولانا کی چھڑی دور جا گری۔

"اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے جا کر اپنی بہو سے پوچھ لیتے۔ آپ کی باتوں نے مجھے اس کے قابل ہی کب چھوڑا تھا۔ میرے سارے احساسات آپ نے اپنے اندر بند کر کے مجھے جذبوں سے بھرپور ایک عورت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو نیک تھی جس نے اتنا عرصہ گزارہ کر لیا بری ہوتی تو دوسرے ہی دن میرے منہ پر تھوک کر چلی جاتی۔ آپ ساری زندگی میری مردانگی کو مجھ سے چھین کر مجھے مرد بن جانے کی نصیحت کرتے رہے۔ میں خاموش رہا۔ میرے دل کو خودساختہ مذہب کے چولے میں لپیٹ کر آپ میرے جوان ہونے سے پہلے ہی دفن کر چکے تھے۔ پھر بتایئے آپ نے یہ الزام کیوں کر لگایا؟"

آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور لاوا ملاجی کے پاؤں جلانے لمحہ بہ لمحہ اُن کے قدموں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"آپ اپنا مذہب، اپنی تعلیم واپس لے لیں ابا جی۔ مجھے صرف میری زندگی واپس دے دیں۔ آزاد کر دیں مجھے۔ پھر میں خود خدا کو ڈھونڈ لوں گا۔ مجھے کسی واعظ، کسی مفتی، کسی مولانا کے وسیلے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میری زندگی سامنے ہو گی تو میرا خدا آپ ہی سامنے آ جائے گا۔" لفظوں کے طوفان سے ملاجی لڑکھڑا گئے۔

اعجاز ان کے قدموں سے لپٹ گئے۔ "آزاد کر دیں مجھے۔ خدا کے واسطے۔"

بیوی جی نے ملاجی کو برا بھلا کہتے ہوئے اعجاز شاہ کو اٹھایا۔ ان کا سرخ چہرہ تپ رہا تھا اور داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"چل ہٹ اوئے۔ عورتوں کی طرح چلتر نہ کر۔" ملاجی بھلا کب ان باتوں سے ہار ماننے والے تھے۔

اعجاز شاہ نے آگے بڑھ کر ماں باپ کے پاؤں چھوئے پھر پلٹے۔ کواڑ زور سے بجے اور بیوی جی "اعجاز، اعجاز" پکارتی دروازے تک آئیں۔

"ارے جانے دے۔ خود ہی دھکے کھا کر واپس آ جائے گا۔" ملاجی کی آواز آئی۔

اعجاز شاہ بغیر دیکھے پلٹ کر دوڑتے چلے گئے۔

رات کس طرح کٹی انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ باپ نے انہیں ایمان کی مضبوطی بخش کر ان کے ایمان پر شک کیا تھا جس ایمان کو وہ نزہت کے کمرے کی تنہائی سے بچا کر لے آئے تھے وہ ایمان جب شرع کی حد میں قید ہوا تو کسی عورت کا سہاگ نہ بن سکا تھا۔ مگر آج باپ نے اس پر شک کی کٹاری سے وار کر کے ان کے ایمان کو لہولہان کر دیا تھا۔

صبح کے وہ ملکوں کی حویلی کے گرد کئی چکر لگا چکے تھے۔ مگر اس آنگن میں جانے کی ہمت نہ کر سکے جہاں اُن کی زندگی روٹھ کر بیٹھی تھی۔ کبھی نزہت کا سراپا، کبھی نثار گل کا لال سرخ اور کبھی سکندر شاہ کا مسکراتا مہربان چہرہ ان کی نظروں کے سامنے دائرے میں گھومتا رہا۔ ملاجی کا کرخت چہرہ مذہب کی نقاب کے پیچھے دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا اور اماں کی "اعجاز، اعجاز" کی پکار کانوں میں اترتی رہی۔ مگر وہ اپنی ذات کی پکار میں اپنا وجود تلاش کرتے رہے۔

مغرب کی اذان ہوئی۔ وہ پرانی مسجد کے ایک کونے میں نمازیوں کی نظروں سے چھپ کر نماز پڑھنے لگے۔ وہ لوگوں کے سوالوں سے بچنا چاہتے تھے۔

اعجاز شاہ نماز پڑھ کر باہر نکل آئے۔ ملکوں کی حویلی کے نچلے حصے میں جہاں کلثوم رہتی تھی، اب خاموشی تھی۔ دروازہ کھلا اور کلثوم کا ماما ہاتھ میں کھانے کا ڈبا پکڑے باہر نکلا۔ وہ مل میں رات کی ڈیوٹی دینے جا رہا تھا۔ دن میں وہ ملکوں کے گھر پر چاکری کرتا اور رات کو مل میں ڈیوٹی دیتا۔ تب کہیں جا کر گاؤں میں ملک صاحب کی زمین کے ایک چھوٹے سے حصے پر مقیم ماں اور بیوی بچوں کی گاڑی کھینچ سکتا تھا۔

"زندگی کتنی مشکل چیز ہے۔" اعجاز شاہ نے سوچا۔ اچانک ان کے دل میں گدگدی ہوئی۔
"کلثوم یقیناً اس وقت اکیلی ہو گی۔"

چھوٹے ملاجی کے دل میں اعجاز شاہ کی سوچ نے سر اٹھایا اور وقت کے ایک لمحے میں وہ "جازی" بن گئے۔ پیار کرنے والا جازی، پیار لینے والا جازی۔ پیار کے پردے میں خدا کو ڈھونڈنے والا، پیار اور سچے عشق کو پانے کی خاطر مسجدوں، مندروں اور گرجوں کی اس دنیا سے دُور عرش پر پہنچ جانے والا انسان "جازی"۔

ان کا ہاتھ دروازے پر دستک دینے لگا۔

"کون ہے؟" کلثوم کی آواز آئی اور اعجاز شاہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"میں ہوں اعجاز۔"

وہ آہستہ سے بولے۔

اندر خاموشی چھا گئی۔ وہ بغیر اجازت اندر نہ جانا چاہتے تھے۔ دنیا کے سامنے اپنی ہی بیوی کے ساتھ پکڑے جانے کا خوف تھا۔

اللہ رے۔ یہ تیرے معصوم انسان!

وہ مایوس ہو کر واپس مڑے ہی تھے کہ کہیں دور سے کلثوم کی آواز آئی۔ "آ جایئے۔"

اعجاز شاہ کا دل ایسی خوشی سے سرشار ہو گیا جو پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھے۔

شام تیزی سے اتر آئی تھی۔ در و دیوار خاموش تھے وہ اندر کمرے کی طرف بڑھے جہاں پشت پر اپنی کالی سیاہ زلفیں پھیلائے، دیوار کی طرف منہ کیے وہ روٹھی بیٹھی تھی۔ مگر وہ تو آج جذبوں کی بولتی زبان سے اسے منانے آئے تھے۔ دریا بن کر اسے بہا لے جانا چاہتے تھے۔ ہلکورے لیتی کلثوم اپنی دلکشی سمیت انہیں ایک ڈولتی ہوئی ناؤ کی طرح محسوس ہوئی۔ جو اس وقت مکمل طور پر دریا کے رحم و کرم پر تھی۔

"کلثوم۔"

ان کے قدم آگے بڑھے۔ بازوؤں نے پتوار کی طرح ڈولتی ناؤ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اعجاز شاہ کے وجود میں اچانک اٹھنے والے طوفان نے دریا کی لہروں میں طغیانی لا کر چھوڑی اور وہ

اس بہتی ناؤ کے سنگ سنگ بہتے ہوئے وقت سے بہت آگے نکل گئے۔

بہاؤ تھما تو وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں ایک فاتح کی طرح اٹھے۔

"جازی۔" ایک آواز کانوں میں اتر گئی۔ اعجاز نے نظروں میں بے پناہ چاہت اور دل میں مرد کا سارا پیار سمیٹ کر چارپائی کی طرف دیکھا، مگر وہ بولتا وجود خاموش پڑا تھا۔

"جازی۔" آواز کے ساتھ ایک روشنی کی لکیر سمٹ کر کمرے میں آ گئی۔ اعجاز نے آواز کے تعاقب میں موم بتی کی پھڑ پھڑاتی لو میں آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔

وہاں کلثوم کھڑی تھی۔

"اُف خدایا۔" اعجاز شاہ کا چہرہ دوسری طرف گھوما۔ جہاں کچھ دیر پہلے تک دریا کی طغیانی تھی۔ وہاں سے سبک ندی کی طرح لہراتی نزہت اٹھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک فاتح کی طرح شاندار اور بلند تھا۔

"اللہ۔" اعجاز شاہ نے گھومتے ہوئے سر کو اپنے ہاتھوں پر تھام لیا۔ دونوں عورتیں سراپا انتقام بنی سامنے کھڑی تھیں۔ وہ فاتح بننے آئے تھے مگر فتح کر لیے گئے۔ اب ان کی مفتوح روح بری طرح سے کچلی گئی تھی۔

"کلثوم، نزی۔" ایک دم اعجاز کی شکستہ روح پکار اٹھی۔

موم بتی کی روشنی میں نزہت اٹھی۔ بہتی ندی کی لہروں کا مدوجزر اس کے جسم پر لہراتا چلا گیا!

اعجاز شاہ نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"میں یہاں ہوں چھوٹے ملاجی۔" نزہت نے کہا..... "ادھر دیکھیے۔"

مگر اعجاز شاہ اس طرف نہ دیکھ سکے۔ آنکھیں پھاڑ کر کلثوم کو دیکھتے رہے جو ہاتھ میں موم بتی پکڑے مقدس مریم کی مورتی کی طرح بے جان کھڑی تھی۔

"او۔ خدایا۔" اعجاز شاہ کے لبوں سے تھرتھراتی آواز نکلی۔ "یہ کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں مولانا۔" نزہت کا تیز لہجہ کمرے کی دیواروں کو ہلا گیا۔ "صرف ایک عورت نے آج آپ کو اپنی کمینگی کی انتہا دکھا دی۔" یہ اس دن دیے گئے طعنے کا جواب تھا۔ "کچھ پتہ چلا چھوٹے ملاجی؟" وہ خاصی بے باکی سے بولی۔ "عورت اگر پاک ہو تو وہ مریم بن عیسیٰ کو جنم دیتی ہے۔ اگر کمینی ہو جائے تو ایک طوائف سے بھی کم، کوئی مول لیے بغیر نزہت بن کر خود کو کچل دیتی

ہے۔ اب کہو کیا بری چیز ہے یہ عورت؟" وہ سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔

"عورت پیغمبر کی ماں سہی۔ مگر پیغمبر تو نہ بن سکی۔ خدا نے اس کو یہ درجہ پھر بھی عطا نہ کیا۔" اعجاز شاہ کے لبوں سے یہ الفاظ جیسے خود بخود ادا ہوئے۔

"ٹھیک ہے ملاجی عورت پیغمبر نہ سہی۔ مگر اس نے کبھی فرعون اور نمرود کی طرح خدائی کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ میرے وار تلے آ کر ساری کتابیں بھول گئے کیا؟ جن میں یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے۔"

"مگر یہ سب کچھ نادانستگی میں ہوا۔ میں تمہیں کلثوم سمجھا تھا۔" اعجاز نے صفائی پیش کی۔

"اوئے۔ عورت صرف عورت ہوتی ہے اعجاز شاہ۔ وہ کلثوم ہو یا نزہت، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ مرد کی طرح عالم دین ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی کہ انسانوں کو درجوں میں بانٹ سکے۔ سمجھا! یہ دعویٰ مت کرو کہ تم کبھی کوئی گناہ نہیں کر سکتے۔ اس اونچی مسند سے نیچے اتر آؤ ملاجی جس پر بچپن سے تمہیں تمہارے باپ نے بٹھا رکھا ہے۔ عورت کے دل کے سنگھاسن پر بیٹھو کہ انسان اور فرشتے میں صرف یہی فرق ہے۔"

نزہت خاموش ہو گئی تب اعجاز شاہ نے دیکھا۔ آنسو بس کسی دم اس کی آنکھوں سے باہر آنے کو تھے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

پاؤں کی جوتی آج پوری شدت سے سر پر آن پڑی تھی۔

یکایک وہ غصے میں آگے بڑھے، جانے وہ کیا کرنے والے تھے۔ ان کی سوچیں دماغ کے اختیار سے باہر ہو چکی تھیں۔

"وہیں رک جاؤ ملاجی۔" نزہت چلائی۔ کلثوم نے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا۔ "تو مرد ہو کر عورت کو نہ اپنا سکا۔ مجھے دیکھ میں نے عورت ہو کر وہ داغ لگایا ہے تیری پیشانی پر کہ تو آئندہ کبھی کسی عورت کو پاؤں کی جوتی نہ سمجھ سکے۔ زنا کا الزام تیرے ماتھے پر سجے گا تو ساتھ ہی میرا نام بھی آئے گا۔ زنا کے جرم میں دنیا سنگسار کرے گی تجھے۔ ساتھ میں، میں پتھر کھاؤں گی۔ ارے نادان! میرا وجود تیری پسلی سے خدا نے نکالا ہے تاکہ تیرے دل کے قریب رہوں۔ میری مٹی کا خمیر اس نے تیرے پاؤں سے نہیں لیا کہ تو اسے جوتی کی جگہ دے۔ میں نے تجھے جنت سے نکلوایا۔ مگر دنیا کی مصیبتیں تیرے ساتھ برداشت کیں۔ تجھے دنیا کی تکالیف دے کر میں کسی نئی جنت کی تلاش میں نہیں چلی گئی۔ میں تیرے وجود سے الگ کب تھی، جو تو نے مجھے اس قدر حقیر جانا؟" وہ ذرا دیر کے

لیے رکی مزید کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ اعجاز شاہ کا بھرپور ہاتھ اس کے چہرے پر پڑا اور منہ دوسری طرف گھوم گیا۔

"بے شرم بے حیا عورت! خود کو اونچا مقام دیتی ہے۔ ذلیل، ناپاک کتیا۔"

اعجاز شاہ کی برسوں سے سنبھال کر رکھی ہوئی جوانی آج ایک عورت کے ہاتھوں دھوکے سے بری طرح اس مقام پر آ کر پامال ہوئی تھی جہاں انسانی وجود کے لیے صرف سنگسار کرنے کی سزا ہے۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھے اور اندھا دھند اس پر تھپڑ برساتے چلے گئے۔ کلثوم آگے بڑھی، مگر اعجاز کے ایک ہی دھکے نے اسے جلتی ہوئی موم بتی سمیت دوسری طرف دھکیل دیا۔ موم بتی کانپی اور پھر فرش پر گر کر جلنے لگی۔

عورت بھی خاک ہونے تک جلتی ہی رہتی ہے۔

"مار جازی اور مار۔" وہ چلائی۔

"آج تیرے ساتھ برائی کی تو کیا ہوا؟ میں پاک ہی کب رہی تھی میرا وجود تو اسی روز ناپاک ہو گیا تھا۔ جب حجرے کی تاریکی میں تیرے باپ نے مجھے جوانی کا احساس دلانا چاہا تھا۔ اس کے صرف ایک لمس نے ہی میرے اندر یہ احساس اجاگر کر کے مجھے نجس کر دیا تھا۔ اگر سکندر شاہ جیسا معاشرے کا زہر ملا کیڑا وہاں نہ آ جاتا تو میں۔" وہ روتے روتے رکی۔ "میں تو اس دن سے ہی جوانی کا مطلب سمجھ گئی تھی، جس دن تیرے باپ نے مجھے اس کا مطلب سمجھانا چاہا تھا۔ تب سے یہ جوانی میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ کلثوم نے مجھے سب کچھ بتایا تو میں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے ایک بے گناہ عورت کی زندگی خراب ہونے سے بچانے کے لیے میں خود آگے آ کر تجھے عورت کا مطلب سمجھاؤں۔ کوئی فرق نہیں پڑا ملاجی۔" وہ ہنسی۔ "یہ جوانی تم مردوں کی ہی امانت تھی۔ یہ جوانی جو بڑے ملاجی نے زبردستی لینا چاہی۔ مگر حاصل نہ کر سکے۔ شار گل کو شک نے نگل لیا۔ وہ اپنی مردانگی سمیت شک کی اس دلدل میں اتر گیا جہاں عورت کا دوسرا نام گناہ ہے۔ تب میں نے یہ امانت زبردستی تمہیں لوٹا دی کہ کوئی تو قبول کرے۔ باپ نہ سہی بیٹا ہی سہی۔ اب جاؤ سب کو بتاؤ کہ تم نے زنا کیا ہے۔ پھر دنیا تمہیں پھول مارے یا پتھر۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"تمہاری فطرت تو پاؤں کی جوتی ہی ہے نا۔ اچھی لگے نہ لگے زبردستی گلے پڑتی ہو۔ ذلیل،

کمینی۔ اس دن بھی مجھے تم نے زبردستی بلا کر......" مگر اعجاز شاہ کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

"اس دن اگر تم میری بات سن لیتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ تمہیں تمہاری زندگی اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی لگام سمیت وہیں سے ہی سیدھی سمت لے جاتی۔ اس دن میں نے تمہیں عورت کی عظمت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ میں تمہیں اس کی مظلومیت کا چہرہ دکھانا چاہتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب تمہاری بے خبری میں بنادی جانے والی تمہاری منگیتر کلثوم کو اس کا باپ زبردستی بیچنے جا رہا تھا اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت تھی۔ تمہارے باپ نے تمہیں دنیا سے اوجھل رکھا۔ تمہیں بھلا اس شوگ کا علم کس طرح ہوتا؟ میری بہن نشاط کا نکاح تمہارے باپ جیسے ایک عالم نے زبردستی اس کی رضامندی کے بغیر ایک ساٹھ سالہ زمیندار کے ساتھ پڑھا دیا تھا۔ وہ اپنی آرزوؤں سمیت تم جیسے مردوں کی آن رکھنے کے لیے دوسرے کمرے میں سرخ جوڑا پہنے اپنی روح اور جسم کی جدائی کا المناک سانحہ برداشت کر کے مردہ پڑی تھی۔ تب خالی ڈولی رخصت کرنے کی بجائے مجھے مقتل میں پیش کیا جانے والا تھا۔ مگر بھلا ہو تم جیسے مرد و نثار گل کا۔ اس نے مجھے بچا لیا۔ تمہیں کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے بھرے پنڈال میں جا کر سب کو بتا دیا اور یوں وہ مرد جو نشاط کو بیاہنے آیا تھا۔ اس کی زندگی چھین کر واپس چلا گیا۔ سچ کہا تم نے اعجاز شاہ عورت واقعی کمینی چیز ہے۔ جو تم جیسے مردوں کی آن کے لیے اپنی روح اور جسم کی جدائی برداشت کر لیتی ہے۔ مگر تمہاری عزت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔"

اعجاز شاہ بت بنے سب کچھ سنتے رہے۔ کلثوم اب اٹھ کر موم بتی اٹھا چکی تھی اور اس کی کانپتی روشنی میں نزہت کھلے بالوں سمیت کسی سیاہ رات کی طرح پُراسرار لگ رہی تھی۔

اعجاز شاہ کا سارا وجود انگارا بن کر اس پُراسرار اندھیرے میں چیخ اٹھا۔ "نزہت۔ اللہ کے واسطے خاموش ہو جاؤ۔"

"ارے جا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "اللہ کا واسطہ دے کر انہیں خاموش کر جنہوں نے عورت کو ایک کھلونا بنا کر کوٹھے پر سجا رکھا ہے۔ اس معاشرے اور سماج سے پوچھ کتنی ہی لڑکیاں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے مردوں کے ساتھ دفتروں میں بیٹھ کر مسکراہٹ بیچتی ہیں۔ مگر عزت بچانے کی جدوجہد میں اپنا آپ ختم کر لیتی ہیں۔ سیکرٹری بن کر بڑے صاحبوں کے بیڈروم تک جاتی ہیں۔ طوائف بن کر اپنا آپ لٹاتی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئی۔ کمرے میں تینوں کی

سانسوں کے سوا زندگی کے اور کوئی آثار نہیں تھے۔

اعجاز شاہ کا دل چاہا۔ وہ چیخ کر کہیں۔ "بولتی جاؤ نزہت! خاموش مت رہو۔" مگر ان کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔

"بات صرف تحفظ مہیا کرنے کی ہے ملا جی! افسوس تمہارے باپ نے تمہیں مذہب سے نزدیک اور زندگی سے دور کر دیا ہے۔ یہ مذہب جسے تم نے عورت کے لیے ہوا بنا دیا ہے نام نہاد ملاؤں کا لایا ہوا ہے۔ انہوں نے ہمیں اصل مذہب کب دیا؟ انہوں نے تو اس کی مسخ شدہ شکل ہم تک پہنچائی۔ جس میں ہر فرقے کا اپنا الگ چہرہ ہے۔ جاؤ اور منبروں پر کھڑے ہو کر اپنے پاؤں تلے عورت کا سر رکھنے کی بجائے عورتوں کو وہ اسلام دو جس میں وہ جنگ میں زخمیوں کو سہارا دے کر پانی پلاتی تھیں۔ بزرگوں کے ہاتھ پر بیعت کرتی تھیں۔ ہمیں وہ مرد دو جو اللہ کی راہ میں لڑتے دشمنوں تک کی عورتوں کا احترام کرتے تھے۔ پھر دیکھو شرافت کس طرح ان اونچے برجوں سے اتر کر ہمارے دلوں میں آن بیٹھتی ہے۔"

اعجاز شاہ کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ کلثوم موم بتی پکڑے مقدس مریم کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ اور نزہت کی آواز کسی ناصح کی طرح سنائی دیتی رہی۔

"تمہیں اپنے ایمان کی مضبوطی پر بہت مان ہے نا اعجاز شاہ! تو بتاؤ تمہیں اس دن مجھ سے خطرہ کیوں محسوس ہوا تھا۔ میرا ایمان تو ذرا بھی نہیں ڈگمگایا تھا۔ اس کمرے میں...... جاؤ اعجاز شاہ اور اس جمعہ کو خطبے میں بتا دینا اپنی صنف کو کہ عورت جب مرد کو مسکرا کر دیکھتی ہے تو اس کا صرف ایک وہی مطلب نہیں ہوتا جو وہ سمجھتا ہے۔ اس مسکراہٹ کے پیچھے اس کی بے شمار تشنہ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے فرار چاہتی ہے۔ وہ بسنا اور بسانا چاہتی ہے اور کچھ نہیں۔" وہ روتی ہوئی، دروازہ کھول کر صحن میں نکل گئی۔ جیسے پل بھر اور یہاں ٹھہری تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

اعجاز شاہ اور کلثوم بھی باہر آ گئے۔ رات گہری ہو گئی تھی اور موسم کی شدتوں سے مجبور ہو کر تیز ہوا چل رہی تھی۔

"جاؤ اعجاز شاہ! کلثوم کو لے جاؤ! کسی کھولی میں ہی سہی۔ مگر اس جگہ نہ لے جانا جہاں مذہب کے نام نہاد علمبردار عورت اور مرد کے ازلی و ابدی رشتے کا تقدس جانے بغیر اسے مذہب کی چھری سے ذبح کر دیتے ہیں۔"

پھر نزہت کلثوم کے گلے لگ گئی۔

"مجھے معاف کر دینا کلثوم۔ میں نے تمہارے سہاگ کا تھوڑا سا حصہ چرا کر گناہ ضرور کیا ہے۔ مگر ایسا کرنا تمہاری آئندہ خوشی کے لیے ضروری تھا۔"

وہ روتی آنکھوں سے ہنس پڑی۔

اعجاز شاہ اس کی پُراسرار شخصیت میں الجھ گئے۔ عورت تھی، دیوی تھی یا پھر کوئی ناصح۔ اس وقت خضر کا سا روپ لیے یہ حقیر عورت اعجاز شاہ کو مسجد کے اونچے میناروں جیسی بلند لگی۔

"جاؤ۔ رب راکھا۔"

نزہت کی آواز آئی۔

اعجاز شاہ نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ آگے بڑھ کر کلثوم کا ہاتھ پکڑا اور باہر جانے کے لیے مڑے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور چھوٹے ملاجی کی ٹوپی اڑ کر نزہت کے قدموں میں جا گری۔ کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر وہ تیزی سے باہر نکلے اور چند قدم طے کر کے گلی کے موڑ پر اندھیرے میں وہ دونوں گم ہو گئے۔

* * *

خواتین مصنفین کے خوبصورت ناول

- پتھر کا گداز .... شاہدہ طلعت 300/-
- تتلی کی اُڑان .... عالیہ بخاری 300/-
- دُکھ دریا کے بیچ .... نسیم نیازی 300/-
- قلوپطرا .... اشتیاق فاطمہ عظمیٰ 300/-
- آمرزش (دو جلدیں) .... نوشین ناز اختر 900/-
- وقت کرتا جو وفا .... فرحانہ پیرزادہ 200/-
- کچی کلیاں آنگن کی .... صالحہ محمود 600/-
- یہ دل یہ سودائی .... سعدیہ عزیز آفریدی 500/-
- وصالِ محبت .... ربیعہ کنول 300/-
- عجب ہیں سلسلے وفا کے .... فوزیہ غزل 350/-
- دل کا نگر .... سلمیٰ یونس 300/-
- تیری طلب کی چاہ میں .... عائشہ غزل 200/-
- محبت دھنک رنگ اوڑھ کر .... سمیرا شریف طور 300/-
- کوئی لمحہ گلاب ہو .... نگہت عبداللہ 500/-
- یوں رنگِ زندگی بدلا .... اسماء سلیم 300/-
- کوئی جگنو ہو .... انجم انصار 250/-
- دُھند .... بلقیس کنول 300/-
- زہریلی محبت .... نجمہ مودی 100/-
- مٹی کا دیا .... سیما کاجل 200/-
- دُکھاں دی نگری وچ سکھاں دی برکھا .... فضیلت اعوان 400/-
- شب انتظار ڈھلتی ہے .... طاہرہ بتول 250/-

آسیہ مرزا

- دل دریا سمندروں ڈونگھے 500/-
- کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی 550/-
- دل اِک شہرِ جنوں 600/-
- ہری ہے شاخِ تمنا ابھی 225/-

عشنا کوثر سردار

- جس تن لگیا عشق کمال 300/-
- اِک جنوں خواب طرب 550/-
- اے شمعِ کوئے جاناں (دو جلدیں) 900/-
- افسوں جان (دو جلدیں) 900/-

عفت سحر طاہر

- مجھے کندن کر دو 250/-
- زندگی دھوپ، تم گھنا سایہ 450/-
- دُھند کے چھٹ جائیں گے 300/-
- سبز رُتوں کی جھلمل میں 300/-
- محبت دل پہ دستک (دو جلدیں) 900/-

رُخ چوہدری

- ساحلوں کے گیت 600/-
- وحشتِ دل 300/-
- سکوتِ شب کے رتجگے 200/-